المنہاج الواضح
یعنی
راہ سنت
تالیف
محدث اعظم وامام اہل سنت و حامل علوم نبویہ
حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر
مکتبہ صفدریہ
نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (قرآن کریم)

اور جو چیز تم کو رسول دے اس کو لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آ جاؤ!

مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہ)

جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی چیز گھڑ لی، تو وہ مردود ہو گی!

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (قرآن کریم)

المنہاج الواضح

یعنی

راہِ سنت

جس میں بڑی تحقیق اور عرق ریزی سے اہل سنت والجماعت کے دلائل کا معیار اور بدعت لغوی اور شرعی کا مفہوم اور حکم قرآن کریم، صحیح احادیث اور معتبر عبارات سے واضح کیا گیا ہے اور مشہور بدعات (مثلاً میلاد و عرس، تعزیہ، چراغاں کرنا، قبروں کو پختہ بنانا، قبروں پر اذان کہنا، نماز جنازہ کے بعد دعا کا تیجہ، ساتواں، دسواں، چالیسواں، جمعرات اور ایصال ثواب کی مروجہ تعیین وغیرہ) پر علیحدہ علیحدہ مفصل بحث کی گئی ہے اور فریق مخالف کے مستدلات اور شبہات کے جوابات دیئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اکابر علماء دیوبند پکے سنی اور سچے مسلمان ہیں، ان کو وہابی وغیرہ کہنا سراسر بہتان، خالص افترا اور سفید جھوٹ ہے!

مؤلفہ:

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر (فاضل دیوبند)

خطیب جامع مسجد گکھڑ، شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

طبع ۵۶ ....دسمبر ۲۰۰۹ء

۳۷

نام کتاب .... المنہاج الواضح (یعنی راہ سنت)

مصنف .... امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہم

مطبع .... مکی مدنی پرنٹرز لاہور

قیمت .... ۲۰۰/- (دوسو روپے)

ناشر .... مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

ملنے کے پتے

☆ ادارۃ الانور بنوری ٹاؤن کراچی
☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی
☆ مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
☆ مکتبہ حقانیہ ملتان
☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور
☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
☆ کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ ملتان
☆ مکتبہ صفدریہ بوہڑ چوک راولپنڈی
☆ مکتبہ محمودیہ لکی مروت
☆ مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور
☆ ادارۃ اسلامیات انارکلی لاہور
☆ اسلامی کتب خانہ اڈا کاکی ایبٹ آباد
☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
☆ مکتبہ عثمانیہ میانوالی روڈ تلہ گنگ
☆ مکتبہ اظہریہ رحیم یار خان
☆ اقبال بک سنٹر نزد مسجد صدر کراچی
☆ مکتبہ فاروقیہ حسن ابدال
☆ مکتبہ علمیہ جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خوانی پشاور
☆ مکتبہ اشرفیہ فیصل آباد
☆ مکتبہ فاروقیہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ
☆ والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ

☆ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ☆ عمر اسلامی کتب خانہ ... روڈ ...

تصدیقات اکابرین علماء دارالعلوم دیوبند

ضلع سہارنپور - ہند

(۱) فخر الاماثل حضرت مولانا الحاج القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد : اسلام جامع اور کامل دین ہے جس میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی۔ اس کے کامل ہونے کی شہادت تو قرآن کریم نے الیوم اکملت لکم دینکم سے دی ہے اور جامع ہونے کا ثبوت تبیانا لکل شیء سے پیش فرمایا ہے جس سے اس دین کا جامع و کامل ہونا شہادت خداوندی سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین مجموعہ علم و عمل کا نام ہے تو دین کے جامع و کامل ہونے کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے کہ اس کا علم بھی جامع و کامل ہے اور عمل بھی جامع و کامل ہے۔ اس ایمان اور جامعیت کی تکمیل علم محض یا عمل محض سے نہیں ہو سکتی۔ تجربہ بھی یہی ہے کہ علم تنہا تو کامل ہو اور اس سے پیدا شدہ عمل ناقص اور نا تمام یا برعکس۔ پس ایک کی تکمیل دوسرے کی تکمیل کو طبعاً مستلزم ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ دین کے علم کا اساسی سرچشمہ قرآن حکیم ہے جس کا بیان حدیث ہے: فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم (الحدیث)۔ اور عمل کا سرچشمہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی حامل ذات بابرکات نبوی ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (القرآن) — بلا شبہ تمہارے لئے رسول اللہ میں بہترین نمونۂ عمل موجود ہے

اور یہ دونوں ہی علم و عمل ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق بھی ہیں جیسے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب حضورؐ کے اخلاق کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ:

سے تو تحفظ قبول کیا جائے گا۔ جس کا نام اتباعِ سنت ہے۔ اس لئے اس دین کے کامل و جامع ہونے کی وجہ سے اس کے دو تقاضے نکلے۔ ایک **اخلاص** اور ایک **اتباع**۔ اخلاص سے عقیدہ و عمل خالص ہوتا ہے۔ اور یعنی وہی دین رہتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اور اتباع سے عقیدہ و عمل بموجب ہوتا ہے اور ٹھیک اس نمونہ کے مطابق رہتا ہے جو اس کے رسول نے کر کے دکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دو اصول دین کی بقا و حفاظت اور انسان کی صلاح و فلاح کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ اگر انہیں کمزور کیا جائے گا تو اسی حد تک ان کی ضدیں ابھر کر دین کو نقصان پہنچائیں گی۔ اگر اخلاص و توحید میں کمی ہو گی تو دین و ایمان میں اسی حد تک اس کی ضد شرک کی آمیزش ہو جائے گی:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ۔ (القرآن الحکیم)	اور بہت سے ان میں مومن نہیں ہوتے مگر یہ بھی مشرک بھی بن جاتے ہیں۔

اور اگر اتباعِ سنت میں کمی آ جائے گی تو اسی حد تک بدعت کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

ما احدث قوم بدعة إلا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة خير من احداث بدعة۔ (مسند احمد)	کسی بھی قوم نے کوئی بدعت (دین میں) ایجاد نہیں کی کہ اس کی مثل سنت نہ اٹھا لی گئی ہو۔ پس سنت کو تھامے رہنا ہی بہتر ہے بہ نسبت نئی نئی بدعات نکالنے کے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جیسے دین کی صلاح و فلاح کی دو اصلیں ہیں یعنی اخلاص اور اتباع، ایسے ہی دین کے فساد کی بھی دو ہی اصلیں ہیں جو ان دونوں کی ضدیں ہیں یعنی شرک اور بدعت۔ پس جیسے اخلاص و اتباع کے ہوتے ہوئے دین کبھی فنا نہیں ہو سکتا، ایسے ہی اشراک و ابتداع کے ہوتے ہوئے دین کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے علماء اہل السنت والجماعت نے ہمیشہ سنت و بدعت میں امتیاز قائم رکھنے اور سنت کو نکھار کر بدعت سے الگ کر دکھانے میں سرگرمی دکھلائی، اور کبھی تساہل و تغافل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اصول وضع کر کے فروع تک سنت و بدعت کو جدا جدا کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رکھ دیا ہے تاکہ دین اخلاص و اتباع کی بندشوں میں اپنے اصلی روپ کے ساتھ محفوظ رہے

وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن ۔ اور آپ کا اخلاق قرآن ہے ۔

اور ظاہر ہے کہ خُلق عمل ہی کی قوت کا نام ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ کتاب و سنت میں اس دین کے تمام علمی پہلو جمع ہیں اور ذاتِ نبوی میں اس کے تمام عملی پہلو جمع ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق۔ پس جو چیزیں قرآن میں علمی شکل میں ہیں وہی چیزیں ذاتِ نبوی میں عمل کی صورت میں ہیں اور جن باتوں کو قرآن اصول و اقوال کی شکل میں پیش کرتا ہے انہی باتوں کو ذاتِ بابرکات نبوی احوال و اعمال کی شکل میں نمایاں کرتی ہے۔ پس قرآن کا کہا ہوا آپ کا کیا ہوا ہے اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے پر اس شان سے منطبق ہیں کہ نہ عمل نبوی قرآن سے سرمو منحرف ہے اور نہ علم قرآنی عمل نبوی سے ذرہ برابر متجاوز ہے۔ ورنہ خُلُقُهُ الْقُرْآن کے کوئی معنی باقی نہیں رہ سکتے

اس کامل مطابقت کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر قرآن کا علم دین کا جامع اور کامل ہے جس سے کوئی ہدایت چھوٹی ہوئی نہیں ہے تو نبوت کا عملی اسوۂ حسنہ بھی یقیناً جامع اور کامل ہے جس سے دین کا کوئی عملی نمونہ رہا ہوا نہیں ہے۔ نیز اگر قرآن اور اس کے دئیے ہوئے قانون میں کسی ادنیٰ کمی زیادتی کی گنجائش نہیں ہے تو عملی اسوۂ نبی میں بھی کسی اضافہ و کمی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ورنہ وہ تطبیق و مطابقت باقی نہیں رہ سکتی جس کا دعویٰ قرآن پاک اور حرم پاک نبوی حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جس طرح قرآن کے بعد نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے کسی جدید نمونۂ علم کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی نئی کتاب یا نوشتہ کی صورت میں نازل ہو، ایسے ہی نبوت کے اسوۂ حسنہ کے بعد کسی نئے نمونۂ عمل کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ اسے کوئی مبعوث ہو یا اختراع کر کے عمل کا کوئی نیا ڈھنگ اور نیا مذہب خود سے دین میں نکالے کیونکہ اگر اس دین کے علم یا عمل میں کمی بیشی کی گنجائش ہو تو یہ دین دین کامل و جامع نہیں کہا جا سکتا حالانکہ قرآن و حدیث اس کے کامل اور جامع ہونے کے مدعی ہیں۔ اندریں صورت اس دین کامل کو ماننے کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس کے علم اور عقیدہ کو بھی بلا کسی کمی بیشی اور بغیر زیر و زبر کے جھکے ہوئے یکسوئی کے ساتھ مانا جائے کہ اسی کا نام اخلاص و توحید ہے اور اس کے نمونۂ عمل یعنی اسوۂ حسنۂ نبوی کو بھی بغیر کم و بیش کی آمیزش اور اپنے دواعی و اقتضاآت کے یکسوئی

اور شرک و بدعت کی آمیزشوں سے اس کا نورانی چہرہ داغ دار نہ ہونے پائے۔

ہندوستان کی ان آخری صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ اور ان کی نسبی اور حسبی اولاد کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اس سنت و بدعت کی تفریق اور سنت کے دائرے سے کثرت رسوم و رواج کے اخراج کو آخری حد تک پہنچایا، اور ان ساری اختراعات کو جنہیں دعویداران إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا دین کے پردہ میں پیش کر رہے تھے، دین کے محکم دلائل سے دفع کرنے کی عظیم مہم انجام دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں یہ بھی عارفانہ رنگ سے نمایاں ہوئی، ان کے فرزند جلیل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے دور میں فلسفیانہ انداز سے سامنے آئی، ان کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے دور میں مجاہدانہ روش سے کھلی، اور ان کے بعد جب دہلی کی علمی مرکزیت ختم ہو کر دیوبند کی طرف منتقل ہوئی تو بانیان دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں علم و جہاد کے روپ میں آ گئی، اور آخر کار دیوبند کے فیض یافتہ فضلاء کے ہاتھوں اس نے جماعتی اور اجتماعی صورت اختیار کر کے ہند و بیرون ہند میں پرے جما دیئے۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء متقدمین ہوں یا متاخرین، اور پھر ان سے مستفیدین، اگلے ہوں یا پچھلے، جو ہندوستان و پاکستان، افغانستان و ترکستان، ملایا و انڈونیشیا، حجاز و عراق میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے کام کا مرکزی نقطہ یہی سنت و بدعت کی تفریق اور دینی اور غیر دینی کا امتیاز واضح کرنا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس سرہٗ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نے اسی سنت و بدعت کے فرق کو عقائد اور کلیات دین میں نمایاں کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے اسی فرق کو فقہی جزئیات میں کھولا۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے اسی فرق کو معاشرت و معاملات میں نمایاں کیا۔ ابن شیر خدا حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) نے اسی فرق کو مروجہ رسوم میں واضح کیا، اور آج انہی اسلاف صالحین کے ایک خلف رشید مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر نے اسی فرق کو اس دور کے ان عام مروجات و محدثات میں مثبت و منفی پہلو سے مستند دلائل کی روشنی میں نہایت ہی واضح اور پاکیزہ انداز میں واشگاف کیا ہے جس کی

شاہد عدل ان کی مایۂ تصنیف "راہِ سنت" ہے۔

اس کتاب میں ممدوح نے مختصر انداز میں سنن نبوی اور رسوم مروجہ میں مدلل اور واضح فرق دکھلاتے ہوئے بہت سے ایسے گوشے سنت کی عبادات، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روایات اور قرآن حکیم کی آیات سے کھول دیئے ہیں جو اب تک پس پردہ تھے، جن سے اخلاص و اتباع کی دو صفیں مضبوط سے مضبوط تر ہو کر سامنے آگئی ہیں اور شرک و بدعت کا جتھہ دیوار کی رو سے قلع قمع ہو گیا ہے۔ مولانا ممدوح کا مطمح نظر کتاب زیر نظر میں ان مسائل کو جو مبتدعین کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، ان کے اصلی روپ میں پیش کرنا اور ان پر بدعات کا جو سیاہ لبادہ ڈال دیا گیا ہے، اسے الگ پھینکنا ہے، جس میں وہ بحمد اللہ تعالیٰ کامیاب ہیں اور ان کے پیچھے حجت و برہان کی زبردست کمک موجود ہے۔ مصنف کی اور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گذری ہیں، مختصر جامع اور متین انداز بیان کی حامل ہیں جو سنت و بدعت، اور دین و غیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں بجا طور جدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرح صدر، قوت یقین اور عمل میں عزیمت و رخصت کی طرف لاتی ہیں۔ یہ اسم بامسمّٰی کتاب "راہِ سنت" بھی حقیقتاً راہِ سنت کی داعی ہے جس سے جدل کا ذوق پیدا نہیں ہوتا کہ جدل بدعت اور گمراہی کا خاصہ ہے نہ کہ سنت اور ہدایت کا۔ ارشاد نبوی ہے:

ما ضل قوم بعد هدى كانوا عليه الا اوتوا الجدل۔ (ترمذی)

کوئی قوم بھی ہدایت کے بعد جس پر وہ تھی، گمراہ نہیں ہوئی مگر اس میں جدال و نزاع کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ حضور کی یہ پیشین گوئی اہل بدعات کے حق میں سر کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آ رہی ہے کہ وہ بات بات پر جدل، درشت کلامی، تحقیر بین المسلمین، گالم گلوچ، قتل و غارت گری، فساد و خونریزی اور اشتعال انگیزی کے رسیا ہوتے ہیں اور انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ ہر وقت آمادۂ فساد نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی حجت و برہان فقط زبان کی گالی اور ہاتھوں کی دراز دستی ہے ع

دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں

مخالف اہل سنت کے گراں قدر اور بہترین کلام مہذب، سلیس، لہجہ صادق اور بیان عالمانہ کا ہے۔
تو تشنیع و تحقیر میں کسی غیظ و غضب کا اظہار نہیں، کسی جگہ سوقیانہ یا بازاری ڈھنگ میں استعمال الفاظ کی
کر کے تفریق بین المسلمین کے راستے نہیں پھیرے کیونکہ ان کی حجت دلیل ان کتاب و سنت ہے جس کی روشنی میں وہ
مدعا کا اثبات کرتے ہیں اور مدعا بھی خود اپنا نہیں رکھتے، وہ مدعا بھی اللہ و رسول کا ہوتا ہے جسے وہ
نقل کر کے اس کے دلائل سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اس عمل میں ظاہر ہے کہ بدتہذیبی اور نا شائستگی کی قطعہ
گنجائش ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان خرافات کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ امور از قسم جہالت
ہیں اور دعوائے حق اور دلائل صادقہ از قسم علم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علم جہالتوں کی مدد سے آگے نہیں بڑھ سکتا
اور نہ ان کا دست نگر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رسالہ زیر نظر کے مصنف کا انداز بیان مہذب و سنجیدہ اور طریق استدلال
بھی آئین محققانہ اور منصفانہ کا حامل ہے کیونکہ وہ سنتوں کی دعوت دے رہا ہے جن کے لئے علم و تہذیب کی ضرورت
ہے نہ کہ بدعات و خرافات کی جن کے لئے جہالت اور جاہلانہ انداز ناگزیر ہے۔ اس محققانہ اور عالمانہ
ڈھنگ کی تحقیقات سے کوئی شبہ نہیں کہ مصنف ممدوح نے دعویٰ مسائل کا اثبات ہی کر دیا ہے بلکہ خصوم پر
حجت بھی تمام کر دی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔

رہ تعصب و عناد، سو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ جس کا تیر بہدف علاج یا موت ہے یا قیامت
ہے یا دنیا کی قیامت۔ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۔

حق تعالیٰ مصنف ممدوح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کی اس سعی
جمیل کو قبول فرمائیں اور طالبین حق کو ان کی مساعی سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي
مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۔

وباللہ التوفیق

محمد طیب غفرلہٗ۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۱ رجب ۱۳۷۷ھ یوم الاربعاء

فہرست مضامین

تمت بالخیر

عرضِ حال

خدا تعالیٰ کا وہ پسندیدہ اور پیارا دین جو سب ادیان و مذاہب کا تاج اور قیامت تک اقوامِ عالم کے مقصد ابتداء ہے۔ جس کو امام الانبیاء، خاتم النبیین اور سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے جبینِ مبارک کا خون بہا کر اور طرح طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کر کے خدا تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچایا تھا اور جس کو افضل البشر بعد الانبیاء حضرت ابوبکر صدیق سے لے کر ایک چھوٹے صحابی نے اپنی جانی اور مالی قربانی کے ذریعہ روئے زمین پر پھیلانے کی انتھک اور کامیاب کوشش کی اور جس کو تابعین اور اتباعِ تابعین اور محدثین اور فقہائے کرام نے اپنی زندگیاں وقف کر کے بعد کے آنے والوں تک پہنچایا اور جس کی سادہ اور فطری تعلیم اور ٹھوس دلائل نے اقوامِ عالم کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ موافق و مخالف سب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی پیش کی ہوئی شریعت اور کارناموں کی اہلِ یورپ نے بھی وہ تعریف کی جس سے بڑھ کر شاید ممکن نہ ہو چنانچہ مسٹر گبن صاحب لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا یہ حکم کہ وہ عورتیں جو لڑائی میں قید کی جائیں اپنے بچوں سے قطعاً جدا نہ کی جائیں، ایک ایسا حکم ہے جس پر دنیا کے تمام متمدنین کی سختیاں جنہیں انہوں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر کی ہیں، قربان کی جا سکتی ہیں۔

- باسورتھ اسمتھ صاحب لکھتے ہیں کہ: "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی زندگی تمام رفعت عظمت عالیشان اور بلند پایہ ہے۔"
- جیمس صاحب معترف ہیں کہ تمام نبیوں اور پیغمبروں کے کاموں سے مشکل ترین کام محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تھا۔
- کارلائل صاحب بھی اقرار کرتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجسم رحم اور عفو تھے۔ اُس کی تمام زندگی یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کی حمایت میں گذری۔ یہ اس شخص کی زندگی تھی جو تمہارے لیے پیدا ہوا

اور خدا کے لئے استعمال کر گئیں۔ اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی خدا اور خدا کی راہ میں وقف کی، تو وہ یقیناً محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔

- انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ قرآن کے تحت لکھا ہے کہ "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمام مذہبی اور دینی کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھا۔"
- لیونارڈ صاحب کہتے ہیں کہ "اگر کسی نے زمین پر خدا پا لیا، اگر کسی نے خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کر دی، اگر کسی شخص کی زندگی کا نصب العین محض نیکی کا پرچار تھا۔ تو وہ یقیناً عرب کا پیغمبر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔"

دیکھا آپ نے کہ اہل یورپ بھی حق بات کہنے پر مجبور ہیں (والفضل ما شهدت به الاعداء) حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیش کردہ دین حق اور سچا دین و مذہب تمام ممالک میں پھیلا اور ہندوستان میں بھی پہنچا۔ گیارھویں صدی ہجری میں دینی ماحول اسلام جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعینؒ، اور محدثین و فقہاء نے احتیاط کی چھاننی میں چھان کر محفوظ رکھا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان میں جاگزین تھا۔ اور قرآن کریم، حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کی جو خدمت انہوں نے کی وہ اور کسی کی قسمت میں نہ تھی۔ سچ ہے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اور اسی مبارک خاندان کے علمی چشموں اور ناپیدا کنار سمندر سے اکابرین علماء دیوبند (شکر اللہ تعالیٰ مساعیہم) فیض یاب ہوئے۔ جو اصل مسلمان حقیقی سُنّی اور صحیح معنٰی میں حنفی ہیں، اور سچ ہے کہ ملک میں اہل السنت والجماعت صرف اور صرف علماء دیوبند ہیں یا جو ان کے ساتھ عقائد میں متفق ہیں اور بس! انہی اکابر نے جہاد ۱۸۵۷ء میں انگریز مردود کے خلاف دینی، مالی، جانی وغیرہ کے میدانوں میں اپنی جانیں پیش کیں اور ہزاروں کے حساب علماء کرام کو انگریز نے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ اور انگریز یہ سمجھے کہ جو شخص ۱۸۵۷ء کے اکابرین علماء دیوبند کے جو ہندوستان اور بیرون ہند ایک تاریخی مصیبت بنے رہے۔ ان اکابر نے تقریر و تحریر اور بیعت کے ذریعے برطانیہ کی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دیں۔ مگر برطانیہ تو جیسے سیاست دان تھا۔ اس نے ان اکابر کو مسلمانوں

کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل کرنے کے لئے اپنے اپنے حربے استعمال کئے مگر الامان والحفیظ۔ دیوبندیوں کی تکفیر کیلئے
بڑے بڑے مولوی اور مفتی جھپٹ گئے اور ان اکابر پر جس طرح افترا بہتان مولوی احمد رضا خان صاحب
بریلوی نے باندھے ہیں اور کسی سے یہ خدمت ادا نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ان اکابر کو کافر و مرتد قرار دیئے
حکومت اور وہابی وہابی کہہ کر عام مسلمانوں کو ان سے نفرت دلانے کے لئے وہ کوشش کی کہ خدا کی پناہ۔
اور اس زمانہ میں جب کہ ظالم انگریز نے ممالک اسلامیہ پر بے پناہ مظالم ڈھائے اور ہندوستان میں
مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پوری مہم شروع کی اور دین اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوشش جاری رکھی۔
خان صاحب بریلوی نے اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام نامی ایک کتاب لکھ کر
ظالم انگریز کی حکومت میں ہندوستان کو دار الاسلام کا خطاب دیا۔ اور خان صاحب خود دوسری جگہ پر
لکھتے ہیں کہ ہندوستان بفضلہ دار الاسلام ہے۔ (بحوالہ احکام شریعت حصہ دوم صفحہ) اور صراحت سے وہ کہہ
دیا کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلکہ علمائے ثلاثہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مذہب پر ہندوستان
دار الاسلام ہے ہرگز دار الحرب نہیں اسے بہ عہد اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وفادار مسلمانوں
کو کافر اور مرتد قرار دیا۔ چند عبارتیں خان صاحب کی ملاحظہ ہوں:

"آجکل وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری، چکڑالوی جملہ مرتدین ہیں کہ ان کے مرد یا عورت کا کسی سے بھی
نکاح جس سے نکاح ہوگا مسلم ہو یا کافر اصلی یا مرتد، انسان ہو یا حیوان محض باطل اور زنا خالص ہوگا اور
اولاد ولد الزنا۔ (ملفوظات حصہ دوم صفحہ ۹۲) ——— آجکل کے وہابی، رافضی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی
جھوٹے صوفی کہ شریعت پر ہنستے ہیں کہ دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اس سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا۔ اس
کا نکاح کسی مسلم یا کافر یا مرتد، اس کے ہم مذہب یا مخالف مذہب، غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہوسکتا
جس سے ہوگا محض زنا ہوگا۔ مرتد مرد ہو خواہ عورت۔ مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے یہی ہے وہ کہ
اس کی صحبت ہزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے۔ خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ
کہ اپنے آپ کو خاص اہل سنت و جماعت کہتے، حنفی بنتے، چشتی نقشبندی بنتے، نماز روزہ ہمارا سا کرتے
ہماری کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور اللہ و رسول کو گالیاں دیتے ہیں (لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ صفحہ)

یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں۔ (احکام شریعت حصہ اول ص۱۱۲) —— رافضی، تبرائی، وہابی، دیوبندی وہابی غیر مقلد، قادیانی، چکڑالوی، نیچری، ان سب کے ذبیحے محض نجس مردار حرام قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نام الٰہی لیں اور کیسے ہی متقی پرہیزگار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ ولا ذبیحۃ للمرتد۔ (احکام شریعت حصہ اول ص۱۲۲) —— احکام دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اور مرتدوں میں سب سے خبیث تر مرتد منافق رافضی، وہابی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی کہ کلمہ پڑھتے، اپنے آپ کو مسلمان کہتے، نماز وغیرہ افعال اسلام بظاہر بجا لاتے، بلکہ وہابی وغیرہ قرآن و حدیث کا درس دیتے ہیں، اور دیوبندی کتب فقہ کا درس دیتے ہیں بھی شریک ہوتے، بلکہ چشتی نقشبندی وغیرہ بن کر پیری مریدی کرتے اور علماء و مشائخ کی نقل اتارتے اور ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کرتے (لعنۃ اللہ علی الکاذبین) یا ضروریات دین سے کسی شے کا انکار رکھتے ہیں۔ ان کی کلمہ گوئی و ادعاء اسلام اور افعال و اقوال میں مسلمانوں کی نقل اتارنے ہی نے ان کو اخبث و اضر اور ہر کافر اصلی یہودی نصرانی، بت پرست مجوسی سب سے بدتر کر دیا۔ (احکام شریعت حصہ اول ص۱۲۲) —— یہی مثال روافض و وہابیہ کی ہے کہ روافض مثل نصاریٰ کے محبت میں کافر ہو گئے، اور وہابیہ مثل یہود کے عداوت میں۔ (احکام شریعت حصہ دوم ص۱۳۳) خان صاحب اپنا تائید کردہ ایک جعلی استفتاء نقل کر کے تائیداً لکھتے ہیں۔ غلام احمد قادیانی اور رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد انبیٹھی اور اشرف علی وغیرہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح کسی حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اس کے کفر میں بھی شبہ نہیں۔ (احکام شریعت ص۱۲۲، وفتاویٰ افریقہ ص۱۲۱ طبع مدینہ پبلشنگ) اسمٰعیل دہلوی، نذیر حسین دہلوی، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد انبیٹھوی، اشرف علی تھانوی وغیرہم اور بعض دیگر فرقوں کے نام لے کر آخر میں لکھتے ہیں: ومن جملۃ ھؤلاء الطوائف فسیح کلھم کفار مرتدون خارجون عن الاسلام باجماع المسلمین۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ باجماع اہل یہ جماعت فرقے اور ان کے پیروکار سب کافر مرتد اسلام کے دائرہ سے خارج ہیں۔ (المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد ملتان کتب خانہ حامدیہ لاہور) دیوبندیوں کے بارے میں مسلمانوں سے آخری اپیل ہے کہ انہیں کافر کہیں، جو ان کا پاس لحاظ کرے، جو ان سے استادی یا رشتے یا دوستی کا خیال کرے وہ بھی انہی میں سے ہے۔ انہیں کی طرح کافر ہے، قیامت میں ان کے ساتھ ایک رسی میں باندھا جائے گا۔ (فتاویٰ افریقہ ص۱۱۵)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بابِ اوّل

شرعی دلائل اور براہین کے بیان میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ خَیْرَ الْھُدٰی ھُدٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ (وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَجَمِیْعِ اُمَّتِہٖ) وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلَّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ بار شکر ہے کہ اُس نے ہمیں انسان بنایا۔ پھر انسان بنانے کے بعد ہمیں مسلمان بننے کی توفیق عنایت فرمائی اور پھر مسلمان ہونے کے ساتھ ہمیں امام الانبیاء سید الرسل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمت ہونے کا لازوال شرف مرحمت فرمایا۔ اگر ہم اسکی اِن گنت نعمتوں کا شکر بجالانا چاہیں تو یہ ایک ناممکن امر ہے اور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم ان نعمتوں کو شمار بھی نہیں کرسکتے۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا، چہ جائیکہ ہم اس کی نعمت و حسنات کا حق ادا کرسکیں۔

قرآن کریم، بہترین قانون، کامل ضابطۂ حیات اور مکمل دستور العمل ہے

گو حسب تصریح علماء اصول دلائل شرعیہ چار قسمیں ہیں۔ کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ مگر اجماع اور قیاس کتاب و سنّت ہی کی طرف راجع اور اسی کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا کائنات کی رہبری کے لئے اصول طور

ہدایت دو حصوں اور دو جلوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو کہ صحیح اصول، تمام پختہ و غیر متغیر اور قطعی احکام اور اعمال پر مشتمل اور انسانی تصرف سے بالاتر اور اپنے الفاظ میں محفوظ و منضبط اور ہمیشہ کیلئے مکلف مخلوق کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس ہدایت کے سرچشمہ کا نام وحی متلو اور قرآن مجید ہے۔

مذہب اور قانونِ فطرت اس معیار اور مقیاس کا نام ہے جو مقررہ و معین ضابطہ اور قانونِ عمل کی حیثیت رکھتا ہو۔ سچا اور صحیح مذہب اور آئین صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد حقیقی سچائی اور اعلیٰ حقیقت پر ہو اور جس کے ذریعہ عقائد و اعمال اور اخلاق کو اچھا یا برا کہا جا سکے اور جس کے ذریعہ باطنی اور ظاہری اصلاح ہو کر عذاب سے بچایا جا سکے اور جس کے اصول قطعی اور اٹل ہونے کے ساتھ ایسے جامع ہوں جو کائنات کی دینی اور دنیوی حاجت روائی کے لئے کافی ہوں۔ فطرت چونکہ حقیقی صداقت ہے اس لئے مذہب اسلام کی بنیاد خالقِ فطرت نے فطرت پر رکھی ہے اور جس کی بابت یوں ارشاد فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (پ ۲۱، الروم، رکوع ۴)۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانونِ فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے (یعنی انسانی فطرت اسی نہج کے موافق ہے) اور اس قانون میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

سچا مذہب وہ ہوتا ہے جو کسی نبی یا صاحبِ الہام کی قطعی اور محکم طریقے سے منکشف ہوتا ہے اور ہر صحیح الفطرت اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ وہ بنایا نہیں جاتا اور اس میں مخلوق کی ایجاد و اختراع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غلط اور درست مذہب کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد ان خیالات اور اوہام پر قائم کی جاتی ہے جو دل کی دنیا میں پیدا ہوتے اور خواہشات کے دریا اور طوفان میں بہ جاتے ہیں، اور نفس الامر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ فطرت سے بیگانہ اور حقیقت اور صداقت سے کوسوں دور ہوتے ہیں مگر ان کی ظاہری چمک دمک سادہ لوح اور سطحی قسم کے لوگوں کی نادان آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ اس سے متاثر ہو کر اس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ جتنا مستقبل سے متعلق کسی کو زیادہ علم ہو گا اسی قدر وہ زیادہ صحیح قانون اور آئین بنا سکے گا۔ مخلوق کے پاس مستقبل سے متعلق علم

حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل، تجربہ، قیاس اور حواس وغیرہ سب کے سب محدود، ناتمام اور ناقص ہیں، اس لئے مخلوق کے مجوزہ قوانین کبھی ناقابلِ ترمیم نہیں ہو سکتے۔ ملک اور ملت کے چیدہ چیدہ اور منتخب قانون ساز بڑی کوشش اور کاوش سے بسیار بحث و تمحیص کے بعد ایک قانون تجویز کرتے ہیں مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس میں ترمیم کا پیوند لگانا پڑتا ہے اور ہمیشہ اس امر کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور تا قیامت ہوتا رہے گا۔ ہر قانون اور آئین کے بنانے کا ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے۔ قانون ساز کو اگر قانون پر عمل کرنے والوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی ہے اور وہ ان کا حقیقی خیر خواہ اور خود غرضی سے بالاتر ہے تو وہ ایسا قانون بنائے گا جس سے قانون پر چلنے والوں کو نفع اور فائدہ پہنچے گا، اور اس بات کے تسلیم اور یقین کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ مفید اور ناقابلِ تنسیخ قانون صرف وہی بنا سکتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل علم رکھتا اور بہمہ وجوہ علیم و خبیر ہو، حقیقی ہمدرد اور مہربان ہو، خود غرضی سے بے نیاز اور مطلب پرستی سے بے احتیاج اور بے پروا ہو۔ ظاہر ہے کہ مخلوق سے متعلق خالق کے سوا علم تام اور کسی کو نہیں ہو سکتا، تحقیق نہیں کہ الرحمٰن سے زیادہ مہربان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور پوشیدہ نہیں کہ الصمد سے بڑھ کر بے نیاز اور کوئی نہیں۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو مخلوق کے لئے کامل و مکمل اور ناقابلِ ترمیم قانون اور آئین بنا سکے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط۔ اور بھلا اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کو قانون بنانے اور حکم کرنے کا حق ہی کیا ہے؟ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس قادر و مقتدر خدا کا بنایا ہوا قانونِ فطرت تمام موجودات میں جاری اور ساری ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سب اس کے قانون میں (جس کو سنت اشیا قانونِ قدرت کہا جاتا ہے) جکڑے ہوئے ہیں اور کسی میں اس کی خلاف ورزی کی تاب نہیں وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے اس قانون میں (جس کو لا آف نیچر کہتے ہیں) ترمیم و تنسیخ کا اختیار رکھتے تو سرو کے درخت میں آم اور بادام پیدا کر دیتے۔ بیروں اور کھجوروں میں گٹھلیاں پیدا نہ ہونے دیتے۔ گھوڑے کے سر پر سینگ پیدا کر دیتے، یا گدھے کے سر کی طرح گائے بیل اور بھینس کے سر سے سینگ الگ کر دیتے اور اپنی اس حماقت اور جہالت کو عقل و دانائی قرار دے کر اس مصلحت اندیشِ حقیقی کے قانون میں

اصلاح و تذکیر کرتے رہتے ہیں لیکن اس کا قانون ہماری دسترس سے باہر ہے جو عجیب و حکمت سے پاک ہے
جو تشابہات تا قانون تو ہم اور تمام موجوداتِ عالم میں پوری طاقت اور شوکت کے ساتھ نافذ ہے اور
تمام مخلوقاتِ عالم ایک معینہ مقدار سے لے کر آفتاب، مہتاب کے ایک ادنیٰ سے ذرّے تک اور فرش
سے لے کر عرش تک اسی کی تعمیل اور فرمانبرداری میں ہمہ تن مصروف اور بے اختیار ہے۔

قانونِ خداوندی کا نفاذ کرنے والا بالذات انسان ہی ہے۔ مخلوقاتِ عالم میں صرف انسان
ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے خاص قسم کی صلاحیت اور استعداد عطا فرما کر ایک محدود دائرہ
میں آزاد ارادہ اور اختیار دے دیا ہے۔ وہ اسی آزاد ارادہ اور اختیار کے لئے اس کو قانون شرع کی اس
کی تعمیل ضروری ہے۔ اسی قانون کا نام دین اور مذہب ہے اور اسی کی تعلیم اور یاد دہانی کے لئے انبیاء
کے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے اور اسی سلسلہ تعلیم کو ان انبیاء میں سے افضل خاتم النبیین حضرت محمد
مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مبعوث ہو کر پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اسی کا آپ کی وفات
حسرت آیات سے اکیاسی روز قبل بڑی بھاری تعداد میں آپ کے صحابہ اور پاک نفوس کے بھرے مجمع میں
میدانِ عرفات کے اندر دین تو آج کے روز جمعہ کے دن اور عصر کے وقت یہ اعلان کرا دیا گیا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ (پ ۶ - المائدہ رکوع ۱) ۔

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے میں نے دین اسلام کو پسند کیا۔

اس اعلانِ خداوندی کا یہی منشاء ہے کہ قیامت تک اب دین میں کسی ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ
کی قطعاً کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ ہدایت کے لئے جن احکام کی ضرورت تھی وہ مکمل سب نازل
کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو شخص دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم نے امت کو نہیں دی تو گویا وہ درپردہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دین نامکمل اور میری ترمیم کا
محتاج ہے۔ زیادہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود
رؤف اور رحیم ہونے کے اپنی امت کو بہتر، اعلیٰ اور مکمل طریقہ نہیں بتایا۔ الغرض جس طرح انسان کو

متبع ۔ (الاعتصام ج ۱ ص [illegible])۔ سنت ہوں۔

(۳) امام دار الہجرت حضرت امام مالک (المتوفی ۱۷۹ھ) بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم أن محمدا صلى الله عليه وسلم خان الرسالة لأن الله تعالى يقول اليوم أكملت لكم دينكم فما لم يكن يومئذ دينا فلا يكون اليوم دينا۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے تو گویا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ادائے رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الآیۃ)۔ پس جو چیز اس وقت دین نہ تھی آج بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتی۔

(کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۴۹ و ج ۲ ص ۵۳ للشاطبیؒ)

(۴) علامہ حسام الدین علی المتقی الحنفی (المتوفی ۹۷۵ھ) بدعات اور اہل بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

إن هذا الاجتماع في اليوم الثالث مخصوصاً ليس فيه فرضية ولا فيه وجوب ولا فيه سنة ولا فيه استحباب ولا فيه منفعة ولا فيه مصلحة في الدين۔ بل فيه طعن ومذمة وملامة على السلف حيث لم يفعلوا بل على النبي صلى الله عليه وسلم حيث ترك حقوق الميت بل على الله سبحانه وتعالى حيث لم يكمل الشريعة وقد قال الله تعالى اليوم أكملت لكم

یعنی خصوصیت کے ساتھ تیسرے دن کا اجتماع نہ تو فرض ہے اور نہ واجب، نہ سنت ہے اور نہ مستحب، اور نہ اس میں کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ اس میں کوئی دینی مصلحت ہے بلکہ اس میں طعن ومذمت اور ملامت ہے سلف پر کہ انہوں نے اس کو بیان نہیں کیا بلکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر کہ آپ نے میت کے حقوق بیان نہیں فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی پر کہ اس نے شریعت کو مکمل نہیں کیا (اور ہماری بدعات کی وہ محتاج ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے

دِیْنَکُمْ الآیۃ (بحوالہ تفہیم السنۃ ص۷۳) ۔ آج کے دن تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔

(۵) امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) بدعت اور اہلِ بدعت کی تردید میں فرماتے ہیں :

نورِ سنتِ سنیہ را ظلماتِ بدعتہا مستور ساختہ اند و رونقِ ملتِ مصطفویہ را کدورتِ امورِ محدثہ ضائع گردانیدہ عجیب تر آنکہ جمعے آن محدثات را امورِ مستحسنہ میدانند و آن بدعت را حسنات میدانند و تکمیلِ دین و تتمیمِ ملت از آن محدثات میجویند و در اتیانِ آن امور ترغیبات مے نمایند هداهم الله صراطِ المستقیم۔ نمے دانند کہ دین پیش از این محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالیٰ بحصول پیوستہ کما قال اللہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الآیۃ پس کمالِ دین از این محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است مقتضائے این آیت کریمہ را

روشن سنت کے نور پر بدعات کی تاریکیاں چھا گئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ملت کی رونق کو نئے نئے امور کی کدورت نے ضائع کر دیا ہے بہت تعجب تو ان لوگوں پر ہے جو ان بدعات اور محدثات کو اچھا تصور کرتے ہیں اور ان بدعات کو نیکیاں یقین کرتے ہیں اور دین کی تکمیل اور ملت کی تتمیم ان بدعات سے تلاش کرتے ہیں اور ان امور کی ادائیگی میں ترغیب دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم پر چلائے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دین ان محدثات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اسی سے وابستہ ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے الآیۃ سو دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت اس آیت کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(مکتوبات حصہ چہارم ص۱۲۰ مکتوب ۲۶۰)

(۶) ملا علی بن القاری الحنفیؒ (جن کو بعض حضرات گیارھویں صدی کے مجدد ۔ المتوفی ۱۰۱۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں :

قال اللہ تعالیٰ الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ۔ فلا نحتاج فی تکمیلہ الی امر خارج عن الکتاب و السنۃ۔

(شرح فقہ اکبر ص ملا علی قاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الآیۃ) سو ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے جو کتاب اور سنت سے خارج ہو۔

غرضیکہ دین اسلام ایسا مکمل نظام عمل ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کرنا یقیناً محال ہے اور اس کامل اور مکمل ضابطہ حیات کی موجودگی میں کسی اور ضابطے کی طرف نگاہ اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی حقانیت اور دین اسلام کی عظمت غیروں کی نگاہ میں | جن اہل یورپ کی تقلید کو آج بدقسمتی سے مسلمان مایۂ افتخار سمجھتے ہیں اور مردوں سے لے کر عورتوں تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ہر پیرایہ میں ان کی نقل اتارتے اور ان کے فیشن اور رسم میں رنگے ہوئے اور سیرت و صورت میں ان کی نقالی کے دلدادہ ہیں، ان کی عینک سے اس کامل اور مکمل کتاب کو ملاحظہ کیجئے:

① بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک عیسائی نامہ نگار لکھتا ہے:

"پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ کیونکہ مسلمان جب قرآن و حدیث میں غور کریں گے، تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج اس میں پائیں گے"

② جی۔ایم راڈویل کہتا ہے کہ:

"قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح راہنمائی اور اعلیٰ حکمتوں سے مملو ہیں"۔

③ جرمن مستشرق ڈاکٹر نولڈیکی لکھتا ہے کہ:

"اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے داخل ہوئے جہاں اہل فینیشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت

دنیا پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھائی جبکہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انہوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

④ ڈاکٹر موریل جانسن لکھتا ہے کہ:

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانے کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانے کی تمام صداقتیں خواہ مخواہ اس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔"

⑤ ڈولفت کریبل لکھتا ہے:

"قرآن میں عقائد، اخلاق اور اس کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ عدالت، جبلی انتظامات، مالیات اور نہایت محتاط قانون تعزیرات وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔"

(ماخوذ از مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص ۱۲۱ از اکبر شاہ خان)

⑥ سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں لکھتا ہے کہ:

"جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس "قرآن مجید" کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔"

⑦ مشہور مصنف ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے کہ:

"قرآن دینی تعلیم کی خوبیوں کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے جو کتابیں دیں ان سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔"

⑧ ڈاکٹر مورلیس کہتا ہے کہ:

"قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔"

⑨ ڈاکٹر اسٹین گاس اپنی ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ:

⑰ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اوقیانوس سے گنگا تک قرآن شریف مجموعہ قوانین مانا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں صرف مذہبی مسئلے ہوں بلکہ قوانین دیوانی، فوجداری اور دیگر مضامین بھی اس میں درج ہیں۔ اور وہ قاعدے جو قوموں کے اعمال و افعال کی نسبت مقرر کئے گئے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی بے زوال رضا سے بنائے گئے ہیں یا بہ تبدیل الفاظ ہم اس مطلب کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف مسلمانوں کا مجموعہ قوانین عامہ ہے۔ اس میں قوانین مذہبی اور سلوک باہمی اور فوجداری اور دیوانی اور تجارتی اور فوجی اور عدالتی اور تعزیری سب موجود ہے۔ اور مذہبی رسوم سے لے کر معاملات دنیوی تک ہر ایک چیز کا مفصل بیان ہے۔ قرآن نجات روح اور صحت جسمانی اور حقوق عامہ اور حقوق شخصی بنی نوع انسان اور اخلاق اور نیکی اور بدی اور سزا دینی و دنیوی سب چیز پر حاوی ہے۔" (بحوالہ نوید جاوید صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۵)

⑱ مشہور جرمنی فاضل گوئٹے لکھتے ہیں کہ:

"اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہان اور رومۃ الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی۔ اور جس قدر زمانہ سلطنت روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا، اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔" (بحوالہ رسالہ معجزہ قرآن صفحہ ۱۲۲ نظامی پریس بدایوں)

اسی جامع و مکمل، بے نظیر انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور مرعوب ہو کر برطانیہ کے مشہور مدبر اور وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ:

"جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔" (بحوالہ تحفۂ مکتوبہ صفحہ ۱۵)۔

اور جرمنی کا ہیر گنگش طامس نے کہا کہ:

"مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔" (بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۵)۔

اور گورنر جنرل ہند لارڈ ایلین برا نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا کہ:

نہیں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی طرفداری کرتے رہیں۔ (آل بیتی انڈیا ص۲۹۱)

قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے صحیح جذبات کو دنیا سے ناپید کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو گیا۔ اور لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں کہا کہ:

" ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن دل اور دماغ کے اعتبار سے فرنگی"۔ (مدینہ بجنور ۲۸ فروری ۱۹۴۲ء)

انگریز کا تو بہرحال یہ پروگرام تھا کہ وہ مسلمانوں کی متاع ایمان کو کالجوں، یونیورسٹیوں اور سکولوں کے ذریعہ لوٹیں۔ مگر افسوس صد افسوس تو مسلمانوں پر ہے جنہوں نے اس مکمل کتاب کی قدر نہ کی اور اس سے ہدایت اخذ کر کے نجات روح اور صحت جسمانی حاصل نہ کی۔

وحی غیر متلو اور حدیث ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو وحی خفی یا وحی غیر متلو اور حدیث کہا جاتا ہے، اور جس کی رہبری میں اور جس کے سانچے میں ڈھل کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں کی جامع ہے، ہر ایک کی رہبری کے لئے بہترین نمونہ اور مکمل سامان ہدایت بن گئی ہے، اور اسی کو سنت رسول اللہ کہا جاتا ہے اور اسی وحی خفی کے ذریعہ دی ہوئی تعلیم کا نام قرآن مجید میں حکمت لیا گیا ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ جس میں قرآن مجید کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں اور اعمال کی خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے موافق تعلیم فرمائی ہے جس طرح احکام خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح اسوۂ رسول اور سنت رسول اللہ سے بھی بے پرواہی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ سنت رسول اللہ کی اطاعت بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی، اس لئے کہ دونوں کی پیروی حکم الٰہی کی پیروی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ تو جس طرح قرآن مجید کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت بھی خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اور جو رسول اللہ کی اطاعت کرے تو اس نے

آیت ۔ (سپارہ ۵ ۔ النساء ۔ رکوع ۱۱) اللہ کی اطاعت کی ۔

یہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثواب اور عذاب ، نیکی اور بدی کا تعین اور اس کا صحیح
اندازہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا ۔ جس چیز کو آپ نے نیکی
اور خیر قرار دیا ہو، دنیا میں کوئی شخص اس کی خرابی ثابت نہیں کر سکتا ، اور جس چیز کو آپ نے بدی قرار
دیا ہو دنیا کی کوئی طاقت اس کی بھلائی ثابت نہیں کر سکتی ۔ تمام وہ اخلاق حسنہ جو اقوام عالم اور
نسل انسانی میں مستحسن اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں وہ سب انبیاء اور تعلیمات انبیاء اور خصوصاً جناب
رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم کا نتیجہ ہیں ۔ کیا خوب کہا گیا ہے ؎

چمکتی ہے جو ہر یک اختر نشاں ہے مہ جبینوں کا
جسے ہم روندتے پھرتے ہیں یہ سب خاک انساں ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پہنچائی ہوئی اور بتائی ہوئی ہر ایک تعلیم خدا تعالیٰ
کی بھیجی ہوئی ہدایت ہوتی ہے ، رسول کا کام صرف دین حق کی تبلیغ کرنا ہے ، دین کا بنانا نہیں اور
رسول ہی وہ مطاع ہوتا ہے ، اور اس کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہوتی ہے اور اس کی پیش کردہ تعلیم کا
انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے ۔ رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کو اور اس کی پیش کردہ تعلیم کو ہرگز
یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا ۔

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم عین فطرت انسانی کے موافق اور متوازی ہے ۔
اور انسانی فطرت کے دبے اور چھپے ہوئے جملہ تقاضوں کی ترجمانی ہے ، اور اس کی خلاف ورزی فطرت
سے بغاوت ہے ۔ ہادی برحق راہبر کامل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وآلہ وسلم کی شریعت اور آئین جس توجہ کا مستحق ہے ، اگر دنیا کی توجہ اس کی طرف کی جائے تو آج بھی
مسلمان وہی جوش ایمانی اور وہی حمیت کے کارنامے دنیا کو پھر دکھا سکتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام نے
دکھائے تھے ۔ مذہب اسلام اور شریعت رسول اللہ ہی کے ذریعہ دنیا میں کامل اتحاد ، صحیح عدل اور مکمل
امن وامان قائم ہو سکتا ہے ۔ نہ تو آپ جیسا رہبر کامل دنیا میں پیدا ہوا ۔ اور نہ تا قیامت پیدا ہوگا ۔

اور نہ کوئی نظام و آئین ہی ایسا موجود ہے ؎

شراب خوشگوارم ہست و یار مہرباں ساقی
ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

ولادت سے لے کر وفات تک، خوشی سے لے کر غمی تک زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اس کی اصلاح کے لئے ہم کو صرف سنتِ رسول اللہ اور شریعتِ اسلامی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جو ہر طرح سے محفوظ و موجود ہے۔ کسی دوسری شریعت، کسی دوسرے ہادی، کسی اور آئین اور کسی رسم و رواج کی طرف نہ تو ہمیں نگاہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ بھلا جس کے گھر میں شمع کافوری روشن ہو اس کو فقیر کی جھونپڑی سے اس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ چرانے کی کیا ضرورت اور حاجت ہے؟ ہاں مگر کوئی خوش نصیب اس کی طرف ہاتھ بھی تو بڑھائے۔ کوتاہ دست اور بدقسمت کو سنتِ رسول اللہ کے آبِ حیات سے کیا فائدہ؟

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

سنت کا مقام، صاحبِ سنت کی نگاہ میں :- جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت پر عمل پیرا ہونے اور اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی اشد تاکید فرمائی ہے اور اس کی بے پروائی کرنے پر انتہائی ناراضگی فرمائی ہے۔

(۱) حضرت عرباضؓ بن ساریہ (المتوفی ۷۵ھ) کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الأمور فإن كل محدثة بدعة۔ (مستدرک ج ۱ ص ۹۶) قال الحاکم والذہبی صحیح۔

تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو معمول بناؤ اور اپنی ڈاڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے اس کو پکڑو اور نئی نئی باتوں سے پرہیز کرو کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

یہ صحیح روایت صراحت سے اس امر کو بیان کرتی ہے کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدین کی سنت کو خوب مضبوطی سے پکڑے، اور اس کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور جملہ محدثات اور بدعات سے کنارہ کشی کرے کیونکہ ہر ایک بدعت گمراہی اور ضلالت ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (المتوفی ۶۸ھ) سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا:

یا ایھا الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا کتاب اللہ وسنۃ نبیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) (مستدرک ج ۱ ص ۹۳)

اے لوگو! میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز تم گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ (المتوفاۃ ۵۸ھ) روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ قسم کے لوگ ہیں جن پر میں بھی لعنت بھیجتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت نازل کرے۔ ان میں سے ایک والتارک لسنتی (مستدرک ج ۱ ص ۳۶، قال الحاکم والذہبی صحیح) وہ شخص ہے جو میری سنت کو چھوڑ دے۔

(۴) حضرت انسؓ بن مالک (المتوفی ۹۳ھ) روایت کرتے ہیں کہ ایک خاص موقع پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری ج ۲ ص ۷۵۷)

جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا تو وہ میرا نہیں ہے۔

اس سے بڑھ کر تارک سنت کی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ میرا (امتی) نہیں ہے، گو وہ اپنے مقام پر آپ کا محب بنتا رہے، مگر اس کی بات کا کیا اعتبار ہے؟

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

(۱) مسٹر ایڈورڈ مونٹٹ پروفیسر السنہ شرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ :
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاحِ اخلاق اور رسوم ناشائستہ کے متعلق جو کامیابی ہوئی، اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا چاہئے۔" (بحوالہ مقدمہ تاریخ تمدن اسلام ص۳۲)۔

(۲) مسٹر طامس کارلائل اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھتے ہیں کہ :
"صداقت و شگفتگی قلب اور پاکیزہ روح رکھنے والے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) دنیوی ہوا و ہوس سے بالکل بے لوث تھے۔ ان کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پرجوش ریفارمر تھے، جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خود خدا کی آواز ہے۔ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے انتھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے مقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی۔" (بحوالہ عصر جدید ۱۸ اگست ۱۹۲۹ء)۔

(۳) لندن کا مشہور اخبار "پیرایسٹ" لکھتا ہے کہ :
"محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیم و ارشاد کی قدر و قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم نہ صرف حقیقت بلکہ عقل و دانش سے بیگانہ ہیں۔" (بحوالہ خطبہ مذکورہ ملک از حضرت مولانا قدس اللہ سرہ)۔

احسان فراموشی کی اس سے بدترین مثال بھی کیا دنیا میں کوئی ہو سکتی ہے کہ بیگانے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم و ارشاد اور سنت کی قدر و قیمت کا اعلان کریں اور ہم غیروں کی صورت و سیرت، گفتار و کردار اور رسم و فیشن پر فریفتہ ہوں۔ حیف! ہزار حیف ہے ایسی بے لاف عشق و محبت کے جھوٹے دعوؤں پر۔ خدا کرے امر مینہ کہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر خود ساختہ بدعات اور خود تراشیدہ رسوم کو تسلیم کرنے والے ہر مسلمان کو توفیق غور و فکر کر لینا اور ہر مسلم کی اسلامی حیثیت سے کما حقہ واقف اور آگاہ ہونا

لہٰذا بس لازم اور ضروری ہے اور بغیر اتباع کتاب اور سنت کے محبت خدا اور رسول کا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور سراسر بے کار ہے۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے والد ماجد مولوی نقی علی خان صاحب ارشاد فرماتے ہیں: "دعویٰ محبت خدا اور رسول بدون اتباع سنت سراسر لاف وگزاف ہے" (سرور القلوب ص ۱۳)

الغرض کتاب وسنت ہمارے دستور کی اساس، ہمارے آئین کی بنیاد، ہمارے نظام اجتماعی کا شیرازہ، ہماری سیاست کا ماخذ، ہماری معیشت کا حل، ہماری معاشرت کی بنا اور ہماری تمدنی مشکلات و مسائل کا مرکز اور محور ہے، اور ہماری زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو اصولی طور پر اس کے دائرہ عمل سے باہر ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔

اجماع و اتفاق شرعی حجت ہے کتاب وسنت کے بعد دلائل کی مد میں اجماع کا مرتبہ اور درجہ ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ آسانی کے لئے اجماع کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے۔ حضرات خلفاء راشدینؓ کا اجماع، عام صحابہ کرامؓ کا اجماع اور امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا اجماع۔ ان میں ہر ایک اجماع اپنے مقام پر صحیح اور حجت ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ہم مختصراً کچھ دلائل عرض کرتے ہیں، ان کا بغور مطالعہ کیجئے تاکہ صحیح بات ذہن نشین ہو جائے ؏

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

لیکن اس سے قبل حضرات خلفاء راشدینؓ کی خلافت کے حق ہونے اور ان کی سنت کے واجب الاتباع ہونے کے متعلق مختصراً عرض ہے:

حضرات خلفاء راشدینؓ کی خلافت اور ان کی سنت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فیض یافتہ حضرات ہر ایک اپنے مقام پر آفتاب ہدایت کا درخشاں ستارہ اور سارہ علم کا روشن کوکب ہے۔ مگر یہ بات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جو فیض آپ سے حضرات خلفاء اربعہؓ کو نصیب ہوا، مجموعی لحاظ سے وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور انہی کے وجود مسعود سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا — وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (پ ۱۸ - النور - رکوع ۷)

ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام۔ البتہ (آپ کے بعد) حاکم کر دے گا اُن کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو اور جما دے گا اُن کے لئے دین اُن کا جو پسند کر دیا اُن کے واسطے اور دے گا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے امن، میری بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد سو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت استخلاف سے حضرات خلفاء راشدین کی بہت بڑی فضیلت اور منقبت ثابت ہوئی۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۰ھ) لکھتے ہیں:

”خطاب فرمایا حضرت کے وقت کے لوگوں کو جو ہیں نیک ہیں پیچھے ان کو حکومت دے گا اور جو دین پسند ہے ان کے ہاتھوں سے قائم کرے گا اور وہ بندگی کریں گے بغیر شرک۔ یہ چاروں خلیفوں سے ہوا پچھلے خلیفوں سے اور زیادہ۔ پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے ان کو حکم فرمایا جو کوئی ان کی خلافت سے منکر ہوا، اس کا حال سمجھا گیا“ انتہی (موضح القرآن ص ۴۱۵)۔

لفظ استخلاف میں اشارہ ہے کہ وہ حضرات محض دنیوی سلاطین اور ملوک کی طرح نہ تھے بلکہ وہ پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کرنے والے اور دین حق کی بنیاد میں جمانے والے تھے جنہوں نے خشکی اور تری میں دین اسلام کا سکہ بٹھایا، حتیٰ کہ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا مطلقاً خوف و رعب باقی نہ رہا۔ وہ کامل اطمینان اور امن سے اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول ہو جاتے اور ان کی یہ شان رہی کہ ان کی زندگی میں شرک جلی کو کیا راہ پاتا، شرک خفی کی آمیزش بھی نہ تھی۔ یہ بات انصاف اور قیاس سے بالکل بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو اپنے دین حق کی ترویج و اشاعت کے لئے زمین کی خلافت اور نیابت سپرد کر دے اور وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے اعتماد و انتساب سے محروم رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں اُن کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا :

فإنه من يعش منكم بعدي فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الأمور فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة۔ (ترمذی ج ۲ ص ۹۲، ابن ماجہ ص ۵، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۹، مسند دارمی ص ۲۶، مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۶ اور مستدرک ج ۱ ص ۹۶۔ قال الحاکم والذہبی صحیح)۔

یعنی جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ عنقریب بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ سو تم پر لازم ہے کہ تم میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کو جو ہدایت یافتہ ہیں مضبوط پکڑو اور اپنی ڈاڑھوں اور کچلیوں سے مضبوط دبا کر قابو میں رکھو۔ اور تم نئی نئی چیزوں سے بچو کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے)۔

حضرت ملا علی القاریؒ اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں :

فإنهم لم يعملوا إلا بسنتي فالإضافة إليهم إما لعملهم بها أو لاستنباطهم واختيارهم إياها۔ (مرقات شرح المشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹۹)۔

اس لئے کہ حضرات خلفائے راشدینؓ نے درحقیقت آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اس لئے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کر کے اس کو اختیار کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے بھی کر اختیار کیا ہے وہ بھی سنت ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت امت کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی ہرگز چارہ نہیں اور وہ اس سنت کو تسلیم کرنے کی بھی پابند ہے۔ اور شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۰۵۲ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

پس ہر چہ خلفاء راشدین بداں حکم کردہ باشند اگرچہ باجتہاد و قیاس ایشاں بود موافق سنت است نبوی بدعت نتواں گفت چنانکہ

جس چیز کے بارے میں حضرات خلفاء راشدینؓ نے حکم دیا ہے اگرچہ وہ حکم ان کے قیاس و اجتہاد سے صادر ہوا ہو وہ بھی سنت کے موافق ہے اور اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز

فرق زائغہ کنند۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۴۳) صحیح نہیں جیسا کہ گمراہ فرقے کرتے ہیں۔

یہ عبارت اس بات کی نص صریح ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کے قیاس و اجتہاد سے ثابت شدہ احکام بھی سنت ہی ہوں گے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق اُن پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ (المتوفی ۷۹۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والسنۃ ھی الطریق المسلوک فیشمل ذٰلک التمسک بما کان علیہ ھو وخلفاؤہ الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وھٰذہ ھی السنۃ الکاملۃ۔ (جامع العلوم والحکم ص ۱۹۱)

سنت اس راہ کا نام ہے جس راہ پر چلا جائے اور یہ اس راہ کا تمسک ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدینؓ عامل تھے عام اس سے کہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال و اقوال اور یہی سنت کاملہ ہے۔

یعنی گو لغوی اعتبار سے لفظ سنت کا اطلاق تو عام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے قول و عمل پر بھی ہوتا ہے مگر سنت کاملہ صرف یہی ہے جس کا ذکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلیؒ (المتوفی ۵۶۱ھ) اہل السنت والجماعت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

علی المؤمن اتباع السنۃ والجماعۃ فالسنۃ ما سنّہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والجماعۃ ما اتفق علیہ الصحابۃؓ فی خلافۃ الائمۃ الاربعۃ۔ (غنیۃ الطالبین ص ۱۶۵ طبع لاہور)

مومن پر لازم ہے کہ وہ اہل السنت والجماعت کی پیروی کرے۔ سنت وہ چیز ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (قولاً و فعلاً) مسنون قرار دی اور جماعت وہ (احکام ہیں جن پر) کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے حضرات خلفاء اربعہؓ کی خلافت میں اتفاق کیا۔

اور یہی اہل السنت والجماعت کا وہ گروہ اور جماعت ہے جو ہر قسم کی بدعت سے پاک و صاف ہے چنانچہ علامہ سید سند علی بن محمد الجرجانی الحنفیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں:

اھل السنۃ والجماعۃ ومن ھیٔتھم خالٍ عن بدع ھٰؤلاء (شرح مواقف ص ۶۲۱ طبع لکھنؤ)۔

یعنی اہل السنت والجماعت کا گروہ ہی ایسا ہے جن کا مذہب بدعت سے خالی ہے۔

الغرض حضرات خلفاء راشدین کی سنت حجت ہے اور امت کے لئے اس کی پیروی لازم ہے اور ان کے عہد خلافت میں جن چیزوں پر حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع ہوا وہ بقول شیخ صاحبؒ جماعت کا مفہوم ہے ، اور بغیر اس کے تسلیم کئے اہل السنت والجماعت کا مفہوم ہرگز پورا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی اور اس کا ازالہ بعض حضرات کو شبہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہٖ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہو ، اور جو چیز آپ سے (قولاً و فعلاً) مروی نہ ہو ، اور حضرات خلفاء راشدینؓ میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو ، یا اس کے متعلق حکم دیا ہو تو وہ سنت نہ کہلائے گی۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم امیر یمانی (محمد بن اسمٰعیل المتوفی ۱۱۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ :

و معلوم من قواعد الشریعة انه لیس للخلیفة راشد ان یشرع طریقة غیر ما کان علیه النبی صلی الله علیه وسلم ثم عمرؓ نفسه الخلیفة الراشد سمی ما رآه من تجمیع صلاته لیالی رمضان بدعة ولم یقل انها سنة۔ (سبل السلام ج ۲ ص ۱۰)۔

قواعد شریعت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے ، جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عامل نہ تھے ، پھر حضرت عمرؓ خود خلیفہ راشد ہیں اور رمضان کی راتوں میں لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کو سنت نہیں ، بلکہ بدعت کہتے ہیں۔

لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اولاً اس لئے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنت ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے ہو بہو موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو۔ کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے ، وہ بھی سنت ہے۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے گو اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس چالیس کوڑے سزا دی ، اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا دی ہے ، یہ بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ :

جلد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعین و ابوبکرؓ اربعین وعمرؓ ثمانین وکل سنۃ ۔ (مسلم ج ۲ ص [illegible] و ابوداؤد ج ۲ ص [illegible] و ابن ماجہ ص ۱۸۸)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا دی اور دونوں باتیں سنت ہیں۔

امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے ۔

وأتمها عثمانؓ ثمانین وکل سنۃ ۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۸۱)

اور حضرت عثمانؓ نے بھی اسی کوڑے پورے کئے اور یہ سب سنت ہے۔

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور یکے وطے حضرت علیؓ خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

ھذا دلیل ان علیاً کان معتقدا لآثار عمرؓ وان حکمہ وقولہ سنۃ و امرہ حق وکذلک ابوبکرؓ خلاف ما یکذبہ الشیعۃ علیہ۔ (شرح مسلم ج ۲ ص [illegible])

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے آثار کو سنت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور قول کو سنت اور ان کے امر کو حق سمجھتے تھے اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتے تھے۔ جیسا کہ شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

اگر خلیفہ راشد کے قول اور حکم کے سنت ہونے کے لئے یہ ضروری ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہ حکم یقیناً بدعت ہوتا نہ کہ سنت۔

ثانیاً اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نصاً ثابت ہونے کی بنا پر ہی حضرات خلفاء راشدینؓ کا قول وفعل سنت ہو سکتا ہے تو اس میں حضرات خلفاء راشدینؓ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ اس معنی میں تو ہر ایک ادنیٰ مسلمان کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے جب کہ وہ متبع سنت ہو۔ اس لحاظ سے عام مسلمانوں سے اور خصوصاً و بالخصوص حضرات صحابہ کرامؓ سے علیحدہ کر کے حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنت کی پیروی

کرنے اور حضرات شیخینؓ کی اقتداء کرنے کی احادیث کا کوئی نمایاں پہلو واضح نہیں ہوتا، خصوصاً جبکہ آپ نے اپنی سنت کو اور خلفاء راشدینؓ کی سنت کو واو عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں بظاہر مغایرت ہوتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ حضرات خلفاء راشدینؓ کو شریعت بنانے کا حق کیسے حاصل ہوا؟ تو یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ شارع حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مبلغ ہیں نہ کہ شارع۔ اور اپنے مقام پر ذکر ہوگا کہ قیاس و اجتہاد کو شریعت نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ ایسے امور میں حضرات خلفاء راشدینؓ کا حکم اور قول و فعل ہمارے لئے نہ صرف حجت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق سنت ہے اور حضرات خلفاء راشدینؓ کی بات بھی محض اس لئے حجت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں اُن کی سنت کو کچلیوں اور ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں درحقیقت اطاعت جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت دراصل خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب قنوجیؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

ان ما سنة الخلفاء الراشدون من بعد فالاخذ به ليس الا لامر النبي صلى الله عليه وسلم بالاخذ به۔	آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جو حضرات خلفاء راشدینؓ نے مسنون ٹھہرایا ہے، اس کو محض اس لئے اخذ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے اخذ کرنے کا حکم دیا ہے۔

(الدین الخالص ج ۳ ص ۲۶۳)

باقی حضرت عمرؓ نے جو رمضان مبارک میں ایک قاری پر جمع ہو کر نماز پڑھنے والوں کے عمل کو نعمت البدعۃ سے تعبیر کیا ہے تو اس سے مراد بدعت لغوی ہے جو مذموم نہیں ہے۔ اس سے بدعت شرعی ہرگز مراد نہیں جو مذموم اور قبیح ہے (اس کی پوری بحث بسط کے ساتھ اپنے مقام پر بیان ہوگی ان شاء اللہ العزیز) ورنہ اگر حضرات صحابہ کرامؓ اسی مذموم بدعت کے مرتکب ہوتے اور حضرت عمرؓ خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے بھی ان کو اس قبیح حرکت سے منع نہ کیا اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ کیا تو خلیفۂ راشد وہ کیسے رہتے؟ اور وہ خود مبتدعین

(عزیمت یافتہ) کی تصریحات میں کس طرح شامل ہے؟ اور جب خود انہوں نے بدعت قبیحہ کی اجازت دے دی یا اس پر سکوت اختیار کر لیا تو سنت کی پاسبانی کس نے کی؟ فتدبر

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ثالثاً خود امیر یمانیؒ علامہ بردعیؒ کی ایک تحقیق کی (کہ خلفاء اربعہ کا اتفاق تو حجت ہے مگر ان کی انفرادی بات اور قول اس پوزیشن میں نہیں ہے) تردید کرتے ہیں:

قال البردعی:۔ اذا اتفق الخلفاء الاربعة على قول كان حجة لا اذا انفرد واحد منهم والتحقيق ان الاقتداء ليس هو بتقليد بل هو غيره۔ (سبل السلام ج ۲ ص)

کہ علامہ بردعیؒ کہتے ہیں کہ جب خلفاء اربعہ کسی قول پر اتفاق کر لیں تو وہ حجت ہوگا نہ کہ ان کا انفرادی قول، سو تحقیق یہ ہے کہ اقتداء تقلید نہیں ہے بلکہ اقتداء اور چیز ہے اور تقلید اور ہے۔

اس عبارت میں علامہ امیر یمانیؒ نے علامہ بردعیؒ کی یوں تردید کی ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ میں سے ہر ایک کا قول قابل اقتداء ہے، یہ الگ بات ہے کہ اقتداء اور چیز ہے اور تقلید اور۔ بہرحال ہر ایک کا منفرد قول بھی حجت ہے۔ ہمارے نزدیک اقتداء، اتباع اور تقلید ایک ہی شے ہے، غیر مقلدین کے ہاں اقتداء و اتباع اور چیز ہے اور تقلید اور ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں:

"تقلید عبارت است از قبول رائے کسیکہ قائم نمیشود بداں حجت بلا حجت واز ینجا معلوم شد کہ قبول قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم دریں باب تقلید نیست زیرا کہ قول و فعل او خود حجت است۔"

تقلید کا معنی یہ ہے کہ جس کی بات حجت نہ ہو اس کی رائے کو بغیر حجت شرعی کی وجہ سے بلا حجت تسلیم کیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا تقلید نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا قول و فعل خود حجت ہے۔

اس لحاظ سے حضرات خلفاء راشدینؓ میں سے ہر ایک کی بات کو تسلیم کرنا گو تقلید نہ ہو مگر اقتداء اور اتباع ضرور ہے، اس لئے کہ ان کا قول و فعل تسلیم کرنا حسب تصریح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے لئے لازم ہے اور خصوصیت سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقتداء کے متعلق مستقل حدیث

گئی ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لا ادری ما بقائی فیکم فاقتدوا باللذین من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک تم میں رہوں گا، سو میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتداء کرنا۔

(ترمذی ج ۲ ص ۲۰۷، ابن ماجہ ص ۱۰، مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۵، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۰، مستدرک ج ۳ ص ۷۵)

قال الحاکم والذھبی صحیح۔

امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

قول الشیخین حجۃ اذا اتفقا لا یجوز العدول عنہ وان اتفاق الخلفاء الاربعۃ ایضاً حجۃ۔ (منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۶۲)

حضرات شیخینؓ کا قول حجت ہے، جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے عدول جائز نہیں۔ اسی طرح حضرات خلفاء اربعہؓ کا اتفاق بھی حجت ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ معیار حق ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر عابد و زاہد، متقی و پرہیزگار اور کوئی نہیں گزرا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دائمی خوشنودی اور رضا کا پروانہ اور سند ان کو ان پاکیزہ الفاظ سے عنایت فرمائی ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ (پ ۱۱، التوبہ، رکوع ۲)

اور جو لوگ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے ہیں، اور جو ان کی پیروی کرنے والے ہیں نیکی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام ازلی میں تمام سابقین اولین کو خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار اور ان کے سچے پیروکاروں کو اپنی ابدی رضا اور خوشنودی کی بشارت دی ہے۔ اس ارشاد الٰہی میں مہاجرین اور انصار کے سابقین اور لاحقین دونوں گروہوں کو (بلکہ ایک تفسیر کے لحاظ سے تابعین کرامؒ کو بھی جو الذین اتبعوھم سے) الٰہی سند مل چکی ہے کہ خدا ان سے راضی ہے، وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی جماعت کو معیار حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ (المتوفی ۶۳ھ) روایت

کرتے ہیں (اس روایت کے الفاظ میں اگرچہ جزوی اختلاف ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہی ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملۃ وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی (ترمذی ج ۲ ص ۸۹، مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸ اور مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۰)

کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی سب کے سب فرقے دوزخ میں جائیں گے مگر صرف ایک فرقہ۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ وہ کونسا فرقہ ہوگا۔ فرمایا وہ فرقہ جس نے وہ کام کئے جو میں نے اور میرے اصحاب نے کئے ہیں۔

اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: وھی الجماعۃ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۵، مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸، ابن ماجہ ص ۲۹۸ اور مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۳۰) یعنی نجات حاصل کرنے والا صرف وہی فرقہ ہے جو اس جماعت (صحابہ کرامؓ) کا ساتھ دینے والا ہو۔ اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جیسے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنت ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے اسی طرح ما انا علیہ واصحابی کے ارشاد کے تحت حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال و اعمال بھی ہمارے لئے حق کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ واصحابی کا ارشاد فرما کر اپنی ذات بابرکات اور صحابہ کرامؓ کی ذوات قدسیہ کو حق اور باطل کے پرکھنے کا مقیاس بتایا ہے کہ محض کاغذ کا نے نقوش ہی نہیں بلکہ وہ ذوات بھی معیار حق ہیں جن میں یہ حروف و نقوش اعمال و احوال بن کر سج گئے ہیں اور اسی طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب ان کی ذوات کو دین سے الگ کر سکنا اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ما انا علیہ واصحابی کی حدیث سے صرف حضرات صحابہ کرامؓ کی منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور نہ ان کی محض مقتدائیت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ امت کے حق و باطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض حق پر ہی نہیں بلکہ حق کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیار بھی بن چکے ہیں جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی کھل جاتا ہے۔ اور ان کا معیار حق ہو

باطل ہونا صرف قیاسی ہی نہیں بلکہ ما انا علیہ و اصحابی کے صریح ارشاد سے بطور نص ثابت ہے، جیسا کہ باطل اور گمراہ فرقوں نے ان کو ہدف ملامت بنا کر درحقیقت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر کلوخ اندازی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقت کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی ثقاہت و عدالت، دیانت و امانت، صداقت اور صحبت ایسے مسلم امور ہیں جن پر مدار اسلام ہے، اور ان پر جرح و تعدیل کرنے والا دین کی عمارت کو گراتا ہے۔ حضرت ملا علی ن قاریؒ لکھتے ہیں:

والصحابة كلهم عدول مطلقاً	حضرات صحابہ کرامؓ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں
لظواهر الكتاب والسنة والاجماع	کیونکہ قرآن کریم اور سنت اور معتبر لوگوں کے اجماع کے
من يعتد به۔ (مرقات ج ۵ ص ۵۱۷)	ظاہری الفاظ اور عبارتیں اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

امام ابن الاثیر عزالدین علی بن محمد الجزریؒ (المتوفی ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں:

والصحابة يشاركون سائر الرواة في جميع	حضرات صحابہ کرامؓ تمام باتوں میں تمام راویوں میں شریک
ذلك الا في الجرح والتعديل فانهم كلهم	ہیں مگر جرح و تعدیل میں نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ
عدول لا يتطرق اليهم الجرح لان الله	سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں، ان پر جرح نہیں کیا جا
عز وجل ورسوله زكياهم وعدلاهم	سکتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کی
وذلك مشهور لا نحتاج لذكره۔	پاکبازی اور تعدیل بیان فرمائی ہے اور یہ ایک ایسی مشہور بات
(اسد الغابة في معرفة الصحابة ج ۱ ص ۳)	ہے جس کے ذکر کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔

غرضیکہ حضرات صحابہ کرامؓ امت کے لئے حق و باطل، خیر و شر، سنت و بدعت اور ثواب و عذاب وغیرہ امور کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیار حق ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا وہ حق اور سنت اور باعث نجات ہے اور ان کا ہر قول و فعل ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور وہی ہمارے لئے ترقی اور سرخروئی کا زینہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی تباہی اور بربادی پر منتج ہوگی اور بس۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اقوال صحابہؓ کے سامنے اپنی رائے کا ختم کرنا ضروری ہے یہی اصل بات ہے" (ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص ۱۲)

نیز وہ لکھتے ہیں :

"اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے اقوال میں اوّل تو رفع یعنی رسول ؐ کی حدیث ہونے کا احتمال قوی ہے ، اور اگر کہیں فہم کا دخل ہو تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی طرف زیادہ نزدیک ہیں ، کیونکہ صحابہؓ آپ کی طرز بات اور طرز استدلال کو دیکھتے تھے ۔ اور آپ کے کنایہ واشارے سے خوب سمجھتے تھے ، اور جتنی باتیں مذہب سے تعلق رکھتی ہیں اُن سے خوب واقف تھے ۔ اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں ۔ اس لئے پچھلوں کا اجتہاد پر صحابہؓ کے اقوال کو مقدم کرنا لازم ہے ۔ اور صحابہؓ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لئے اُن کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں ۔ بس یہ ہیں اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے کے معنی " (تفہیم انتہی بلفظہ ۔ ایضاً ص) ۔

اگر حضرات صحابہ کرامؓ کا کسی بات پر اجماع و اتفاق ہو جائے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی بدبخت کلام کرتا ہو چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

" صحابہ کرامؓ کا اجماع واجب الاتباع ہے ، بلکہ صحابہ کرامؓ کا اجماع قوی تر حجت اور دوسری (غیر منصوص) حجتوں پر مقدم ہے " (اقامۃ الدلیل ج ۳ ص) ۔

اور حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانیؒ (المتوفی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :

ان اهل السنّة والجماعة متفقون على ان الجمع الصّحابة حجة (فتح الباری ج ۱۲ ص) ۔ کہ اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں ، کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع حجت ہے ۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع کے حجت ہونے پر متعدد حوالجات پیش نظر ہیں ، مگر ہمارا مقصد اوّل کا

له حضرات صحابہ کرامؓ کی تقلید اور حجیت کے بارے میں تفصیل کے لئے استیعاب ج ۱ ص ، اصابہ ج ۱ ص ، مقدمہ الغزالی الاصولی ج ۲ ص ، فواتح الرحموت ج ۲ ص ، اور مسلم الثبوت ج ۲ ص وغیرہ ملاحظہ کریں —— اور اجماع صحابہؓ اور اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے کے لئے ، منہاج السنہ ج ۱ ص ، اعلام الموقعین ج ۱ ص ، مجمع الزوائد ج ۱ ص ، طبقات السبکی ج ۱ ص ، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ، کتاب العلم لابن عبد البر ج ۲ ص (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

استیعاب نہیں بلکہ صرف بطور نمونہ یہ چند عبارتیں ہدیۂ قارئین کرام کر دی گئی ہیں جن سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ذوات کو بھی دین کے حق و باطل پرکھنے کا معیار اور مقیاس بنایا گیا ہے۔

اجماعِ اُمّت حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت اور حضرات صحابۂ کرامؓ کے اجماع کے بعد اُمتِ مرحومہ کے اجماع و اتفاق کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمتِ مرحومہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتا ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ - (پ۴۔ آل عمران ع ۲)

کہ تم سب اُمتوں سے بہتر اُمت ہو جو بھیجی گئی انسانوں کی بھلائی کے لئے حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو نہ تو صرف اُمت کہا اور نہ وسط اُمت، بلکہ بہتر اور اعلیٰ اُمت کہا۔ اس لئے کہ اس اُمت کا کام دنیا میں نیکی کی تعلیم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ پھر یہ صرف اپنی ہی قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی اُمت کے متعلق ارشاد فرمایا:

انتم شہداء اللہ فی الارض (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۴۵)

کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں گواہ ہو۔

جس چیز کو یہ اُمت خیر کہے گی وہ عند اللہ تعالیٰ بھی خیر ہی ہوگی، اور جس چیز کو شر کہے گی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی شر ہی ہوگی۔ یہ اُمت سرکاری گواہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) الاحکام للآمدی ج ۲ ص ۸۶، ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۱۱، اور غیر مقلدین حضرات کی مشہور کتاب تیسیر الباری ج ۳ ص ۱۰۳ وغیرہ ملاحظہ کیجئے۔

نوٹ: اسی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والا تارکِ سنت کہلاتا ہے چنانچہ مشہور عالم علامہ ذہبیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شاطبیؒ نے صحیح لکھا ہے: واما ترك السنة فالخروج من الجماعة (المنتقیٰ ص ۳۱۱، الاعتصام ج ۱ ص ۱۳۰، منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۳۱) وغیرہ یعنی جماعت سے نکلنا ہی ترکِ سنت ہے۔

دن اسی اُمت کی شہادت پر تمام اُمتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اور اسی اُمت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔

اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد امام حاکمؒ (المتوفی ۴۰۵ھ) لکھتے ہیں:

یستدل بها على الحجة بالاجماع (مستدرک ج ۱ ص [illegible])

اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ اجماع حجت ہے۔

اور علامہ شمس الدین ابو عبداللہ الذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

تستدل على ان الاجماع حجة۔ (تلخیص المستدرک ج ۱ ص [illegible])

یعنی ان احادیث سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

اور حضرت ملا علی القاریؒ "ان اللہ لا یجمع امتی علی ضلالۃ (الحدیث)" کی شرح میں لکھتے ہیں:

فی الحدیث دلیل على حقیة الاجماع۔ (مرقات علی المشکوٰۃ ج ۱ ص [illegible])

کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ اُمت کا اجماع حق اور صحیح ہے۔

اُمت کے اجماع کے حق اور صحیح ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں، اور اربابِ اُصول نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ مشہور اصولی شیخ الاسلام علی بن محمد البزدوی الحنفیؒ (المتوفی [illegible]) تحریر فرماتے ہیں کہ:

فصار الاجماع کآیة من الکتاب او حدیث متواتر فی وجوب العمل والعلم فیکفر جاحده فی الاصل۔ (اصول بزدوی ج ۲ ص [illegible])

اجماع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم کی آیت یا حدیث متواتر۔ جیسے یہ موجب عمل و علم ہیں، اسی طرح اجماع بھی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس اجماع کا منکر کافر ہوگا۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

والاجماع اعظم الحجج۔ (الحسبة ص [illegible])

اجماع بہت بڑی حجت ہے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

وأما اجماع الامة فهو فی نفسه حق لا تجتمع

بہرحال اُمت کا اجماع فی نفسہ حق ہے، اُمت کبھی گمراہی

لانه علی حسنة وكذلك القياس صحيح۔
(الحسبة ذکرہ فی معارج الاصول ص ۵۹)

یہ مختص نہیں ہوگی اور اسی طرح قیاس بھی صحیح یعنی حق اور ثابت ہے۔

خیر القرون کا تعامل بھی حجت ہے

حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی اکثریت کا کسی کام کو بجا لانا یا چھوڑنا بھی ایک حجت شرعی ہے اور ہمیں ان کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ اس امر کے ثبوت پر متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حدیثیں عرض کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (المتوفی ۳۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

عن النبي صلى الله عليه وسلم قال خير الناس قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم يجيء اقوام تسبق شهادة احدهم يمينه ويمينه شهادته (بخاری ج ۱ ص ۳۶۲ و ج ۲ ص ۹۵۷ ومسلم ج ۲ ص ۳۰۹ ومسند طیالسی ص ۳۹ وموارد الظمآن ص ۵۶۹)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں پھر ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے پھر ایسی قومیں آئیں گی جن کی شہادت قسم سے اور قسم شہادت اور گواہی سے سبقت کرے گی۔

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اوصيكم باصحابي ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم يفشو الكذب حتى يحلف الرجل ولا يستحلف ويشهد ولا يستشهد فمن اراد منكم بحبوحة الجنة فليلزم الجماعة (الحديث) (مسند ابو داود طیالسی ص ۷ ومستدرک ج ۱ ص ۱۱۴ قال الحاکم والذهبی علی شرطهما ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۴ ورواه النسائی واسنادہ صحیح وموارد الظمآن ص ۵۶۸)

میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں (کہ ان کے نقش قدم پر چلنا) پھر ان کے بارے میں جو ان سے ملتے ہیں، پھر ان کے بارے میں جو ان سے ملتے ہیں، پھر جھوٹ عام ہو جائے گا یہاں تک کہ آدمی بلا قسم دیئے بھی قسم اٹھائیں گے اور بلا گواہی طلب کئے بھی گواہی دیں گے۔ سو جو شخص جنت کے وسط میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑے۔

حضرت عمران بن حصین (المتوفی ۵۲ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم ثم تاتی اقوام یعطون الشہادۃ قبل ان یسئلوہا (مستدرک ج ۳ ص ۴۷۱ واللفظ لہ) قال الحاکم والذہبی علی شرطہما وترمذی ج ۲ ص ۴۲

کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب لوگوں سے بہتر قرن میرا ہے، پھر اُن کا جو اس سے ملتے ہیں، پھر وہ جو اس سے ملتے ہیں پھر ایسی قومیں آئیں گی جو اس سے قبل کہ اُن سے گواہی طلب کی جائے وہ گواہی دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

ویخونون ولا یؤتمنون ویفشوا فیہم السمن۔ (ترمذی ج ۲ ص ۴۲) وقال حسن صحیح۔

(خیر القرون کے بعد آنے والے لوگ خیانت کریں گے اور امانت میں ان پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ان میں موٹاپا خوب ظاہر ہوگا یعنی فکرِ آخرت سے غافل اور حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر خوب کھائیں گے)

اور ان کی ایک روایت میں یوں آتا ہے :

وینذرون ولا یوفون۔ (ایضاً ج ۲ ص ۴۲)

اور وہ لوگ نذریں مانیں گے اور اُن کو پورا نہیں کریں گے۔

ان روایات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون کے بعد جو لوگ پیدا ہوں گے اُن میں دین کی وہ قدر و عظمت نہ ہوگی جو خیر القرون میں تھی۔ جھوٹ ان میں بکثرت رائج ہو جائے گا۔ بات بات پر بلا طلب کے قسم اٹھاتے پھریں گے اور بے تحاشا گواہی دیں گے۔ امانت کی پروا نہ کریں گے اور خیانت اُن کا پیشہ ہوگا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے ایسے بے نیاز ہوں گے کہ کھا کھا کر خوب فربہ ہوں گے اور پیٹ کی فکر کی وجہ سے حلال و حرام کی تمیز ہی جاتی رہے گی۔ نذریں اور منتیں مان تو لیں گے مگر اُن کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ الغرض ظاہری اور باطنی، قولی اور فعلی ہر قسم کے معاملات میں اُن کی دینی زندگی میں انحطاط ہی انحطاط ہوگا۔ ظاہر امر ہے کہ امانت و صداقت و حق پسندی کا جو جذبہ خیر القرون کے لوگوں میں تھا، وہ بعد والوں میں نہ تھا۔ کیونکہ خیر القرون کے بعد جھوٹ، خیانت اور جھوٹی گواہی کے

علاوہ ایسی ایسی بدعات اور خرافات نکالی گئیں کہ دینِ اسلام مظلوم ہو گیا اور بدعت نے سنت کی جگہ لے لی۔ بلاشک خیر القرون میں بھی فتنوں نے سر اٹھایا تھا مگر اوّل تو وہ بہت کم پیدا ہونے والے بیرونی اور وقتی فتنوں سے بہت کم تھے۔ و ثانیاً خیر القرون کی اکثریت نے ان کو قبول کرنے سے سراسر انکار کر دیا بلکہ ان فتنوں کو مٹانے کے لئے انہوں نے اپنی عزیز جانیں بھی قربان کر دیں اور بعد کو آنے والوں میں یہ جذبہ بہ نسبت بہت ہی کم رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ :

سأل رجل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس خیر قال القرن الذی انا فیہ ثم الثانی ثم الثالث (مسلم ج ۲ ص ۳۱۰)۔

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون لوگ بہتر ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ قرن بہتر ہے جس میں میں ہوں پھر دوسرا قرن بہتر ہے اور پھر تیسرا۔

حضرت امام محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) خیر القرون کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے قرن کے متعدد معانی بیان کرتے ہیں اور پھر آخر میں لکھتے ہیں :

والصحیح ان قرنہ صلی اللہ علیہ وسلم الصحابة والثانی التابعون والثالث تابعوھم۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹)۔

صحیح بات یہ ہے کہ آپ کے قرن سے حضرت صحابہ کرامؓ کا قرن اور دوسرے قرن سے تابعینؒ کا قرن اور تیسرے قرن سے تبع تابعینؒ کا قرن مراد ہے۔

اس سابق بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ خیر القرون تین قرن ہیں اور انہی کو قرونِ ثلاثہ یا قرونِ مشہود لہا بالخیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ پہلے قرن سے حضرات صحابہ کرامؓ اور دوسرے سے تابعینؒ اور تیسرے سے تبع تابعینؒ مراد ہیں۔

مشہور مؤرخ اسلام علامہ عبد الرحمٰن بن خلدون المغربیؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :

ھذا ھو الذی ینبغی ان تحمل علیہ افعال السلف من الصحابة والتابعین فھم خیار الامة واذا جعلناھم عرضة القدح فمن

اسی خیریت پر مناسب ہے کہ سلفؒ کے اعمال کو محمول کیا جائے جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ تھے وہ امت کی بہترین جماعت تھی اور جب ان حضرات کو ہدف ملامت بنا دیں تو پھر

الذي يختص بالعدالة والنبي صلى الله عليه وسلم يقول خير الناس قرني ثم الذين يلونهم مرتين او ثلاثا ثم يفشوا الكذب فجعل الخيرية وهي العدالة مختصة بالقرن الاول والذي يليه فاياك ان تعود نفسك او لسانك التعرض لاحد منهم۔
(مقدمہ ابن خلدون ص۱۵۸)

عدالت کے ساتھ کون مختص ہوگا بحالیکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لوگوں کا بہترین قرن میرا قرن ہے۔ پھر وہ ہے جو اس سے متصل ہے، دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ، پھر جھوٹ رائج ہو جائے گا۔ آپ نے ان کی بہتری کو عدالت میں منحصر کر دیا ہے اور وہ قرن اوّل اور ثانی اور ثالث کے ساتھ خاص ہے۔ خبردار ان میں سے کسی کے متعلق دل میں برا خیال اور زبان پر برا لفظ ہرگز نہ لانا۔

اور یہی علامہ عدالت کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

العدالة وهي وظيفة دينية۔ (مقدمہ ص۲۲۱)

عدالت دین کا ایک وظیفہ ہے اور دین کی ایک عمدہ خصلت ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خیر القرون کے تین قرن ہیں اور ان قرنوں سے مراد حضرات صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعینؒ کا قرن ہے تو طبقات رجال کی کتابوں میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ تبع تابعینؒ کا دور ۲۲۰ھ تک رہا ہے اور یہی وہ حضرات ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہمیں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور وہی اس امت مرحومہ کا بہترین گروہ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فریق مخالف کے وہ اعتراضات جو خیر القرون کے مفہوم پر ان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں یہاں پیش کر دیں اور ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈالیں کہ وہ کیا کہتے ہیں:

پہلا اعتراض:

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کی روایتوں میں جو مسلم وغیرہ میں ہیں، شک کے الفاظ آتے ہیں۔ بعض روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرن ذکر کئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قرن ذکر کئے۔ اب کیسے معلوم ہو کہ تین قرن خیر القرون ہوں گے یا چار (محصلہ) ان کے اصل

بعض الفاظ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:

"پس قرونِ ثلاثہ کا قاعدہ بروایات صحیحہ مشکوک ٹھہرا۔" (ملخصاً انوار ساطعہ صفحہ ۲)

جواب:

ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عمران بن حصینؓ اور حضرت عائشہؓ کی جو صحیح روایات پیش کی ہیں ان میں علی التعیین تین قرن ہی ذکر کئے گئے ہیں۔ چوتھے قرن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت بخاری شریف میں متعدد جگہ آئی ہے (مثلاً ج ۱ ص ۳۶۲ و ج ۱ ص ۵۱۵ و ج ۲ ص ۹۵۱ و ج ۲ ص ۹۸۹)۔ مگر ان میں نہ شک کے الفاظ آتے ہیں اور نہ چوتھے قرن کا ذکر ہے۔ امام مسلمؒ نے جو حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی اصول میں پیش کی ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ امام مسلمؒ نے جو روایات متابعات میں اور درجہ دوم میں پیش کی ہیں، جن میں ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ اور دوسری حضرت ابو ہریرہؓ کی اور تیسری حضرت عمران بن حصینؓ کی ہے ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن امام مسلمؒ کا قاعدہ ہی الگ ہے۔ وہ اپنے مقدمہ مسلم ص ۴ میں لکھتے ہیں کہ "ہم درجہ اول میں صرف وہ روایات پیش کریں گے جن کے راوی حفظ اور اتقان میں مسلم ہوں گے اور وہ چنداں وہم اور خطا کا شکار بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ اور درجہ دوم میں ایسے راویوں کی روایتیں ہوں گی جو حفظ و اتقان میں بھی پہلے راویوں کے ہم پلہ نہ ہوں گے نیز ان سے خطا اور وہم بھی صادر ہوا ہوگا۔" امام مسلمؒ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے تین قرن والی روایت بالکل صحیح ہے اور جن روایتوں میں چار قرنوں کا ذکر ہے وہ راویوں کے وہم اور ان کی غلطی پر محمول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ ان شک والی روایتوں کے بعد حضرت عائشہؓ کی تین قرن والی روایت پیش کر کے اس پر مہر لگاتے ہیں کہ صحیح تین ہی قرن ہیں۔ لہٰذا قرونِ ثلاثہ کا تعین صحیح روایات سے ثابت ہوا، اور شک والی روایتیں راویوں کے وہم اور خطا پر محمول ہوئیں۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ امام مسلمؒ نے جو روایتیں متابعات میں اور درجہ دوم میں نقل کی ہیں، ان میں بعض میں یہ الفاظ آتے ہیں (واللہ اعلم اذکر الثالث ام لا)۔ اس سے بھی بخوبی ثابت ہے کہ آپ نے (اپنے قرن کے بعد) تیسرے قرن کا ذکر کیا ہے یا نہیں کیا؟

اور بعض میں یوں آتا ہے : فلا ادری اذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد قرنہ مرتین او ثلاثا ۔ مجھے معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرنوں کا ذکر کیا یا تین کا ۔ بخاری میں حضرت عمرانؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں ۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ راوی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کی لاعلمی سے جاننے والوں کی روایت پر (جن میں حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ ہیں) مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا جو اپنے حفظ و اتقان صحیح اور پختہ علم اور یقین و وثوق کے ساتھ صرف تین قرنوں کا ذکر فرماتے ہیں اور ان کی روایات میں کوئی نقطہ شک اور شبہ کا بھی نہیں ہے ۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ جو راوی اپنی لاعلمی کا ذکر کرتے ہیں ان کی روایات کو لے کر تین قرنوں کے قاعدہ کو مشکوک ٹھہرایا جا رہا ہے ، اور وثوق و اعتماد سے صرف تین ہی قرن بیان کرنے والوں کی صحیح روایات کی طرف دھیان ہی نہیں کیا جاتا ۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

دوسرا اعتراض :

مولوی سعید احمد صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ قرن واقع ہوا ہے ، اور یہ بہت معانی میں مشترک ہے ۔ قرن ہم سن القوم کو بھی کہتے ہیں ، کما فی القاموس ۔ اور بعضوں نے کہا ، قرن زمانہ ہے اور بعضوں نے کہا مدت ، پھر اس میں بھی اختلاف ہے ۔ دس[۱۰] برس یا چالیس[۴۰] یا ستر[۷۰] یا سو[۱۰۰] یا ایک سو بیس[۱۲۰] الخ ۔ (از رسالہ طلوع صلا جلد نظم) ۔

جواب :

مولوی صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انھوں نے قرن کے معنی قاموس سے سینگ اور زلف کے نہیں نقل کر دیئے ، ورنہ ان کا کوئی کیا بگاڑ لیتا ؛ مگر یہ ان کی ایک اصولی اور کھلی غلطی ہے کہ وہ لفظ قرن کی تفسیر میں کبھی قاموس کی طرف دوڑتے ہیں اور کبھی بعضوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں ۔ اگر وہ ذرا سی تکلیف گوارا کرتے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی طرف مراجعت کرتے تو خود بخود ان کا وہم دور ہو جاتا ۔ اور خود ان کو اقرار ہے کہ محدثوں میں یہ مسلّم ہوا ہے کہ بعض حدیثیں شرح ہوتی ہیں بعض حدیث کی ایک دوسرے کی

بحوالہ مشکوٰۃ بر مسلم کے حوالے سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ ایک سائل کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر قرن وہ ہے جس میں میں ہوں اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا"۔ یہ جواب آپ نے ای الناس خیر (کہ کون لوگ بہتر ہیں؟) کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس صحیح اور صریح روایت سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ نے خیریت کو تین قرنوں میں منحصر کر دیا اور حرف ثم کے ساتھ وجہ بوجہ خیریت کی تین قرنوں میں تخصیص اور تفضیل کر دی ہے۔ اور دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپ نے قرن کے معنی سید القوم نہیں لیے کہ ہمیں قاموس وغیرہ کی ورق گردانی کرنی پڑے، بلکہ آپ نے قرن کے معنی بہتر ین انسانوں کے ایک طبقہ کے لیے ہیں اور اس معنی میں پہلا قرن حضرات صحابہ کرامؓ کا، دوسرا تابعینؒ کا اور پھر تیسرا تبع تابعینؒ کا قرن ہے۔

حضرت ابو سعید الخدریؓ (المتوفی سنہ ۷۴ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یأتی علی الناس زمان فیغزو فئام من الناس فیقال هل فیکم من صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یأتی علی الناس زمان فیغزو فئام من الناس فیقال هل فیکم من صاحب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یأتی علی الناس زمان فیغزو فئام من الناس فیقال هل فیکم من صاحب من صاحب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لهم۔ (بخاری ج ۱ ص ۵۱۵ و مسلم ج ۲ ص ۳۰۹)

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی۔ کہا جائے گا کہ کیا تم میں کوئی صحابی ہے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ سو ان کی وجہ سے ان کو فتح نصیب ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ایک گروہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا کیا تم میں کوئی تابعی ہے؟ وہ جواب دیں گے ہاں۔ سو ان کی برکت سے کامیابی حاصل ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ایک طائفہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا کیا تم میں کوئی تبع تابعی ہے؟ وہ بولیں گے، ہاں۔ سو ان کی بدولت فتح و کامرانی ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی سابق روایت سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح اور آشکارا ہو جاتی ہے کہ

خیر القرون کا معنیٰ اور مفہوم کوئی مجمل اور گول مول حقیقت نہیں ہے بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خیر القرون کا مفہوم قرنِ اوّل، ثانی اور ثالث کے امتداد اور منحصر ہے۔ اور قرن کا معنیٰ اور مفہوم بھی مجمل نہیں بلکہ اس سے انسانوں کا بہترین طبقہ مراد ہے اور اسی لحاظ سے حضرت ابوسعید الخدریؓ کی حدیث کے پیشِ نظر خیر القرون کا مفہوم حضرات صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ میں منحصر ہے تو ہمیں قرن سے دس سال مراد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ چالیس، ستر اور سو وغیرہ۔ باقی جن لوگوں نے قرن کے یہ معانی لکھے ہیں، تو صحیح اور صریح حدیث کے ہوتے ہوئے اُن کی بات قابلِ التفات ہی نہیں ہے۔

تنبیہ: حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ایک روایت میں جس کو امام مسلمؒ نے درجہ دوم میں بطورِ متابعت پیش کیا ہے، چار طبقوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

وفی روایۃ مسلم ذکر طبقۃ رابعۃ وھی روایۃ شاذۃ و اکثر الروایات یقتصر علی الثلاثۃ۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۴)

مسلم کی ایک روایت میں چوتھے طبقہ کا ذکر بھی آیا ہے مگر وہ روایت شاذ ہے، اور اکثر روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر آتا ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحیح روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر ہے جو حضرات صحابۂ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے طبقات ہیں۔ چوتھے طبقے کا ذکر جس روایت میں آیا ہے وہ حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک معلول اور شاذ ہے۔ اور یہ اصولِ حدیث کا قاعدہ ہے کہ شاذ روایت کو لے کر اس کی وجہ سے صحیح روایات کو معلول نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اور شاذ روایت خود متروک اور ناقابلِ استدلال ہوگی۔ (دیکھئے توجیہ النظر ص ۱۲۱ وغیرہ)۔

تیسرا اعتراض:

مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں کہ: کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرونِ اولیٰ میں جو کچھ ہوگا سب خیر ہوگا اس لئے کہ تمام بدعتیں قدر و ارجاء و خروج و رفض وغیرہ سب قرونِ ثلاثہ ہی میں پیدا ہوئیں اور باوجود خیر القرون میں ہونے کے سب ان کو کل اہلِ سنت و جماعت بدعت خیر نہیں کہتے (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص ۱۲)۔

اور مفتی احمد یار خان صاحب نے تو کمال ہی کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: یہ مطلب نہیں کہ ان تین زمانوں میں جو بھی کام ایجاد ہوا، اور کوئی بھی ایجاد کرے وہ سنت ہو جاتے۔ یہاں سنت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے۔ ورنہ مذہب جبریہ اور قدریہ زمانہ تابعینؒ میں ایجاد ہوا، اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قتل اور حجاج کے مظالم ان ہی زمانوں میں ہوئے۔ تو کیا معاذ اللہ ان کو بھی سنت کہا جائے گا؟
(بلفظہ جاء الحق و زہق الباطل صـ۲۱۲)۔

جواب: یہ دونوں معترض صاحبان خود ایک اصولی غلطی کا شکار ہیں، اس لئے وہ دور از کار باتیں بنا کر ایجاد بدعات کا چور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان دونوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خیر القرون کی احادیث میں قرن سے مراد زمانہ ہے اور خیر القرون سے حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے تین زمانے مراد ہیں، جب ہی تو ان کو جبریہ اور قدریہ کے فرقوں کا اور خارجیوں اور رافضیوں کے گروہوں کا اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور حجاج کے مظالم کا قصہ چھیڑنا پڑا کہ یہ سب کام ان تین زمانوں میں ہوئے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی بھی سنت نہیں کہتا، اور خیر القرون کی حدیث سے استدلال کرنے والے یا تو ان بدعات اور مظالم کو بھی سنت کہیں اور یا اس حدیث سے استدلال ہی نہ کریں، تاکہ ہمارے لئے بدعات کی ایجاد میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور ہم جس چیز کو چاہیں سنت یا کم از کم بدعت حسنہ کا غلاف پہنا کر اس پر عمل کرتے رہیں۔ لیکن انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ اگرچہ لغت میں قرن کے جہاں اور معنی بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک معنی زمانہ بھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرن کا خود کیا معنی اور مفہوم بیان فرمایا ہے۔ سو آپ نے صحیح روایات میں یہ بتایا کہ آپ نے قرن کا معنی زمانہ نہیں کیا، بلکہ قرن کا معنی آپ نے اہل زمانہ کیا ہے۔ زمانہ اور اہل زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اہل زمانہ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انسانوں کا وہ طبقہ جو ایک زمانہ میں اکٹھا رہے، اور وہ قرن اول میں حضرات صحابۂ کرامؓ، قرن ثانی میں

لہ علامہ فیومیؒ مصباح المنیر میں لکھتے ہیں القرن الجیل من الناس (یعنی قرن کا معنی اہل کل مدۃ و مکان فیہا نبی او طبقۃ من اہل العلم کرتے ہیں) صاحب مجمع البحار قرن کا معنی اہل کل زمان کرتے ہیں (مجمع البحار جلد ۳)

تابعین اور قرنِ ثالث سے مراد تبع تابعین ہیں۔ اور اس روایت کی تشریح میں امام نوویؒ اور علامہ ابن خلدونؒ
کی عبارتیں بھی نقل کی جا چکی ہیں کہ قرنِ اول سے حضرات صحابہ کرامؓ اور ثانی سے تابعینؒ اور ثالث سے
تبع تابعینؒ کے پاک نفوس اور خود ان ہی برگزیدہ ہستیاں مراد ہیں۔ اور اگر احادیث پر معمولی غور بھی
کر لیا جاتا تو مغالطہ حل ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سائل نے ان
آنحضرت سے سوال کیا تھا: ای الناس خیر؟ کون لوگ بہتر ہیں؟ سائل نے اہل زمانہ کا سوال کیا ہے
زمانہ کے متعلق سوال نہیں کیا۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد
فرمایا کہ بہترین قرن میرا ہے پھر ثانی اور پھر ثالث۔ یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ سائل تو ای الناس خیر
کہتا ہو کہ اہل زمانہ کی خیریت پوچھتا ہو اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کو زمانہ کی
خیریت بتاتے ہوں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان یہ کیا تماشہ ہوا؟ بخاریؒ کی ایک روایت میں
خیر الناس قرنی آیا ہے اور دوسری میں خیرکم قرنی آیا ہے۔ اور مسلم وغیرہ میں خیر امتی قرنی
آیا ہے۔ یہ تمام روایات آفتاب نیم روز کی طرح اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم زمانہ کی خیریت نہیں بیان فرمانا چاہتے بلکہ الناس، کم اور امتی (کہ لوگوں میں بہتر تم
میں بہتر اور میری امت میں بہتر) سے اہل زمانہ کی خیریت بیان فرماتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کی یہ
روایت بھی نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے متعلق
پھر ان کے بعد والوں کے متعلق اور پھر ان کے بعد آنے والوں کے متعلق وصیت کرتا ہوں (کہ ان کی پیروی
کرنا) یہ تو نہیں فرمایا کہ میں صحابہؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانہ کے بارے میں تمہیں وصیت کرتا
ہوں کہ اس زمانہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین زمانوں کی پیروی کرنے
کا حکم نہیں دیا بلکہ ان تین زمانوں میں جو اہل زمانہ تھے ان کی پیروی کا حکم دیا ہے اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن حجرؒ اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ قرن کا معنی اھل زمان واحد متقارب الخ
نقل کرتے ہیں۔ دیکھئے المطالب ص ۲۲ و ص ۲۲۴ اور صاحب المطالع معنی کرتے ہیں: القرن امۃ ھلکت
فلم یبق منھم (ایضاً ص ۲۲۴)

ہو۔ تابعین اور تبع تابعین کی ذوات اور ان کی ہستیاں تھیں۔ باقی صحابی کی تعریف واضح ہے جس میں
تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اور تابعی وہ ہوتا ہے جس نے صحابی کی اتباع کی ہو۔ اور تبع تابعی وہ ہوتا ہے
جس نے تابعی کی اتباع کی ہو۔ اگر تبع تابعی نے تابعی کی اتباع نہ کی یا تابعی نے صحابی کی اتباع نہ کی تو وہ ہرگز
تبع تابعی اور تابعی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ جیسا کہ صحابی وہ ہے جس نے حالت ایمان میں آنحضرت صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی نہ چھوڑی ہو۔ جو آپ کے طریقے سے ہٹ گیا وہ صحابی نہ رہا بلکہ مرتد اور منافق کہلایا۔
اس بحث کو پیش نظر رکھ کر مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خاں صاحب سے پوچھئے کہ کونسا صحابی
یا تابعی یا تبع تابعی تھا جس نے جبریہ اور قدریہ کے فرقے ایجاد کئے اور رفض وخروج کی بدعت ایجاد کی۔ وہ کونسا
تابعی اور تبع تابعی تھا جس نے امام حسینؓ کو شہید کیا اور حجاج کو مظالم کی اجازت دی؟ بلاشک یہ اور ان جیسے
بہت سے بدعات اور مظالم ان زمانوں میں ظاہر ہوئے۔ لیکن خیر القرون زمانے نہیں کہ ان زمانوں میں جو بھی ایجاد
ہو ان کی پیروی کی جائے۔ بلکہ خیر القرون ان زمانوں میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ
اور تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ اور نہ تو انہوں نے بدعات ایجاد کیں اور نہ مظالم کئے اور انہی کی پیروی
کا حکم ہے۔ باقی جو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا وہ نہ صحابی رہا اور نہ
تابعی اور نہ تبع تابعی۔ اور ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کے ہرگز پابند اور مکلف نہیں بلکہ ان کی مخالفت کرنا
ضروری ہے۔ باقی رہی اجتہادی غلطی تو وہ محل نزاع سے خارج ہے۔ مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی
احمد یار خاں صاحب کی یہ ایک اصولی غلطی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے خیر القرون کی تفسیر غلط کی اور غلط
کو اور یہ نہ سمجھے کہ ہم خود غلط کار ہیں۔ سچ ہے ع

میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

مفتی احمد یار خاں صاحب نے خیر القرون کے مفہوم پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں سنت
ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے؟ سبحان اللہ تعالیٰ کیا ہی نرالی اور عجیب محققانہ تحقیق ہے۔ اگر جناب نبی کریم صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم صرف اتنا ہی ارشاد فرما دیتے کہ میرے صحابہؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی پیروی کرنا اور اسی پر نجات
کا مدار نہ ہوتا تو یہ بھی آپ کی سنت ہو جاتی۔ ملا علی قاریؒ حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ احتمال نقل کرتے ہیں کہ

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے :

اوصیکم باصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم الیٰ ان قال فلیلزم الجماعۃ۔

ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، پھر تابعینؒ اور پھر تبع تابعینؒ کے بارے میں۔ اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی جماعت کو لازم پکڑنے اور اس کو نہ چھوڑنے کی وصیت اور ضروری حکم فرماتے ہیں، اور مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں سنت کا ذکر ہی کہاں؟ شاید مفتی صاحب کی یہ تحقیق ہو کہ سنت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ کے حکم اور تاکیدی حکم (وصیت) کا نام نہیں ہے بلکہ لفظ سنت ہو تو تب ہی سنت کا اثبات ہوگا ورنہ نہیں۔

یہ تو مفتی احمد یار خاں صاحب کی تحقیق تھی۔ اب مولوی عبدالسمیع صاحب کی بھی سنیئے۔ وہ خیر القرون کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ان روایتوں میں کسی جگہ بدعت اور احداث کا ذکر نہیں" (بلفظہ انوار ساطعہ ص۱۱۱) یہ بھی عجیب استدلال ہے۔ ان روایات میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، لیکن ان میں اس کا ذکر تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی جماعت کا دامن پکڑنے کی وصیت فرمائی ہے، اس لئے کہ یہ حضرات صحیح معنی میں متبع سنت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کی مرضی کو حاصل کرنے والے اور ان کی مخالفت سے ڈرنے والے ہیں، اور دین پر عمل کرانے امت کے لئے ایک بہترین عملی نمونہ ہیں، اور دوسری روایات میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ایاکم ومحدثات الامور، کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔

بچو تم نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے سے، ہر نئی چیز بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے، جس نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی۔

اور ان روایات میں بدعات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خیر القرون کی حدیث سے اتباع کے متعلق وصیت کرتے ہوئے آپ نے سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمائی ہے کہ سنت ان ہی حضرات کا نام

ہے جس پر یہ بکار عامل رہے ہیں، اور بدعات کی تردید کی احادیث میں اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ خیر القرون کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا جس کا تعلق دین سے ہو تو وہ بدعت ہی ہے اور مردود ہی۔ خیر القرون کے اسلوب سے اتباع کا حکم دیا اور ایاکم ومحدثات الامور سے اجتناب کا کیا خوب کہا گیا ہے کہ

وبضدھا تتبین الاشیاء

باقی رہا یہ سوال کہ ان حدیثوں میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، تو نہ سہی۔ جو چیزیں ان احادیث میں بیان کی گئی ہیں وہ ان سے اخذ کر لو اور جو چیز دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے وہ ان سے لے لو کہ نہ پھینک سکو نہ پھیکی سے

ترے دعوٰی پہ سامنے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہوا علم الیقیں، عین الیقیں، حق الیقیں ساقی

چوتھا اعتراض:

مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ خیر القرون میں قرن اوّل آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی وفات پر اور قرن ثانی حضرت عمرؓ کی وفات پر اور قرن ثالث حضرت عثمانؓ کی وفات پر ختم ہو گیا اور حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کو ہوئی ہے۔ اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ یعنی خیر القرون کے نہایت معدود اور چیدہ ہیں، اسلام کی شوکت جبھی تک خوب رہی، پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور خیریت قرون ثلاثہ کی کم ہو گئی۔ (محصلہ انوار ساطعہ ص۱۱۳)

جواب:

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی عقائد اور اعمال میں پیروی کرنا خیر القرون کے مخالف ہے یقیناً اور قطعاً باطل ہے۔ اوّلاً تو اس لئے کہ پہلے صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی پیروی ہی اُمت کے لئے لازم قرار دی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ

وسلم نے اس کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔ یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحبؒ انکی پیروی اور اتباع کو خیرالقرون کے قول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وثانیاً حضرت شاہ صاحبؒ تو ازالۃ الخفاء میں خلافت منتظمہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے یہ ارقام فرماتے ہیں کہ کمال خیریت جن میں نبوت و رسالت کی کا خاصہ تھا کہ تھی وہ صرف حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک ہی رہی ہے اور اس کے بعد کمال خیریت باقی نہیں رہی اور خلافت منتظمہ کی جگہ خلافت غیر منتظمہ نے لے لی۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ نفس خیریت ہی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ پہلے قرن کی خیریت دوسرے میں نہ تھی اور دوسرے جیسی خیریت تیسرے قرن میں نہ تھی۔ مع ہذا کل کے کل قرون خیرالقرون تو ہیں۔ وثالثاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحب کی تحقیق یہی ہے کہ وہ خیرالقرون کو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم سمجھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے دلائل اور صحیح احادیث کے پیش نظر دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ یا ان کی اتباع کو باعث نجات تصور نہیں فرماتے یا عقیدہ و عمل میں ان کی اتباع کے علاوہ کسی اور کی اتباع کو صحیح خیال فرماتے ہیں خود حضرت شاہ صاحبؒ اپنی مایہ ناز کتاب میں ارقام فرماتے ہیں:

اقول الفرقۃ الناجیۃ ھم الاخذون فی العقیدۃ والعمل جمیعا بما ظھر من الکتاب والسنۃ وجری علیہ جمھور الصحابۃ والتابعین الی ان قال وغیر الناجیۃ کل فرقۃ انتحلت عقیدۃ خلاف عقیدۃ السلف او عملا دون اعمالھم (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۲۰ طبع مصر)

میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں میں کتاب و سنت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کاربند تھے پیروی کرے (پھر آگے ارشاد فرمایا) اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے جس نے سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی اور عقیدہ یا ان کے عمل کے خلاف کوئی اور عمل اختیار کر لیا۔

اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اس فرقہ کو ناجی تسلیم کرتے ہیں جو عقیدہ اور عمل دونوں میں سلف یعنی حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی پیروی کرتا ہو۔ اور فرماتے ہیں کہ ان کے عقیدہ اور عمل کے خلاف جو عقیدہ یا عمل کسی نے اختیار کیا وہ یقیناً غیر ناجی ہوگا

اور دوسرے مقام پر اس فرقۂ ناجیہ اور اہل حق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

فاخذوا يتبعون احاديث النبي صلى الله عليه وسلم وآثار الصحابة والتابعين والمجتهدين (حجۃ اللہ البالغہ ج[illegible] ومثلہ فی الانصاف ص[illegible])

ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کی خوب پیروی کی ہے۔

مشہور ائمہ مجتہدین میں حضرت امام ابوحنیفہؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) بھی ہیں اور دیگر ائمہ مثلاً حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ تبع تابعینؒ میں شامل ہیں۔ غرضیکہ حضرت شاہ صاحبؒ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی عقیدہ و عمل دونوں میں اتباع کو نجات کا ذریعہ اور ان کی علامت ارشاد فرماتے اور ان کی مخالفت و تردید کو باعث ہلاکت اور سبب عدم نجات فرماتے ہیں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک حضرات خلفاء راشدینؓ کے علاوہ جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کی اتباع بھی ضروری ہے اور نجات و فوز انہی کی پیروی میں منحصر ہے۔

فائدہ: سنت اور بدعت کے پیش نظر بعض اختصار پسند حضرات نے خیرالقرون کا مفہوم یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی عقیدہ اور عمل ثابت ہو۔ بعض نے شیخینؓ اور خلفاء راشدینؓ کے خلافت کو خیرالقرون کے ساتھ ملحق کیا۔ بعض نے عام صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی خلافت و زمانہ کو خیرالقرون کے مصداق کہا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ خیرالقرون کا مفہوم اسی میں آتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق انہوں نے اہم اور عمدہ کڑی کو بیان کر دیا ہے اور دوسروں کو بالتبع سمجھ کر بیان نہیں کیا۔ اور جنہوں نے خیرالقرون کی پوری تشریح بیان کی اور بدعت کی جامع و مانع تعریف درج کی ہے تو انہوں نے خیرالقرون کی تعریف حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے کی اور ان کے خلاف عقیدہ اور عمل کو بدعت کہا ہے، اور اکثر و بیشتر خود ان حضرات کی اپنی عبارات جب وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تو اس کی تشریح کر دیتی ہیں۔ وصاحب البیت ادری بما فیہ۔

اس قاعدہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب نے انوار ساطعہ میں اور مفتی احمد یار خان صاحب نے جاء الحق میں اسی طرح ان کے ہمنوا بدعت پسند حضرات نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں

اور خواہ مخواہ اپنے ذہن اور عوام کو مشوش کیا ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ ؎

ٹھوکریں مت کھائیے، چلئے سنبھل کر، دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور، دیکھ کر

اسلامی فقہ اور قیاس بھی ایک شرعی دلیل ہے

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انسانی ضروریات اور انسانی ماحول ایک حالت پر قائم رہنے والی چیز نہیں ہے اور تمدنی ترقیات کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ضروریات کا تبدیل ہوتے رہنا ضروری امر ہے۔ لہٰذا آپ نے بہت سی فروعی باتوں سے متعلق خود احکام صادر فرمانے مناسب نہیں سمجھے، اور ان باتوں کا اُن لوگوں کے فہم و فراست پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر مانتے اور کتاب و سنت کے اُصول و احکام کو خوب اچھی طرح تفصیل جانتے ہیں۔ کتاب و سنت کے قوانین کو لازمی اور قابلِ عمل جانتے اور ان کو خوب حاصل کر کے اپنے اجتہاد و تفقہ سے کام لیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں ضروری اور ہنگامی قوانین بنائیں؛ اسی کو فقہ اور قیاس کہتے ہیں۔ اور یہ اجتہاد صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ لیکن اگر صاحبِ اجتہاد نے اپنی پوری طاقت اور وسعت صرف کی اور مع ہذا اس سے غلطی ہو گئی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ ماجور ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں سے ثواب کا مستحق ہوگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا حکم الحاکم فاجتھد واصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد واخطأ فلہ اجر واحد (بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۲ و مسلم ج ۲ ص ۷۶ و مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرنے میں اجتہاد کرے پھر صحیح فیصلہ کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا، اور اگر اس سے خطا سرزد ہو تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اُن کی طاقت اور وسعت سے ہرگز زیادہ مکلف نہیں کرتا، تو اجتہاد کرتے وقت جو تکلیف اور

کا ورثہ مجتہد کو بھی ہے اللہ تعالیٰ اس پر اس کو ضرور ایک اجر عنایت فرمائے گا، اور اصابت رائے کی صورت میں ایک اجر اجتہاد کا اور ایک اصابت رائے کا اس کو حاصل ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجتہد صحیح معنی میں مجتہد ہو، ورنہ القضاۃ ثلاثۃ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ جاہل آدمی کا فیصلہ اس کو دوزخ میں لے جائے گا (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)۔ اسی صحیح روایت سے اجتہاد کا درست ہونا اور خطا کی صورت میں مجتہد کا عند اللہ ماجور ہونا صراحت سے ثابت ہوا۔ صرف بطور تائید و شاہد کے حضرت معاذ بن جبلؓ (المتوفی سنہ ۱۸ھ) کی روایت بھی سن لیجئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اس وقت آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ:

كيف تقضي اذا عرض لك قضاء قال اقضي بكتاب الله قال فان لم تجد في كتاب الله قال فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فان لم تجد في سنة رسول الله قال اجتهد برائي ولا آلو قال فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم على صدره وقال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله۔ رواه الترمذي وابوداؤد والدارمي۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)

تو کس طرح فیصلہ کرے گا جب تیرے سامنے کوئی جھگڑا پیش ہو؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں تم کو نہ ملے؟ عرض کیا تو سنت رسول اللہ کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ہو؟ تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے قاصد کو اس چیز کی توفیق عطا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ (المتوفی سنہ ۷۷۴ھ) اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باسناد جيد كما هو مقرر في موضعه۔ (تفسیر ج ۱ ص ۴)

اس روایت کی سند عمدہ اور کھری ہے جیسا کہ اپنے موقع پر ثابت ہے۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے جواب پر کہ اجتہد برائی (کہ میں قیاس اور رائے سے کام لوں گا) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا اور ان کی تحسین کی جس سے صاف طور

دین کی باتوں میں دخل دے۔ اعتراض بظاہر تو معقول اور وزنی ہے مگر حقیقت سے بالکل دور ہے۔ اسلئے کہ موجب حکم مجتہد اور قائس کا قیاس و اجتہاد نہیں ہے بلکہ موجب اصل میں وہی شرعی دلیل ہے جو قرآن کریم اور حدیث وغیرہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ مجتہد کا کام صرف اتنا ہے کہ مسکوت عنہ جزئی کو کسی دلیل شرعی سے جوڑ دیتا ہے اور بس چنانچہ مشہور فیلسوف اسلام علامہ ابن رشد ابو الولید محمد بن احمدؒ (المتوفی ۵۹۵ھ) لکھتے ہیں :

واما القياس الشرعي فهو الحاق الحكم الواجب لشيء ما بالشرع بالشيء الذي اوجب الشرع له ذلك الحكم او لعلة جامعة بينهما۔ (بداية المجتهد ج۱ ص۲)۔	کہ قیاس شرعی اس کو کہتے ہیں کہ حکم شریعت میں کسی چیز کے متعلق ثابت ہو چکا ہے اس حکم کو اس چیز کے اوپر چسپاں کیا جائے جو مسکوت عنہ ہے یا تو اسلئے کہ یہ اس کے مشابہ ہے اور یا اسلئے کہ ان دونوں میں علت جامعہ مشترک ہے۔

نواب صاحبؒ اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں۔ "واما قیاس پس در اصطلاح فقہا حمل معلوم بر معلوم است در اثبات حکم یا نفی او بامر جامع میان ہر دو از حکم یا صفت و این حجت است نزد جمہور محققین"۔ (افادۃ الشیوخ ص۱۳۱)

مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ لکھتے ہیں :

"جب انسان کو کوئی مسئلہ قرآن و حدیث سے صراحۃً نہیں ملتا تو وہ قرآن و حدیث میں اجتہاد و استنباط کرتا ہے اور وہ اجتہاد و استنباط قرآن و حدیث سے الگ نہیں کہلاتا۔ اسی طرح صحابی کے اس قول کو جو اجتہاد و استنباط کی قسم سے ہو اس کو قرآن و حدیث سے الگ نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ قرآن و حدیث میں داخل سمجھنا چاہیئے" (بلفظہ ضمیمہ رسالہ اہلحدیث ص۸)۔

نیز لکھتے ہیں —— "رہا یہ شبہ کہ (بر صورت تسلیم قول صحابی) قرآن و حدیث کے سوا تیسری شے کس طرح حجت ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تیسری شے ہے ہی نہیں، جیسا کہ ہمارا اجتہاد تیسری شے نہیں (ص۸) بلکہ جو حضرات اقوال صحابہؓ اور اجتہاد کو حجت نہیں تسلیم کرتے اور ان کی تقلید سے گریز کرتے ہیں ان کی ان الفاظ سے شکایت کرتے ہیں کہ "آج کل کے بعض اہل حدیث اصلی روش اہل حدیث سے کتنے دور ہیں۔ اللہ ان کو قریب کرے، آمین ثم آمین"۔ (ص۹)۔

مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں :

"باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ (اجتہاد) تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمہ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد کا علم بلند کرتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں" - (تفہیمات ص ۲۸۱)۔

کاش مودودی صاحب خود بھی اس بہترین اور زرین نصیحت پر عمل کرتے، اور بلا دانستہ علم کے تمام اجتہاد کا چور دروازہ نہ کھولتے، جس کی بدولت وہ خود بھی اس رسوائی سے بچتے اور لوگوں کو بھی گمراہی سے بچا سکتے۔

عباد اور زہاد کا قیاس یہ بات طے شدہ ہے کہ اجتہاد کے لئے چند نہایت ضروری شرطیں ہیں جن میں وہ شرطیں پائی جا سکیں، ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض صوفیہ کی باتیں بھی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتیں الا یہ کہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم حنفی (المتوفی فی حدود ۱۱۰۰ھ) لکھتے ہیں:

"اور جو عابد و زاہد اہل اجتہاد نہیں وہ عوام میں داخل ہیں، ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہاں اگر ان کی بات اصولی اور معتبر کتابوں کے مطابق ہو تو پھر اس وقت معتبر ہوگی (نفائس الازہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۲۴۲)

مجالس الابرار و مسالک الاخیار علامہ ملا احمد بن عبد القادر الرومیؒ (المتوفی ۱۰۴۱ھ) کی کتاب ہے مصابیح کی سو منتخب احادیث کی شرح اس میں کی گئی ہے ہر حدیث اور اس کی شرح کو مجلس کا عنوان دیا گیا ہے جو کل سو مجلسیں ہیں (کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ج ۲ ص ۱۰۰ للعلامۃ ملا کاتب چلپی المتوفی ۱۰۶۷ھ طبع نور محمد کراچی) مجالس الابرار کی حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے بھی بڑی تعریف کی ہے فرماتے ہیں کہ "کتاب شریف معتبر است" (فتاویٰ عزیزی ص ۱۰۲ ج ۲)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ:

عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست بس است کہ ما ایشاں را معذور داریم و ملامت نکنیم و امر ایشاں را بحق سبحانہ وتعالیٰ مفوض داریم

حضرات صوفیاء کی بات حل و حرمت میں سند نہیں ہے۔ یہی کافی ہے کہ ہم ان کو ملامت نہ کریں اور ان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اس جگہ حضرت امام

یعنی قول امام ابو حنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ معتبر است نہ عمل ابوبکر شبلیؒ و ابو الحسن نوریؒ (مکتوبات دفتر اول ص ۳۳۵ مکتوب ۲۶۶)

ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول معتبر ہوگا نہ کہ ابوبکر شبلیؒ اور ابو الحسن نوریؒ جیسے صوفیاء کرام کا عمل۔

قیاس بدعت نہیں ہے | پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قیاس و اجتہاد قرآن و حدیث سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں غیر منصوص کی کڑی کو منصوص سے ملا دیا جاتا ہے، اور یہ ایک شرعی حجت ہے۔ قیاس و اجتہاد سے نہ دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے، اس لئے اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو اسحاق شاطبیؒ (المتوفی ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں:

وليس من شأن العلماء اطلاق لفظ البدعة على الفروع المستنبطة التي لم تكن في ما سلف وان دقت مسائلها فكذلك لا يطلق على دقائق الاخلاق الظاهرة والباطنة انها بدعة لان الجميع يرجع الى اصول الشريعة (الاعتصام ج ۱ ص ۲۶۳)

کہ علماء کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ان فروع مستنبطہ پر بدعت کا اطلاق کریں جن کا وجود پہلے نہ تھا اگرچہ ان کے مسائل کتنے دقیق ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اخلاق ظاہرہ اور باطنہ کے دقائق پر بھی لفظ بدعت کا اطلاق صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ سب کے سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں۔

اور دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ:

واما الكلام في دقائق التصوف فليس ببدعة۔ (ج ۱ ص ۲۶۲)

تصوف کے دقائق اور اسرار میں کلام کرنا اور ان کا اثبات کرنا بھی بدعت نہیں۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ معتبر بزرگان دین نے تصفیۂ قلوب کے لئے جو اعمال و اشغال بتائے ہیں وہ بدعت نہیں ہیں کیونکہ یہ سب امور اصول شریعت سے ثابت ہیں، بخلاف بدعت کے کہ ان کا ثبوت اصول شریعت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ان میں مبتدعین کی اپنی آراء اور خواہشات کار فرما ہیں ذٰلک قولھم بافواھھم۔

صد حیرت ہے مولوی عبد السمیع صاحب پر کہ وہ لکھتے ہیں: "تعجب ہے کہ جو لوگ اعمال و اشغال مشائخ صوفیہ عمل میں لائیں اور تقلید شخصی کو واجب اور حق کو منحصر چہار امام میں جانیں اور اجماع امت کو درست جانیں اور پھر یہ بات زبان پر لائیں کہ بعد قرون ثلاثہ کے جو کچھ حادث ہوگا وہ بدعت ضلالت اور قبیح ہوگا"

وانوار ساطعہ صفحہ ۲۲۳) ۔ مگر خیرت ہے خیر القرون کا مفہوم خود ہی نہیں سمجھے۔ بحث گذر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نہ معلوم وہ کونسا محقق عالم ہے جس نے یہ کہا ہو کہ حق صرف آئمہ اربعہ میں منحصر ہے اور جو ان کی تقلید نہیں کرتا وہ قطعی اور یقیناً باطل پر ہے۔ سینکڑوں امام ان کے علاوہ بھی گذرے ہیں اور لوگ ان کی بھی تقلید کرتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہندوستان وغیرہ کے عوام کے لئے حضرت امام ابو حنیفہ کی فقہ قریب تر ہے اور ان پر ان کی تقلید واجب ہے اور مجتہدین کے علاوہ سب ائمہ اربعہ کی تقلید نہایت ضروری ہے جیسا کہ علامہ ابن خلدون (دیکھئے مقدمہ صفحہ ۴۴۸) وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ مگر تقلید کے انحصار سے حق کا انحصار ان میں کیسے اور کس طرح لازم آیا؟

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "تصوف کے اشغال صوفیاء کی ایجاد ہے اور ہر زمانہ میں نئے نئے ہوتے رہتے ہیں اور جائز ہیں، بلکہ راہ سلوک ان ہی سے جاری ہے۔ کہئے اب وہ قاعدہ کہاں گیا کہ ہر نئی چیز حرام ہے۔" (جاء الحق و زہق الباطل صفحہ ۲۲۲)۔

قاعدہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر مفتی صاحب کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس لئے کہ ابھی الاعتصام کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ تصوف کی باریکیوں اور اس کے اسرار کو بدعت نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں اور ان میں محض حضرات صوفیاء کرام کی آراء اور قیاسات ہی کا دخل نہیں تاکہ ان کی بات قابل التفات نہ ہو اور ہم ان کو محض تصوف کہیں بلکہ یہ سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ صوفی ظاہری علوم سے بہرہ ور ہو، کتاب و سنت کا عالم ہو، اخلاص اور للہیت میں ممتاز ہو اور اتباع سنت کا شیدائی ہو ہر صوفی، صوفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند

بات دور جا پڑی ۔ بات یہ عرض کی جا رہی تھی کہ قیاس بدعت نہیں ہے۔ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:

وما القياس والاجتهاد فليس من البدعة في شيء فانه مظهر لمعنى النصوص لا مثبت	بہر حال قیاس و اجتہاد تو اس کا بدعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کیونکہ قیاس نصوص کے معانی کو ظاہر کرنے والا

امر زائد۔ (مکتوبات حصہ سوم مکتوب ۵۵) ہے کسی زائد چیز کا اثبات نہیں کرتا۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

"علماء مجتہدین اظہار احکام دین فرمودہ اند، احداث ما لیس منہ، پس احکام اجتہادیہ از امور محدثہ نباشند بلکہ از اصول دین بود۔" (مکتوبات حصہ چہارم مکتوب نمبر ۲۹)۔

الحاصل ان سابقہ ابحاث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ دلائل اور براہین کی اصولی چار قسمیں ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اور یہ امر بھی ثابت ہو چکا ہے کہ قیاس بھی شرعی حجت ہے، بدعت نہیں ہے۔ جب قیاس اور اجتہاد صحیح ہے تو پھر کسی مجتہد کی تقلید کرنا کیسے بدعت ہوگی؟ اب ہمیں اپنے ہر قول و فعل کو ان دلائل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ جو ان کے موافق ہو وہ حق ہے اور اسی میں نجات و فلاح ہے۔ اور جو ان سے ٹکرا جائے یا اس کا ثبوت ان سے نہ ہو سکے تو وہ باطل اور مردود ہوگا، اور بقول علامہ اقبال (المتوفی ۱۳۵۷ھ) اسے محض

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

قیاس کے متعلق ایک نفیس اور عمدہ بحث یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دین کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہو چکی تھی۔ مگر تکمیل دین کا یہ مطلب ہے کہ قواعد و ضوابط اور کلیات دین پورے طور پر مکمل ہو چکے تھے۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات اور حوادث کو ان اصول اور کلیات کے تحت درج کرنا اور انہی جزئیات کو کلیات پر منطبق کرنے کا نام قیاس و اجتہاد ہے، لیکن بسا اوقات جزئیات کا کلیات میں داخل کرنا کسی خاص عارضہ کی وجہ سے بعض لوگوں پر مخفی رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ فروعی مسائل میں فقہاء اسلام کا اختلاف رہا ہے، اور ایسے مواقع پر جو چیز اقرب الی الحق ہو، اس کو قبول کر لینا اور اس پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہے۔ ہاں اگر قرآن اور حدیث سے کوئی نص مل جائے، یا اجماع پر اطلاع ہو جائے تو اس صورت میں قیاس سے رجوع کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہئے، اور یہی کچھ ائمہ دین نے فرمایا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید کا مطالعہ کافی ہوگا۔

جن مسائل اور امور میں حضرات فقہاء کرامؒ نے اجتہاد و قیاس کیا ہے، ان کے اصول و ضوابط اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے زمانہ میں موجود تھے مگر ان کے دواعی و اسباب و محرکات اُس وقت رونما نہ ہوئے تھے جب ان مسائل کے اسباب و محرکات مجتہدین کے زمانہ میں پیدا ہوئے تو ان کو قیاس و اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد سے ان کی کڑی نصوص شرعیہ سے جوڑ دی اور جزئیات کو کلیات میں داخل کر دیا بخلاف ان جملہ بدعات کے جن پر آج سنت کے مانند بدعت پسند حضرات عامل ہیں (حتیٰ کہ انہوں نے اپنے عمل اور اصرار سے ان کو شعار دین بنا رکھا ہے اور ان بدعات میں شریک نہ ہونے والوں کو وہابی اور نہ معلوم کیا کیا خطابات مرحمت فرماتے ہیں) کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک بدعت کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، مگر ان خودساختہ بدعات کا اس وقت ہرگز وجود اور رواج نہ تھا۔ لہٰذا ان بدعات کو قیاس و اجتہاد کی مد میں شامل کرنا سراسر بے دینی اور نری جہالت ہے مثلاً میلاد کے منانے کا سبب، (یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت) اُس وقت موجود تھا۔ چالیس سال قبل از نبوت اور تیئس سال بعد از نبوت آپ نے ولادت کے بعد اپنی قوم اور حضرات صحابہ کرامؓ میں گزارے تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ وغیرہم میں آپ کا گہرا عشق اور محبت بھی تھی لیکن کسی نے آپ کا یوم ولادت منایا جیسے آج منایا جاتا ہے اور نہ مروّجہ میلاد کا ان میں کوئی ثبوت تھا جب سبب اور محرک موجود تھا اور یہ بدعت موجود نہ تھی، تو بعد کو اس میں قیاس کرنے کی ہرگز نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب ام المساکینؓ اور آپ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور آپ کی تین صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت زینبؓ اور جلیل صحابہ کرامؓ آپ کی زندگی میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے مگر نہ تو آپ نے ان کا تیجہ کیا اور نہ ساتواں اور نہ دسواں اور نہ چالیسواں۔ نہ ان کی قبروں پر میلہ لگایا اور نہ عرس کیا، نہ چراغ جلائے اور نہ اوپر چادریں ڈالیں، نہ چڑھاوے چڑھائے اور نہ گنبد بنوائے۔ بلکہ ان میں سے بعض چیزوں کے متعلق صریح نہی بلکہ لعنت فرمائی۔ (مثلاً قبروں پر چراغ روشن کرنا وغیرہ) پھر نص کے مقابلہ میں قیاس کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کی وفات

کے بعد باوجود کمال عشق و محبت کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ کی وفات کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے کیا گیا۔ یہ سب کے سب اسباب اور دواعی موجود تھے اور کوئی مانع بھی نہ تھا جو بعد کو زائل ہو گیا ہو۔ لیکن ان خود تراشیدہ بدعات کا مطلق وجود نہ تھا وعظ و تبلیغ کی مجالس۔ ایصال ثواب کیا جاتا تھا مگر نہ تو دنوں کی تعیین ہوتی تھی اور نہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھا جاتا تھا۔ (کیونکہ کھانا سامنے رکھ کر پڑھنا عمل کے لوازمات سے بالکل خارج ہے) ختنے ہوتے تھے مگر آج کل کی بدعات اور رسوم نہ ہوتی تھیں۔ شادیاں ہوتی تھیں مگر نہ تو سہرے باندھے جاتے تھے اور روپیے وغیرہ پھینکے جاتے تھے۔ اسی طرح دیگر خرافات کا وجود اس وقت نہ تھا۔ جنازے ہوتے تھے مگر جنازہ کے ساتھ جہر سے نہ کلمہ پڑھا جاتا تھا اور نہ کلمہ حق نبوت کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ نماز جنازہ تو پڑھی جاتی تھی مگر نماز سے فارغ ہونے کے بعد پھر کر دعا نہ مانگی جاتی تھی۔ دفن کرنے کے بعد تلقین تو ہوتی تھی مگر قبر پر اذان نہیں دی جاتی تھی۔ مُردوں کو کفن تو دیئے جاتے تھے مگر نقش اور کفنی لکھنے کا دستور نہ تھا۔ ذکر بھی کیا کرتے تھے اور درود شریف بھی پڑھتے تھے مگر جس طرح آج کل کی صورت میں جہر سے ذکر کرتے اور درود شریف باواز بلند پڑھتے ہیں ان میں ہرگز رواج نہ تھا۔ الغرض آج جتنی بدعات رائج ہیں ان میں سے ایک ایک کا سبب خیر القرون میں موجود تھا مگر یہ بدعات نہ ہوتی تھیں۔ تو پھر ان میں قیاس و اجتہاد کو کیا مناسبت ہے؟ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان امور میں اگر قیاس و اجتہاد کی ضرورت و گنجائش ہوتی تو حضرات ائمہ مجتہدین ہم سے ہرگز نہ چوکتے۔ یہ بالکل سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس وقت تو قیاس و اجتہاد ان کو نہ سوجھا اور آج یہ قیاس جائز ہو گیا۔ عشق و محبت ان میں زیادہ تھی، علم و تقویٰ ان میں زیادہ تھا، خوف خدا تھا اور فکر آخرت ان میں کامل اور مکمل تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت ان امور کو دین بننا نصیب نہ ہوا اور آج یک انقلاب یہ دین اور شعار دین اور علامات اہل السنت بن گئے۔ خیر کچھ تو فرمائیے اس

یہ کاوشیں جو سبب ہیں آپ کی کدورتوں کی کچھ انتہا بھی ؟

زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے ؟

یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد تمام خود ساختہ بدعات کی کھلی حقیقت خود بخود ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ایسے امور جن کے اسباب، دواعی اور محرکات اس وقت موجود

رضی اللہ تعالیٰ عنہم هو بدعة لانه لو كان خيراً لسبقونا اليه لانهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير الا وقد بادروا اليها۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵۶)

صحابہ کرامؓ سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا بدعت ہوگا کیونکہ اگر وہ کام اچھا ہوتا تو ضرور حضرات صحابہ کرامؓ ہم سے پہلے اس کام کو کرتے اس لئے کہ انہوں نے نیکی کے کسی پہلو اور کسی نیک اور عمدہ خصلت کو تشنۂ عمل نہیں چھوڑا بلکہ وہ ہر کام میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

الحاصل مجتہد کا قیاس و اجتہاد تو حق اور صحیح ہے مگر صرف ان امور اور مسائل میں جن کے دواعی و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ایسے امور میں ہرگز ہرگز قیاس و اجتہاد روا نہیں ہے جن کے دواعی و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کے وقت موجود تھے۔ اور آج کل تقریباً جتنی بھی بدعات رائج ہیں وہ بیشتر وہی ہیں جن کے اسباب اور محرکات اُس وقت موجود تھے۔ ایسے امور میں فلاح و نجات صرف اُن حضرات کے نقش قدم پر چلنے سے ہی نصیب ہوگی اور ان کی مخالفت کرنے پر اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوگا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور صرف اسی پہلو میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کا صحیح عشق مضمر ہے اور اس کے خلاف گمراہی بھی ہے اور بدعت بھی، اُخروی تباہی بھی ہے اور بربادی بھی۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ ؎

الٰہی خیر ہو کہ فتنۂ آخر زماں آیا
بچے ایمان و دیں باقی کہ وقت امتحاں آیا

بابِ دوم

بدعت لغوی اور شرعی کی تعریف، اس کی اقسام اور اس کے احکام کے بیان میں

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت اور اہلِ بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی ایسی تردید فرمائی ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی حلیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے، اور حسن و قبح اور حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور قرآن کریم نے صراحت سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ دین کے مٹ جانے کے اصولی دو طریقے ہیں۔ یکتائی حق اور تلبیسِ حق و باطل اور اسی اختلاط اور تلبیس کی وجہ سے دینِ الٰہی لوگوں کی خواہشات اور اہواء کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا، اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ خدا تعالیٰ کا دین نہ ہوا بچوں کا کھیل ہوا (معاذ اللہ تعالیٰ) یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کسی امر کے باعث ثواب اور موجب عذاب ہونے کا فیصلہ صرف باری تعالیٰ کا کام ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچانا اور بیان کرنا نبی اور رسول کا کام ہے، اپنی مرضی اور خواہش سے کسی چیز کا باعثِ ثواب اور عذاب سمجھنے والا گویا در اصل اپنے لئے منصبِ الوہیت اور رسالت تجویز کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ اللہ تعالیٰ نے جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کامل اور مکمل نمونہ بنا کر ہمیں ہر کام میں جو کہ آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ ہو آپ کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اپنی مرضی پہ ہرگز نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ

البتہ بات یہ ہے کہ تمہارے لئے بہتر چال سیکھنی تھی رسول اللہ سے اس کے لئے جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی اور

اللّٰہَ کَثِیْرًا ○ (پ ۲۱، احزاب، رکوع ۲)۔ آخرت سے ڈرتا ہو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بہترین اور اعلیٰ نمونہ قرار دے کر امت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اور ہر ایک حرکت و سکون میں اور نشست و برخاست میں اور ہر قسم کی غمی اور خوشی کے معاملات میں آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ (پ ۳، آل عمران، رکوع ۴)	اے محمد، آپ اعلان کر دیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے تو میری اتباع اور پیروی کرو، تاکہ محبت کرے تم سے اللہ تعالیٰ اور بخش دے گناہ تمہارے۔

یہ آیت کریمہ اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ اگر آج کسی جماعت یا شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لینا چاہیے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔

آپ کے اس بہترین اسوہ اور ہدی و سیرت کی اتباع کا نام سنت، اور مخالف روش کا نام بدعت ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ (المتوفی ۷۴ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ میں جبکہ حضرات کا مجمع سامنے ہوتا تھا، پرزور اور بلند آواز سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ :

اما بعد فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد صلى الله عليه وسلم وشر الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة ۔ (مسلم ج ۱ صفحہ ۲۸۵ و مشکوٰۃ ج ۱ صفحہ ۲۷)	اما بعد! بہترین بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اور برے کام وہ ہیں جو نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی ہدی اور سیرت کا بدعت سے تقابل کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کی سیرت اور نمونہ کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بدعت بری چیز ہے کہ دنیاوی ایجادات بھی مذموم

ہو جائیں، بلکہ وہ بدعت بُری ہے جو کتاب اللہ اور ہدیِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔ لہٰذا جو چیز کتاب و سنت کی روشنی کے خلاف نہ ہو گی وہ بدعت ہو گی ہی نہ۔ اور اگر ایسی ہے تو اللہ تعالیٰ کبھی راضی نہیں ہوتا، چونکہ برائی کو مٹانے کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا اور ان پر کتابیں بھیجے اور وحی نازل کی۔ امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وکل ضلالۃ فی النار (نسائی ج ۱ ص ۱۷۹) اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے سے منع کیا ہے، اور ان کی تمام عبادات کو بے کار فرمایا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت سے باز نہ آ جائیں۔ اور نیز فرمایا کہ اہل بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوتی۔ اعاذنا اللہ منہا ومن سائر انواع المعاصی۔

چنانچہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ حرام ما بین عیر الی ثور فمن احدث فیہا حدثا او آوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۳۸ و بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۴ و مسلم ج ۱ ص ۴۴۲)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام عیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے۔ جو شخص اس میں کوئی بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، اور اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی نہ نفلی۔

اس حدیث میں مدینہ طیبہ حرم کی قید محض تنبیہ اور تشنیع کے لئے ہے۔ یہ قید احترازی نہیں ہے کہ حرم مدینہ میں تو بدعت بُری ہو اور خارج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہو گی۔ ہاں البتہ شرفِ مکان یا فضیلتِ زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بڑھ جائے گی۔ بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمت کے لئے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں جو جناب رؤف رحیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ پاک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لئے یہ روایتیں بالکل کافی ہیں۔ صرف بطور مشتے از خروارے کے چند روایتیں اور بھی ملاحظہ کر لیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعۃ حتی یدع بدعتہ۔ (ابن ماجہ ص۶)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

من احدث فیہا حدثا او اٰوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل۔ (بخاری ج۲ ص [illegible])

کہ جس کسی نے مدینہ طیبہ میں بدعت کو اختراع کیا یا کسی بدعتی کو ٹھکانا دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں اور انسانوں کی لعنت ہو، نہ تو اس کی نفلی عبادت قبول ہوگی اور نہ فرضی۔ بدعت جہاں بھی ہو بدعت ہی ہے، یہاں مدینہ طیبہ میں اس کے گناہ کا وزن زیادہ ہوگا کیونکہ یہ مہبط وحی و مرکز ہدایت ہے۔

حضرت ابراہیم بن میسرۃ التابعیؒ (المتوفی ۱۳۲ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ہدم الاسلام۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلا۔ مشکوٰۃ ج۱ ص۳۱)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم و توقیر کی تو اس نے اسلام کو گرانے پر اس کی مدد اور اعانت کی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرات صحابہ کرامؓ کو بدعت اور اہل بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (المتوفی ۷۳ھ) کے پاس ایک شخص نے کسی کا سلام لایا تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

بلغنی انہ قد احدث فان کان قد احدث فلا تقرئہ منی السلام۔ (ترمذی ج۲ ص۳۵، وابن ماجہ ص۳۰۰، وابو داؤد ج۲ ص۲۸۲، مشکوٰۃ ج۱ ص۲۲)

کہ مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت پہنچی ہے کہ اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے، اگر واقعی اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

الاقتصاد فی السنۃ احسن من الاجتہاد

سنت میں میانہ روی اختیار کرنا بدعت میں کوشش

مردود ہے نیز لکھتے ہیں کہ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں فی امرنا ہذا کی جگہ صریح طور پر دین کا لفظ آیا ہے :

وفی بعض الفاظہ من احدث فی دیننا ما لیس منہ فھو رد۔ (مسکہ)

اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں فی دیننا کا لفظ آیا ہے یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کرے تو وہ مردود ہوگا

جب جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسی روایت کے اندر صریح الفاظ میں فی امرنا ھذا کی جگہ فی دیننا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تو پھر بیت جملہ کیسے تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فی امرنا ھذا کی شرح میں لکھتے ہیں کہ :

"والمراد امر الدین" (فتح الباری ج ۵ ص ۲۲۱)۔ فی امرنا ھذا سے دین کا امر مراد ہے یعنی جس نے دین کے اندر کوئی نئی چیز نکالی تو وہ مردود ہوگی علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں ان المراد بہ الحدث ھو ان یحصل فی الدین ما لیس منہ ...... الخ (شرح المقاصد ص ۲۷۱ ج ۲)

علامہ عزیزیؒ (المتوفی سنہ ۱۰۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ "من احدث فی امرنا ھذا ای فی دین الاسلام" (السراج المنیر ج ۳ ص ۳۳۱) یعنی فی امرنا ھذا سے "دین اسلام" مراد ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح تر ہو گئی ہے کہ ہر بدعت اور ہر احداث برا اور مردود نہیں ہے، بلکہ وہ بدعت اور وہ احداث برا اور مردود ہے جو دین اسلام کے اندر دین سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے اور یہ صرف شراح حدیث نے ہی نہیں کہا، بلکہ بقول ابن رجبؒ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں دین کی قید الی دیننا خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لگائی ہے۔ یہ حدیث اس بات کے لئے نص صریح ہے کہ جتنی بدعتیں مگر لوگوں نے دین کے امور میں نکالی ہیں وہ سب کی سب مردود ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا خرم علی صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۷۳ھ) مترجم مشارق الانوار لکھتے ہیں :

" جتنی بدعتیں لوگوں نے خلاف شرع نکالی ہیں۔ اس حدیث سے سب رد ہو گئیں تفصیل کی کچھ حاجت نہیں مثلاً قبر پر گچ کرنا۔ گنبد بنانا۔ قبروں پر روشنی کرنا۔ تعزیہ بنانا۔ بزرگوں کا میلہ کرنا۔ اولیاء کی منت ماننا۔ جھنڈے نشان کھڑے کرنا سراسر دین کے خلاف ہیں۔ قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس شرعی میں ان کی کچھ اصل نہیں "۔ (ترجمہ مشارق الانوار ص ۱۰)۔

اکابرین علماء دیوبند | اس حدیث سے اکابرین علماء دیوبند بھی یہی سمجھے ہیں کہ فی امرنا ھذا سے امر دین مراد ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ فی امرنا ھذا سے امر دین مراد ہے۔ (بذل المجہود ج ۵ ص ۱۱۰)۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (المتوفی ۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں: والمراد بامرنا الدین کما صرح بہ۔ (فتح الملہم ج ۲ ص ۳۰۷)، کہ مراد اس سے امر دین ہے: علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔

بریلوی مکتب فکر کے علماء | اس حدیث کی تفسیر بریلوی حضرات نے بھی امر دین سے کی ہے چنانچہ مولوی محمد صالح صاحب (مشہور بریلوی عالم) لکھتے ہیں کہ مراد امر سے امر دین کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امور دینیہ عبادات ہوں یا معاملات کہ جن کے حدود شارع نے مقرر کئے ہیں ان میں کمی بیشی کرنا مردود ہے۔ (تحفۃ الاحباب فی تحقیق ایصال الثواب ص ۱۱)۔

مولوی عبدالسمیع صاحب رامپوری لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیحین کی ہے، یعنی جس نے نکالی اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنت کے خلاف ہے، وہ بات اس کی رد ہے۔ (انوار ساطعہ ص ۱۲۲)

فریق مخالف کے مجدد ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ) تمباکو کو حلال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: رہا اس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعث ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ کہ امور دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے۔ (احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۶۱)۔ آپ نے فریق مخالف کے محقق اور مسلم علماء سے بھی یہ سن لیا کہ بدعت دینی مذموم ہے، جو امور دین سے سمجھ کر کی جائے جس کا تعلق امور دین سے نہیں اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار امر ہے۔

بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے | قارئین کرام نے یہ ملاحظہ کر لیا کہ جو چیز قرآن کریم، حدیث، اجماع اور شرعی قیاس سے ثابت نہ ہو اور وہ کام جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت، اسوۂ حسنہ اور نمونہ کے خلاف ہو اور وہ کام جب دین سمجھ کر ایجاد کیا گیا تو یقیناً بدعت ہوگا۔

اب آپ بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے سن لیجئے کہ وہ کیا کرتے ہیں:

بدعت: ۱: دین میں کوئی نئی بات یا نئی رسم نکالنا، نیا دستور یا رسم و رواج۔ ۲: سختی، ظلم۔
۳: جھگڑا، فساد، شرارت۔ (فیروز اللغات ص۱۲۱)

اور مصباح اللغات میں ہے:

البدعة: بغیر نمونہ کے بنائی ہوئی چیز۔ دین میں نئی رسم۔ وہ عقیدہ یا عمل جس کی کوئی اصل قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملے۔ (مصباح اللغات ص۳۲)

امام نوویؒ بدعت کا لغوی معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ:

"کل شیء عمل علی غیر مثال سبق"۔ (نووی شرح مسلم ج۱ ص۲۸۵) یعنی ہر وہ چیز جو کسی سابق نمونہ کے بغیر کی جائے۔

بدعت کا شرعی معنی: حافظ بدر الدین عینی الحنفیؒ (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

والبدعة فی الاصل احداث امر لم یکن فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عمدۃ القاری ج۵ ص۳۵۶)

بدعت اصل میں ایسی نوپید چیز کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ:

والبدعة اصلها ما احدث علی غیر مثال سابق وتطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتکون مذمومة۔ (فتح الباری ج۴ ص۲۱۹)۔

بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو۔ اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے لہٰذا وہ مذموم ہی ہوگی۔

علامہ مرتضیٰ الزبیدی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۰۵ھ) لکھتے ہیں:

وکل محدثة بدعة انما یرید ما خالف اصول الشریعة ولم یوافق السنة۔ (تاج العروس ج۵ ص۲۷۱)۔

کل محدثۃ بدعۃ کی حدیث میں بدعت کا معنی یہ ہے کہ جو چیز اصول شریعت کے خلاف ہو اور سنت کے موافق نہ ہو۔

حافظ ابن رجبؒ لکھتے ہیں کہ:

والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشریعة یدل علیه واما ما کان له اصل

بدعت سے مراد وہ چیز ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو جو اس پر دلالت کرے، اور بہر حال وہ چیز جس کی

من الشرع يدل عليه فليس ببدعة شرعا وان كان بدعة لغة (جامع العلوم والحکم ص۱۹۳)۔

شریعت میں کوئی ایسی اصل ہو جو اس پر دال ہے، تو وہ شرعاً بدعت نہیں ہے۔ اگرچہ لغۃً بدعت ہوگی۔

اور بعینہٖ انہی الفاظ سے بدعت کی تعریف علامہ حسین بن صفیؒ (المتوفی ۱۰۸۹ھ) نے شرح اربعین نوویؒ میں کی ہے (الجنۃ ص۱۳۴)۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ:

"بدیع السموات کا یہ معنی ہے کہ: حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور لغت میں ہر نئی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے اور بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) بدعت شرعی جس کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔ کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور (۲) کبھی بدعت لغوی ہوتی ہے، جیسے حضرت عمرؓ نے لوگوں کے مل کر تراویح پڑھنے کے متعلق فرمایا: نعمت البدعة هذه۔ "یہ کیا ہی اچھی نو ایجاد ہے"۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

وكذلك كل محدث قولاً او فعلاً لم يتقدم فيه متقدم فان العرب تسميه مبتدعا۔ (تفسیر ج۱ ص۱۶۱)۔

اور اسی طرح ہر وہ قول یا فعل جس کو پہلے کسی نے نہ کیا ہو، اہل عرب ایسے کام کو بدعت کہتے ہیں۔

علامہ ابو اسحاق غرناطیؒ بدعت شرعی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

طريقة في الدين مخترعة تضاهي الشرعية يقصد بالسلوك عليها المبالغة في التعبد لله سبحانه۔ (الاعتصام ج۱ ص۳۷)۔

وہ دین کے اندر ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ ہے جو شریعت کے مشابہ ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ قصد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبد السمیع صاحب، حضرات فقہاء کرامؒ سے بدعت کا معنی یوں نقل کرتے ہیں کہ علامہ شمنیؒ وغیرہ محققین نے بدعت سیئہ مذمومہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

ما احدث على خلاف الحق المتلقى عن

کہ بدعت وہ چیز ہے جو اس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبہۃ واستحسان وجعل دینا قویما وصراطا مستقیما (تواد صاعم [illegible])

جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت کیا گیا ہو یا علم یا عمل یا حال اور کسی شبہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دین قویم اور صراط مستقیم بنا لیا گیا ہو۔

بدعت شرعیہ اور بدعت سیئہ کی بعینہٖ اسی عبارت سے بحر الرائق اور درمختار وغیرہ فقہ حنفی کی مستند اور معتبر کتابوں میں تعریف کی گئی ہے۔ (دیکھئے الجنۃ صفحہ [illegible])۔

مولانا سخاوت علی صاحب الحنفی جونپوریؒ (المتوفی ۱۲۷۴ھ) لکھتے ہیں:

"بدعت وہ کام خواہ عقیدہ کہ دین کا ہو اور آخرت کا نفع اور ضرر اس میں سمجھتے ہوں ثابت نہ ہوا ہو رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور آپ کے صحابہؓ سے۔ (رسالہ تقویٰ صفحہ [illegible])۔

اور نواب قطب الدین خان صاحب دہلوی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۸۹ھ) مؤلف مظاہر حق لکھتے ہیں: بدعات کا نام احداث دین میں تو ہے تعزیہ اور مہندی اور چھڑی اور مدار اور سالار کی [illegible] (رسالہ گلزار جنت صفحہ [illegible])

فریق مخالف کے مشہور محقق عالم مولوی محمد صالح صاحب لکھتے ہیں کہ: "اصطلاح شریعت میں بدعت اس چیز کو کہتے ہیں جو امور دینیہ سے سمجھی جائے مگر کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہ ملتا ہو نہ کتاب سے نہ احادیث نبویہ سے نہ اجماع مجتہدین سے نہ قیاس شرعی سے۔" (تحفۃ الاحباب صفحہ [illegible])

اکابرین علماء دیوبند | اکابرین علماء دیوبند ہر مسئلہ میں اتباع سنت کے ساتھ سلف صالحینؒ کی تحقیق پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ دیگر مسائل کی طرح وہ بدعت کی تعریف میں بھی سلف کی پیروی کرتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ (المتوفی [illegible]ھ) لکھتے ہیں: "اصطلاح شریعت میں بدعت ہر وہ فعل دینی ہے جس کو قرون ثلاثہ کے اہل حق کی اکثریت نے قبول نہ کیا ہو یا ان پاک زمانوں میں اس کو خلاف دین کہا گیا ہو یا خود ان زمانوں کے بعد پیدا ہو جس میں عقیدۃً غیر ضروری کو ضروری سمجھا جائے یا ضروری کو غیر ضروری۔" (حقیقۃ الایمان صفحہ [illegible])۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "بدعت کہتے ہیں ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنت اور قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔" (فضائل شریعت صفحہ [illegible])۔

اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۷۲ھ) لکھتے ہیں کہ "بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اصل شریعت سے ثابت نہ ہو یعنی قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں اس کا ثبوت نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانہ میں اس کا وجود نہ ہو، اور اسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے۔" (تعلیم الاسلام حصہ چہارم ص[illegible])

قارئین کرام! ان ٹھوس حوالجات کو پڑھ پڑھ کر اور سُن سُن کر آپ یقیناً اکتا چکے ہوں گے مگر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہمیں ایسے حضرات سے سابقہ پڑ چکا ہے جو دین سے یقیناً بے بہرہ ہیں مگر لوگوں کے ایمان اور دین کو شبہات کی دولت لوٹنے میں بڑے چُست اور ہوشیار ہیں۔ اور عوام بیچارے ان کے جبّوں اور قبہ نما دستاروں میں الجھ کر متاعِ ایمان گنوا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گندم نما جَو فروشوں سے محفوظ رکھے۔ ان عبارات میں آپ نے بخوبی ملاحظہ کر لیا کہ کیا دیوبندی حضرات اور کیا بریلوی اور کیا وہ اکابر علماء اُمت جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہیں۔ بدعت کی تعریف میں دین کی قید لگاتے ہیں اور عقائد اور عمل اور اعمال — عبادات و معاملات سب کو اس میں درج کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ جو عقیدہ، عمل یا حال کتاب و سنت اجماع و قیاس شرعی کے تحت درج نہ ہو وہ بدعت ہے۔ دین کی اور عقیدہ کے علاوہ عمل کی خاص طور پر قید لگاتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کی عبارت میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی (کل قول و فعل لم یثبت عن الصحابةؓ هو بدعة) گزر چکا ہے۔ اس سب بحث کو پیشِ نظر رکھ کر آپ مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کی تحقیق انیق بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کل محدثة بدعة (مشکوٰۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے۔ اس میں دینی یا دنیاوی کی قید نہیں۔ نیز ہم اشعۃ اللمعات اور مرقات کی عبارتیں نقل کر چکے ہیں۔ اس میں دینی کام کی قید نہیں لگائی۔" (جاء الحق و زہق الباطل ص[illegible])۔

نیز لکھتے ہیں کہ "ان دونوں عبارتوں (مرقات و اشعۃ اللمعات کی عبارت) میں نہ تو دینی کام کی قید ہے اور نہ زمانہ صحابہؓ کا لحاظ ہے، جو کام بھی ہو دینی ہو یا دنیاوی حضور علیہ السلام کے بعد جب بھی ہو خواہ

زمانۂ صحابہؓ میں یا اس کے بعد وہ بدعت ہے؟ (جاء الحق ص۲۲۱) -

مفتی صاحب کا یہ ارشاد سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ سابق عبارات میں اس کی پوری تحقیق عرض کی جا چکی ہے کہ شرعی بدعت میں جو مذموم اور قبیح ہے، دین کی قید ملحوظ ہے بلکہ ایک روایت میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں۔ وثانیاً اگر بالفرض مرقات اور اشعۃ اللمعات کی عبارتوں میں دین کی قید اور صحابہ کرامؓ کا ذکر نہیں تو کیا کسی اور کی عبارت میں بھی اس کا ذکر نہ ہوگا؟ لیجئے ہم مفتی صاحب کو مرقات اور اشعۃ اللمعات سے دین کی قید بتاتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بدعتی کو سلام کا جواب نہ دینے کی روایت باحوالہ پہلے عرض کی جا چکی ہے۔ اس روایت میں بلغنی قد احدث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ملا علی ن القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

قد احدث ای ابتدع فی الدین ما لیس منہ۔ (مرقات شرح المشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۱۲) — یعنی اس نے دین میں ایسی چیز نکالی ہے جو دین سے نہیں ہے۔

اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ "رسیدہ است مرا کہ وے احداث نمودہ و پیدا کردہ است در دین چیزے را کہ نبودہ است۔" (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۱۲)

لیجئے مفتی صاحب کی منہ مانگی مراد پوری ہو گئی اور مرقات و اشعۃ اللمعات کی عبارتوں میں دین کی قید نکل آئی۔ اب مفتی صاحب ان سے پوچھیں کہ انہوں نے محض اپنی طرف سے دین کی قید کیوں لگائی ہے اور احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثینؒ کی خلاف ورزی کیوں کی ہے؟ اسی طرح علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین اور ما انا علیہ واصحابی کی شرح میں ان دونوں بزرگوں کی عبارتیں ملاحظہ کریں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل سنت ہے یا بدعت؟ طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اور اشعۃ اللمعات کی یہ عبارت پہلے نقل کر دی گئی ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اجتہاد و قیاس سے جو احکام صادر کئے ہیں وہ بھی سنت ہیں "و اطلاق بدعت برآں نتواں کرد چناں کہ فرق ضالہ کنند۔" مفتی احمد یار خان صاحب تو صحابہؓ کے عمل کو بھی الزامی طور پر بدعت کہہ کر بدعت کا چور دروازہ کھولتے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات خلفاء راشدینؓ کے عمل کو سنت فرمائیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کو معیارِ حق

قرار دیں اور خیر القرون کے نقش قدم پر چلنے کی وصیت فرمائیں، اور مفتی احمد یار خان صاحب یہ کہیں کہ خواہ زمانہ صحابہؓ میں یا اس کے بعد وہ بدعت ہے۔ و ثالثاً مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے، احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ یہ ان کا خالص بہتان اور افتراء اور سفید جھوٹ ہے۔ دینی کام کی قید تو احادیث صحیحہ کے خلاف ہے اور نہ اقوال فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ کسی ایک معتبر امام، فقیہ اور محدث عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو یہ کہتا ہو کہ بدعت مذمومہ اور شرعی بدعت کی تعریف میں دین کی قید ملحوظ نہیں۔ فھل من مبارز؟

مستعملین ای دین تداینتم
وای غریم فی التقاضی غریمہا

حضرت امام مالکؒ کا حوالہ الاعتصام سے نقل کیا جا چکا ہے کہ من ابتدع فی الاسلام کی قید لگاتے ہیں اور باقی علماء اور فقہاء و محدثین کی عبارتیں (بلکہ فریق مخالف کے محقق اور مسلّم علماء کی عبارتیں بھی) مختصر نقل کی جا چکی ہیں اور ائمہ لغت سے بھی یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ وہ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے دین کی قید سے بے اعتنائی اور بے پروائی نہیں کرتے اور کل محدثة بدعة کے متعلق بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اس کو بیان کر کے یہ حقیقت فرمائی ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے اور حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ سندھیؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے لغوی نہیں۔ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ اور عرض کریں مگر مفتی صاحب کی خوئے فریب اور مغالطہ آفرینی کے پیش نظر چند حوالجات اور سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔

حبر الامت ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ (المتوفی ۶۸ھ) آیت فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

۱؎ شیخ عبد الحق صاحبؒ حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت خط لنا الخ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ صراط مستقیم عبارت از وہ ہے جس پر سلف صالحین از صحابہؓ و تابعین باحسان تھے [illegible] و دیگر طریقہا بدعہا و اہواء [illegible]

و اقوال مبتدعہ و اہل عادت شد (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص [illegible])

دخل فی هذه الاٰیة کل محدث فی الدین و کل مبتدع الی یوم القیامة۔
(خازن ج ۲ ص ۵۰۱ و معالم بہامش خازن ج ۲ ص ۵۰۱)

اس آیت میں ہر وہ بدعت جو دین میں نکالی جائے اور تمام بدعتی جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے داخل ہیں۔

مفتی صاحب ہمت کر کے مفسر قرآن اور بلند پایہ صحابی سے دریافت کریں کہ آپ نے فی الدین کی قید محض اپنی طرف سے کیوں لگائی ہے۔ بدعت تو ہر نئی چیز کا نام ہے، دینی ہو یا دنیاوی؟

حضرت حسان بن عطیہؒ (المتوفی بعد ۱۲۰ھ) فرماتے ہیں:

ما ابتدع قوم بدعة فی دینهم الا نزع الله من سنتهم مثلها ثم لا یعیدها الیهم الی یوم القیامة (دارمی ص ۲۶ و مشکوٰة ج ۱ ص ۳۱)

کوئی قوم دین میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ اتنی ہی مقدار میں سنت اُن سے اُٹھا لے گا۔ اور پھر قیامت تک ان کو وہ سنت واپس نہ دے گا۔

حضرت حسانؒ بھی بدعت کے ساتھ فی دینهم کی قید لگاتے ہیں اور سنت اور بدعت کا تقابل کر کے یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ اگر سنت دینی کام ہے تو بدعت بھی دینی ہی کام کا نام ہے بلکہ حضرت غضیفؓ بن الحارث الثمالیؒ (المتوفی ۸۰ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة[1] خیر من احداث بدعة۔
(مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۵ و مشکوٰة ج ۱ ص ۳۱)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنت اُن سے اُٹھالی جائے گی۔ سو سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی بدعت کا تقابل سنت سے کیا ہے۔ اگر سنت دینی کام ہے، تو بدعت بھی دینی کام ہوگا۔ اگر بدعت دنیاوی کام ہو جیسا کہ مفتی صاحب کو دھوکا ہوا ہے تو اتحادِ محل نہ رہا۔ پھر بدعت کے نئے احداث سے سنت کیسے رفع ہوگی؟

---

[1] شیخ عبدالحق دہلویؒ لکھتے ہیں کہ سنت یعنی سیرت وطریقہ مسلوکہ در دین (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۴۲) یعنی سنت کے معنی سیرت کے اور دین میں اس راستہ کے ہیں جو چلا جائے

علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفی ۷۹۱ھ) تحریر فرماتے ہیں:

ان البدعة المذمومة هو المحدث في الدين من غير ان يكون في عهد الصحابة والتابعين ولا دل عليه الدليل الشرعي (شرح المقاصد ج۲ ص۲۷۱)

مذموم بدعت وہ ہے جو دین کے اندر ایجاد کی جائے۔ اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے عہد میں نہ ہو اور نہ اس پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو۔

علامہ عبد العزیز فرہارویؒ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هو كل ما حدث في الدين بعد زمن الصحابة بلا حجة شرعية (نبراس ص۱۱)

بدعت ہر وہ چیز ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ کے بعد بلا حجت شرعیہ دین میں نکالی جائے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ بقول مفتی احمد یار خان صاحب ہر نیا کام نہیں جو دینی ہو یا دنیاوی، بلکہ وہ بدعت مذموم ہے جو محدث فی الدین ہو، اور یہی بدعت حرام ہے۔ اور جو بدعت امور دین میں نہ ہو اس کی حرمت ثابت کرنا بقول خان صاحب بریلوی ایک شور رہا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"از حق تعالیٰ تضرع است کہ ہر چہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمان خیر البشر و خلفاء راشدین او نبودہ اگرچہ آں چیز در روشنی مثل فلق صبح بود ایں ضعیف را با جمعیکہ با وے ہستند گرفتار عمل آں محدث نگرداند و مفتون حسن آں مبتدع نکند بحرمۃ سید المرسلین" (مکتوبات حصہ سوم ص۲۷ مکتوب ۱۸۶)

اسی مکتوب میں حضرت مجدد صاحبؒ نے حضرات خلفاء راشدینؓ کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے لے کر فریق مخالف کے مسلم عالم مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی تک سب بدعت کے ساتھ دین کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! کیا بعید ہے کہ وہ یہ کہہ دیں ؎

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح ۔۔ نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

الغرض مذموم بدعت صرف وہ ہے جو کار ثواب اور دین سمجھ کر کی جائے اور اسی کی مذمت

پھر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور سلف صالحین کا اجماع ہے چنانچہ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

اجماع السلف الصالح من الصحابة والتابعين ومن يليهم على ذمها كذلك (الاعتصام ج ۱ ص ۱۸۱)

حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ وغیرہم سلف صالحین کا اسی بدعت کی مذمت پر اجماع و اتفاق رہا ہے۔

اور اس میں دینی کام کی قید موجود ہے۔ دنیوی امور اس بدعت میں ہرگز داخل نہیں ہیں بلکہ تعین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکروہ تک بھی نہیں چہ جائیکہ وہ حرام اور بدعت مذمومہ میں داخل ہوں۔ ہمارے کہنے پر یقین نہ آئے تو آپ شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ (المتوفی ۷۰۲ھ) کی سن لیجئے :

انا اذا نظرنا الى البدع المتعلقة بامور الدنيا لم تساو البدع المتعلقة بامور الاحكام الفرعية ولعل البدع المتعلقة بامور الدنيا لا تكره اصلا بل كثير منها يجزم فيه بعدم الكراهة واذا نظرنا الى البدع المتعلقة بالاحكام الفرعية لم تكن مساوية للبدع المتعلقة باصول العقائد۔ (احكام الاحكام ج ۲ ص ۵)

ہم نے جب ان بدعتوں کو دیکھا جو امور دنیا سے متعلق ہیں تو وہ ان بدعتوں کے مساوی نظر نہ آئیں جو کہ بات فرعی احکام سے متعلق ہیں اور شاید کہ وہ بدعتیں جو امور دنیا سے متعلق ہیں بالکل مکروہ بھی نہ ہوں بلکہ ان کی بہت سی دنیوی بدعات کے متعلق یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکروہ بھی نہیں ہیں اور جب ہم نے ان بدعات کو دیکھا جو فرعی احکام سے متعلق ہیں تو وہ ان بدعات کے مساوی نہیں جو بدعات اصول عقائد سے متعلق ہیں۔

اس عبارت کو غور سے پڑھئے جس میں صراحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بدعت عقائد میں بھی ہوتی ہے اور اعمال میں بھی۔ دینی امور میں بھی اور دنیوی میں بھی۔ مگر دنیوی امور کی بدعت نہ تو حرام ہے اور نہ مذموم، بلکہ مکروہ تک بھی نہیں۔ جو لوگ امور دنیاوی کو بدعت کی حد میں شامل کرتے ہیں، وہ نرے جاہل ہیں۔ ہم نہیں کہتے۔ مؤلف انوار ساطعہ شرح جواہر توحید سے نقل کرتے ہیں :

ومن الجهلة من يجعل كل امر لم يكن في زمن الصحابة بدعة مذمومة وان لم يقم دليل على قبحه تمسكا بقوله صلى الله عليه

وہ لوگ جاہل ہیں جو ہر اس چیز کو جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھی، بدعت مذمومہ قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی قباحت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکی ہو اور وہ [illegible]

وسلم ایاکم ومحدثات الامور ولا یعلمون المراد بذلک ان یحدث فی الدین ما لیس منه ۔ (انوار ساطعہ ص۲۳۳)

دلیل پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نئی چیزوں سے بچو۔ اور وہ جانتے نہیں کہ محدثات الامور سے مراد یہ ہے کہ دین میں ایسی چیز ایجاد کی جائے جو اس میں نہ ہو۔

ان تمام اقتباسات کو دیکھئے اور پھر مفتی احمد یار خان صاحب کی غلط تحقیق ملاحظہ کیجئے، وہ لکھتے ہیں:

"آج کل دنیا میں وہ وہ چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کا خیر القرون میں نام و نشان بھی نہ تھا اور جن کے بغیر اب دنیاوی زندگی مشکل ہے۔ ہر شخص ان کے استعمال پر مجبور ہے۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، تانگہ، گھوڑا گاڑی۔ پھر خط لفافہ، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، لاؤڈ سپیکر وغیرہ یہ تمام چیزیں اور ان کا استعمال بدعت ہے اور انہیں ہر جماعت کے لوگ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ بولو دیوبندی وہابی بغیر بدعت حسنہ کے دنیاوی زندگی گذار سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!" (انتہی بلفظہ جاء الحق وزہق الباطل ص۲۱۱)

اس کی تحقیق تو اپنے مقام پر آئے گی کہ بدعت حسنہ کیا ہے اور بدعت سیئہ کیا ہے؟ مگر سابق عبارات کو ملاحظہ کرکے مفتی صاحب کو مناسب ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنا محاسبہ کریں کہ غلطی ان کی ہے جو ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں یا دیوبندیوں اور وہابیوں کی ہے؟ ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

قارئین کرام! غور تو کیجئے کہ خود مفتی احمد یار خان صاحب حدیث من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد کا کیا معنی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "جو شخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے ایجاد کرے جو کہ دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے۔ ہم نے ما کے معنی عقیدے اس لئے کئے کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔" (بلفظہ جاء الحق ص۲۰۶ و ص۲۰۷)

مفتی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ نے محض اپنی طرف سے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف کرتے ہوئے کیوں دین کی قید لگائی ہے؟ حضور صاحب کے بقول آپ کے اشعۃ اللمعات اور مرقات کی عبارتوں میں تو دین کی قید نہیں لگائی گئی۔ فرمائیے کیا واقعہ پیش آیا ہے کہ

پھر یہ بھی خوب کہی کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔ بلاشک نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ احکام عقائد کے لحاظ سے فروع ہیں مگر اپنے مقام پر وہ ارکانِ اسلام اور اصولِ دین بھی ہیں، اور قرآن کریم اور احادیث میں نماز اور جہاد وغیرہ احکام پر صراحت کے ساتھ لفظ دین کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بیسیوں مثالیں اس پر پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہمارا مقصد ابھی بہت وسیع ہے لہٰذا اشارہ ہی کافی ہے۔ الغرض عقائد ہوں یا اعمال، بدعت سب میں ہوتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی محض اپنی طرف سے اختراع | مفتی صاحب نے قا کے معنی کو صرف عقائد پر بند رکھا ہے اور اسی کی بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا"۔ (جاء الحق ص۲۰۲) وہ آگے لکھتے ہیں: "بدعت اور بدعتی پر جو سخت وعیدیں احادیث میں آئی ہیں ان سے مراد بدعت اعتقادیہ ہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ڈھانے پر مدد کی یعنی بدعت اعتقادیہ والے کی۔ فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب البدعات ص۹۰ میں ہے جس بدعت میں ایسی شدید وعید ہے وہ بدعت فی العقائد ہے جیسا کہ روافض خوارج کی بدعت"۔ (بلفظہٖ۔ جاء الحق وزھق الباطل ص۲۰۳)۔

بلاشک وعید شدید ایسی ہی بدعت پر وارد ہوئی ہے جو عقائد کی بدعت ہے مگر مفتی صاحب یہ بتائیں کہ کیا علم غیب، حاضر و ناظر اور مختار کل اور بشریت وغیرہ کے مسائل عقائد میں یہ محض دل لگی کا سامان ہے؟ اور کیا ایسی شدید وعید ایسی بدعت اعتقادیہ پر آتی ہے یا نہیں؟ خیر القرون میں تو یہ عقائد کسی کے نہ تھے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اگر وعید شدید کا اطلاق بدعت اعتقادیہ پر ہوا ہے تو احکام اور فروع اور غیر اعتقادی امور پر نفس بدعت کا اطلاق ہی نہ ہوا اور ان پر نفس وعید بھی نہ ہو بعض حوالے پیش کئے گئے ہیں کہ بدعت اعتقاد اور عمل دونوں میں ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ کی عبارت میں قول و فعل کے الفاظ اور صاحب قاموس کی عبارت میں امور اور اعمال کی قید اور علامہ شمنیؒ وغیرہ محققین کی عبارت میں علم و عمل اور مسائل کی قید اور ابن دقیق العیدؒ کی عبارت میں احکام فرعیہ اور اصول اعتقادیہ کی قید خاص طور پر مذکور ہے۔ حافظ ابن رجبؒ لکھتے ہیں کہ:

فکل من احدث شیئاً ونسبه إلى الدين ولم يكن له أصل من الدين يرجع إليه فهو ضلالة والدين بريء منه وسواء في ذلك الاعتقادات أو الأعمال أو الأقوال الظاهرة والباطنة وإما ما وقع في كلام بعض السلف من استحسان بعض البدع فإنما ذلك في البدع اللغوية لا الشرعية ـ

جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف منسوب کیا جب کہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے جس کی طرف وہ راجع ہو تو وہ گمراہی ہے اور دین اس سے بری ہے برابر ہے کہ وہ ایجاد کردہ چیز اعتقادات ہوں یا اعمال یا اقوال ظاہر ہوں اور باطن رہ سلف کے کلام میں بعض بدعات کے حسن کا ثبوت تو ملتا ہے مگر وہ حسن لغوی بدعات میں ہے نہ کہ شرعی بدعات میں

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

"و لازم است اتباع سنت سنیہ اور در عبادات و عادات و اعتقاد باید کرد کہ ہرچہ خلاف سنت و طریقہ او است باطل است و ہرچہ پیدا کردہ اند و ہرکہ پیدا کردہ است از آنچہ بدان تغییر سنت و مخالفت آن لازم آید قولاً و عملاً و اعتقاداً ضلالت است و مردود قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو ردّ و فرمود کل بدعة ضلالة و گفتہ اند ہرگز در دل کہ گرفتار بدعت است نور ولایت در نیاید" (مکتوبات شیخ ص [illegible] برحاشیہ اخبار الاخیار) ـ

حضرت شیخ صاحبؒ کی اس عبارت میں ایک تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ جو چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کی متغیر اور مخالف ہو وہ بدعت ضلالت اور مردود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نو ایجاد اور احداث مردود نہیں خواہ حسی ہو یا دینی۔ بلکہ وہ احداث مردود ہے جو سنت کا متغیر اور مخالف ہو۔ دوسرا یہ امر واضح ہوا کہ عبادات، عادات اور اعتقاد تمام چیزوں میں سنت کی پیروی لازم ہے اور اس کی مخالفت بدعت اور مردود ہے۔ تیسرا یہ امر واضح ہوا کہ کل بدعة ضلالة سے ہر نیا کام مراد نہیں جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ بقول شیخ صاحبؒ اس سے شرعی بدعت مراد ہے جو سنت سنیہ کے مخالف ہو۔ اور چوتھا یہ امر واضح ہوا کہ بدعتی میں نور ولایت کبھی نہیں آسکتا اسلئے کہ نور ولایت

تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور بدعتی اس سے سراسر محروم ہوتا ہے۔

ایک وہم اور اس کا ازالہ: ممکن ہے مفتی احمد یار خان صاحب یہ فرما دیں کہ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ دین کی قید اس حدیث میں نہیں ہے میں نے تو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید محض اپنی طرف سے ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ پیش کردہ عبارات میں دونوں قیدیں موجود ہیں۔ دین کی قید بھی اور عمل کی قید بھی۔ اور یہ روشن ہو چکا ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل جو بھی دین میں نو ایجاد کیا جائے گا وہ باطل اور مردود ہے۔ اور حدیث من احدث فی امرنا هذا ما الخ مطلق ہے۔ جو عقائد اعمال اور اقوال وخواہشات سب کو شامل ہے جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو محض عقائد پر بند کر دینا جیسا کہ مفتی صاحب نے کیا ہے سراسر باطل ہے بلکہ اس حدیث کے دوسرے سیاق میں صراحت کے ساتھ عمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من عمل عملا لیس علیه امرنا فهو رد۔ (بخاری ج۲ ص۱۰۹۲ و مسلم ج۲ ص۷۷ و مسند احمد ج۶ ص۱۴۶)

جس نے کوئی ایسا کام[ل] کیا جس پر ہماری طرف سے ثبوت موجود نہیں تو وہ کام مردود ہوگا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت صرف اعتقاد کا نام ہی نہیں بلکہ بدعت عملی بھی ہوتی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس کام کے لئے آپ سے ثبوت موجود نہ ہو اور جس پر آپ کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو تو وہ عمل باطل اور مردود ہوگا۔

لیجئے ہم مفتی احمد یار خان صاحب کی زبانی ان کو یہ مسئلہ منوا دیتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"بدعت کے شرعی معنی ہیں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ حیات ظاہری میں نہ ہوں بعد میں ایجاد ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدعت شرعی دو طرح کی ہوتی ہے بدعت اعتقادی اور بدعت عملی"۔ (بلفظہ جاء الحق ص۲۰۲)

ل بلکہ ابوداؤد ج۲ ص۲۷۹ کی روایت میں من صنع امرا علی غیر امرنا فهو رد کے الفاظ آتے ہیں اور دار قطنی ج۲ ص۵۲۷ میں بھی یہی ہے یعنی جو کوئی ایسا کام کرے کہ ہماری طرف سے ثبوت نہیں تو وہ مردود ہے

اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے بدعت اعتقادی اور بدعت عملی اور وعید دونوں پہ وارد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدعت اعتقادی پر وعید شدید آئی ہے اور بدعت عملی پر نفس وعید وارد ہوئی۔ مگر وعید کی حد اور اس کی زد میں دونوں بدعتیں آتی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی ایک اور غلطی | وہ لکھتے ہیں کہ: "اگر مان لیا جاوے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اسی کو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے (الیٰ ان قال) اور دنیا کا کوئی کام بھی نیت خیر سے کیا جاوے اس پر ثواب ملتا ہے (الیٰ ان قال) لہٰذا مسلمانوں کا ہر دنیوی کام دینی ہے۔ اب بتاؤ کہ نیت خیر سے پلاؤ کھانا بدعت ہے یا نہیں؟" (جاء الحق صفحہ ۲۱۲)۔

اس کا فلسفہ تو مفتی صاحب ہی جانیں کہ پلاؤ کی تخصیص میں کیا حکمت مضمر ہے؟ اور اس کا راز بھی وہی جانیں کہ لوگوں کو پلاؤ کھانے کی ترغیب کیوں دی ہے کھانے کی کیوں نہیں دی؟ مگر مفتی صاحب یہ تو بتائیں کہ کیا انہوں نے کتب فقہ اور اصول فقہ میں مباح کی تعریف بھی کہیں پڑھی ہے؟ اگر اور کتابیں نصیب نہیں ہو سکیں تو خلاصہ کیدانی ہی ملاحظہ کیجئے۔ اور اگر وہ بھی دستیاب نہ ہو تو انوار ساطعہ تو پیش نظر ہی ہوگی جس سے رطب و یابس حوالے چن چن کر جاء الحق تیار کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"اور بعضے مباح یعنی ان کے کرنے میں نہ ثواب نہ عذاب۔" (بلفظہ انوار ساطعہ صفحہ [illegible])

لیجئے مسلمانوں کے بعض کام ایسے بھی نکل آئے جن کے کرنے میں گو عذاب بھی نہیں مگر ثواب بھی نہیں ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے اپنے استدلال میں ایک عبارت نقل کی ہے جس میں اس کی تصریح ہے کہ مباح سے ثواب متعلق نہیں ہوتا (دیکھئے جاء الحق صفحہ ۲۰۵) مفتی صاحب کو اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار ہے؟ ع

مانتے جس کو نہ تھے بیٹھے بیٹھے وہاں

اہل بدعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ | دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ لیس منہ سے وہ عقائد

۱؎ [illegible] صفحہ [illegible] میں لکھا ہے لا یثاب ولا یعاقب علیہ یعنی نہ اس کے کرنے میں ثواب ہے اور نہ عذاب

اور اعمال مراد ہیں جو سنت اور دین کے خلاف ہوں اور تی للت کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی ان پر موجود ہو اور جو امور مسکوت عنہا ہیں ان کا احداث بدعت نہیں اور اگر بدعات بھی ہوں تو بدعت حسنہ ہوں گے۔ چنانچہ مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ :

"پس جیسے اہل اسلام کو جاننا چاہیئے کہ حدیث من احدث فی امرنا کے ذیل میں جو شارحین حدیث لکھ رہے ہیں کہ نکالنا اس چیز کا جو مخالف کتاب و سنت کے ہو بُرا نہیں۔ اس کے صاف یہی معنی ہیں کہ جس چیز کی نہی کتاب اور حدیث رسول اللہ میں موجود نہیں اس کا نکالنا بُرا نہیں۔ اور جس کی نہی موجود ہو وہ ایجاد و احداث مردود ہے۔ (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۳۷)

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

"اگر اعمال بھی ہوں تو لیس منہ سے مراد وہ اعمال ہیں جو خلاف سنت یا خلاف دین ہوں۔" (بلفظہ جاء الحق ص ۲۱۳)

الجواب : یہ ان کی اصولی غلطی اور جہالت کا بدترین مظاہرہ ہے۔ (اولاً) اس لئے کہ ابھی حدیث نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا (لیس علیہ امرنا) جس پر ہمارا ثبوت موجود نہیں تو وہ مردود ہوگا۔ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا کہ وہ کام مردود ہوگا (نھینا عنہ) جس پر ہماری نہی موجود ہو یا جس سے ہم نے منع کیا ہو۔ اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس چیز پر (باوجود اس کے کہ اس وقت اس کا سبب و محرک موجود تھا) آپ کی طرف سے ثبوت موجود نہ ہو تو وہ یقیناً بدعت ہوگی اگرچہ اس پر صریح نہی موجود نہ ہو۔

(وثانیاً) جس چیز پر آپ کی نہی موجود ہو وہ تو ممنوع اور منہی عنہ ہوگئی۔ وہ چیز احداث اور ابتداع کی مد میں کیسے رہی؟ پھر بدعت اور احداث کو الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت رہی حالانکہ بدعت اور احداث نہی سے الگ چیز ہے جیسا کہ صحیح روایات اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

(وثالثاً) اگر احداث اور بدعت کی یہ تعریف ہے کہ اس پر نہی موجود ہو تو پھر اس کی دو قسمیں بدعت حسنہ

اور بدعت سیئہ کیسے شمار کی گئی ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی کے بعد بھی اس کا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ اس میں حسن موجود ہو؟ اور اس صریح نہی کے ہوتے ہوئے علماء امت یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہی کی کم از کم درجہ کراہت ہے۔ پھر بدعت کے یہ احکام کہ واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح کیسے تجویز ہوئے؟ (دیکھئے شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۲۸۵ و مدخل لابن امیر الحاج ج ۲ ص ۱۵۴)۔

وسوماً یہ کہنا کہ جس چیز کی نہی کتاب و سنت میں نہ ہو اس کا نکالنا اور کرنا جائز ہے، یہ بھی سراسر باطل اور قطعاً مردود ہے اور محدثین عظام و فقہاء کرام کے صریح ضوابط کے خلاف ہے۔ علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ جیسے مواظبت خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت و خوشنودی کی جاتی ہے اسی طرح ترک سے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی متعلق ہے اور جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو کرنا سنت ہے اسی طرح کسی کام کو چھوڑنا بھی سنت ہے۔ لہٰذا آپ کے ترک فعل کی اتباع بھی سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔ چنانچہ حضرت ملا علی القاریؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ایک حدیث شریف یوں پیش کرتے ہیں:

ان اللہ یحب ان یؤتی رخصہ کما یحب ان یؤتی عزائمہ (مرقات ج ۱ ص ۴۱ و اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۳۰)

کہ اللہ تعالیٰ جیسے عزائم کی ادائیگی کو پسند کرتا ہے اسی طرح وہ اس کو بھی پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے۔

نیز حضرت ملا علی القاریؒ مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث انما الاعمال بالنیات کی شرح میں یہ نقل کرتے ہیں:

والمتابعۃ کما تکون فی الفعل تکون فی الترک ایضاً فمن واظب علی فعل لم یفعلہ الشارع فھو مبتدع (مرقات ج ۱ ص ۴۱)۔

کہ متابعت جیسے فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی متابعت ہوتی ہے۔ سو جو شخص کسی ایسے کام پر مواظبت کرے جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔

اور اسی موقع پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

اتباع ہمچنانکہ در فعل واجب است در ترک نیز

اتباع جیسے فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی

[illegible]

کل بدعۃ لیس لہا اصل مواظبت علیہا فعلہ النبی شارع نکرہ باشرعیۃ مبتدع یکون کذا قال المتقدمون۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۲۵)

اتباع ہوگی۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا اسی طرح محدثین کرامؒ نے فرمایا ہے۔

اور ملا علی قاریؒ ج ۱ ص ۴۱ میں بعینہٖ یہ مضمون ذکر کرتے ہیں:

شرح مسند امام ابو حنیفہؒ میں ہے:

والاتباع کما یکون فی الفعل یکون فی الترک فمن واظب علی ما لم یفعل الشارع صلی اللہ علیہ وسلم فہو مبتدع لشمول قولہ صلی اللہ علیہ وسلم من عمل عملا لیس علیہ امرنا فہو رد۔ (انتہی) (مواہب لطیفہ شرح مسند ابی حنیفہ بحث التقلید بالسم)

اتباع جیسے فعل میں ہے اسی طرح ترک میں بھی ہے۔ سو جس نے ایسے فعل پر مواظبت کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ مبتدع ہوگا کیونکہ اس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول شامل ہے کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا ثبوت نہیں تو وہ مردود ہوگا۔

امام علامہ سید جمال الدین المحدثؒ (المتوفی سنہ ۱۰۰۰ھ) فرماتے ہیں:

ترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ کما ان فعلہ سنۃ۔ (مواہب لطیفہ بحث مذکور)۔ (الجنۃ[1] ص ۱۶۲)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز اور کام کو ترک کرنا بھی سنت ہے جیسا کہ آپ کا فعل سنت ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو ترک کرنا ایسا ہی سنت ہے جیسا کہ آپ کا کسی کام کو کرنا سنت ہے۔ اور جو شخص آپ کی اس سنت پر عمل نہیں کرتا وہ محدثین کرامؒ کی تصریح کے مطابق بدعتی ہوگا۔ اور یہی بات ہم کہنا چاہتے ہیں کہ وہ تمام کام جو اہل بدعت کرتے ہیں ان کے دواعی اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت بھی موجود تھے مگر آپ نے ان کو ترک کیا ہے اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔

---

[1] الجنۃ لاصحاب السنۃ مؤلفہ مولانا عبد الغنی خان صاحب صدر مدرس مدرسہ تعلیم القرآن [illegible] پر حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کی جلیل القدر تقریظ موجود ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی الجنۃ کا حوالہ آئے گا اس سے یہی کتاب مراد ہوگی۔ بڑی معرکہ کی کتاب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دعا میں سجع سے بچو کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام دعا میں سجع نہیں کیا کرتے تھے (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۸)۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

ان رفعکم ایدیکم بدعة ما زاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ھذا یعنی الی الصدر (مسند احمد ج ۲ ص ۶۱)۔

تمہارا (اس طرح) ہاتھ اٹھانا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سینہ مبارک سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھائے۔

حضرت عمارہؓ بن رویبہ (المتوفی ۔۔۔ھ) نے بشر بن مروان کو منبر پر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو سخت لہجہ میں یوں ارشاد فرمایا کہ:

قبح اللہ ھاتین الیدین لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یزید علی ان یقول ھکذا بیدہ واشار باصبعہ المسبحة (مسلم ج ۱ ص ۲۸۷)

اللہ تعالیٰ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا ناس کرے میں نے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انگشت شہادت کی انگلی سے زیادہ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا (اور یہ دونوں ہاتھ اٹھا رہا ہے)۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عمارہؓ بن رویبہ جیسے جلیل القدر صحابی ہیں اور وہ ایسے امور کا سختی سے رد فرماتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اور ابن عباسؓ دعا میں سجع کہنے سے صرف اس لئے منع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا نہیں کیا۔ اگرچہ دعا اپنے مقام پر ایک بہت بڑی عبادت ہے لیکن بتقیید سجع محض اس لئے منع ہے کہ آپ سے اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے ایسا ثابت نہیں۔ اور حضرت ابن عمرؓ یہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دعا میں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں مگر صرف سینہ مبارک تک ہی، اور تم لوگ سینہ سے اوپر اٹھا کر آپ کے عمل کی مخالفت کرتے ہو، لہٰذا یہ فعل بدعت ہے۔ اور حضرت عمارہؓ بن رویبہ بشر بن مروان کے لئے قبح اللہ الخ کے سنگین الفاظ سے صرف

[illegible] ۔۔۔ ص ۱۴۱ [illegible] متفق علیہ۔

اس لئے یہ دُعا کرتے ہیں کہ آپ کے عمل پر اس نے زیادتی کی ہے جو ہر حالت میں قابل ملامت ہے۔

غور تو کیجئے کہ کس طرح یہ اکابر آپ کے عمل پر زیادتی کو اور تغیر ہیئت اور کیفیت کو بدعت قرار دیتے اور اس سے منع کرتے ہیں علامہ سعد الدین کاشغری الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۸۶۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

والزیادۃ علی ثمان رکعات لیلاً وعلی اربع رکعات نھاراً مکروہ بالاجماع۔ (غنیۃ المصلی ص۱۰۱)

رات کے وقت آٹھ رکعات سے زیادہ اور دن کے وقت چار رکعات سے زیادہ ایک سلام کے ساتھ نفل نماز پڑھنے آئمہ احناف کے اجماع سے مکروہ ہے۔

اور نہر الفائق میں اس کی تصریح ہے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے۔ حضرات فقہاء احناف نے اس کی دلیل یہ پیش کی ہے : لعدم ورود الاثر به۔ اس لئے مکروہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اثر اور دلیل موجود نہیں ہے اور ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفیؒ (المتوفی ۵۸۷ھ) بعض فقہاء کرام سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ویکرہ لان الزیادۃ علی ھذا لم تروعن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الخ (البدائع والصنائع ج۱ ص۲۹۵) یعنی یہ اس لئے مکروہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس سے زیادہ مروی نہیں ہے۔ اور صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ :

ودلیل الکراھۃ انه علیه السلام لم یزد علی ذلک ولولا الکراھۃ لزاد تعلیما للجواز (ہدایہ ج۱ ص۱۲۶)

کراہت کی دلیل یہ ہے کہ آپ سے زیادہ منقول نہیں اگر کراہت نہ ہوتی تو آپ تعلیم جواز کے لئے زیادہ بھی کر دیتے۔

فتاویٰ کبیری، درمختار، فتاویٰ عجیب، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور کنز العباد شرح اوراد میں ہے کہ :

یکرہ الدعاء عند ختم القرآن فی شھر رمضان وعند ختم القرآن بجماعۃ لان ھذا لم ینقل عن النبی صلی اللہ علیه وسلم ولا عن الصحابۃ (بحوالہ الجنۃ ص۱۳۲)

رمضان میں ختم قرآن کے وقت دعا کرنا اور اسی طرح ختم قرآن کے وقت مل کر دعا کرنا مکروہ ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ایسا کرنا منقول نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرات فقہاء کرامؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کے عدم نقل کو ایک مستقل قاعدہ اور ضابطہ سمجھ کر متعدد مقامات میں اس سے استدلال کیا ہے۔ مزید چند

حوالہ جات اور سن لیجئے:

امام المحقق المدقق علی بن ابی بکر الحنفی صاحب ہدایہ (المتوفی ۵۹۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ ان یتنفل بعد طلوع الفجر باکثر من رکعتی الفجر لانہ علیہ السلام لم یزد علیہما مع حرصہ علی الصلوٰۃ۔ (ہدایہ جلد ۱ صفحہ [illegible])

طلوع فجر کے بعد فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی زائد نفلی نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے اس سے زیادہ نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا؟ شیخ الاسلام نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم نقل کو کراہت کی دلیل بنایا ہے حالانکہ اس موقع پر نفل نماز کے ترک کرنے پر صاحب ہدایہ کی پیش کردہ کوئی صریح نہی موجود نہیں ہے۔ اور باوجود اس کے حضرات فقہاء احناف کے وکیل صاحب ہدایہ اس کو بلا دلیل مکروہ کہتے ہیں اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں اور اگر حدیث لا صلوٰۃ بعد الفجر الا سجدتین (جو نصب الرایہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ وغیرہ میں ہے) صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو قولی طور پر نہی قولاً و فعلاً ثابت ہو جائے گی۔ ایک دوسرے موقع پر صاحب ہدایہ یوں لکھتے ہیں:

ولیس فی الکسوف خطبۃ لانہ لم ینقل۔ (ہدایہ جلد ۱ صفحہ [illegible])

صلوٰۃ کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ خطبہ منقول نہیں ہے۔ جو صلوٰۃ کسوف کے لیے شرط ہو، جو خطبہ منقول ہے وہ وعظ و تذکیر کے لئے تھا۔

دیکھئے صاحب ہدایہ عدم نقل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع کیا ہے جس سے یہ ممنوع اور بدعت ہے۔ اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

ولا یتنفل فی المصلی قبل صلوٰۃ العید لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یفعل ذلک مع حرصہ علی الصلوٰۃ ثم قیل الکراہۃ فی المصلی خاصۃ وقیل فیہ وفی غیرہ عامۃ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یفعلہ۔ (ہدایہ جلد ۱ صفحہ [illegible])

اور عیدگاہ میں نماز عید سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے ایسا نہیں کیا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ کراہت عیدگاہ کے ساتھ خاص ہے یہ بھی کہا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عیدگاہ اور غیر عیدگاہ دونوں میں کراہت ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عیدگاہ و غیر عیدگاہ دونوں میں نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صاحب ہدایہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم فعل کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ صراحۃً مرفوع حدیث سے نہی اس پر پیش نہیں کی بلکہ صرف اتنا کہ آپ نے عیدگاہ میں یا عیدگاہ کے بدوں کسی دوسری جگہ نفل پڑھنے سے علی الاخصوص منع کیا ہے۔ مؤلف انوار ساطعہ اور مفتی احمد یار خان صاحب کے نزدیک اس فعل کو برا اور مکروہ نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی اس پر موجود نہیں ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی الحنفیؒ (المتوفی ۹۵۶ھ) نے صلوٰۃ رغائب (جو رجب میں پڑھی جاتی ہے) وغیرہ کے بدعت اور مکروہ ہونے کی یہ دلیل پیش کی ہے:

ان الصحابة والتابعين ومن بعدهم من الائمة المجتهدين لم ينقل عنهم (کبیری ص ۴۳۲) — کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور بعد کے ائمہ مجتہدین سے یہ منقول نہیں ہے

مشہور حنفی امام احمد بن محمدؒ جو احمد نقیب الاکابر ہے (المتوفی [illegible]) ایک مسئلہ کی تحقیق میں یوں ارقام فرماتے ہیں:

لانها بدعة لم تنقل عن الصحابة والتابعين۔ (الواقعات) — یہ بدعت ہے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی مستند ترین کتب محیط اور فتاویٰ عالمگیری سے کون مسلمان ناواقف ہوگا؟ ان میں صراحت سے یہ لکھا ہے:

قراءة الكافرون الى الآخر مع الجمع مكروهة لانها بدعة لم ينقل ذلك عن الصحابة والتابعين (عالمگیری باب الکراہیت [illegible]) — سورۃ کافرون کا آخر تک با جمع پڑھنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی جا سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ صلوٰۃ رغائب پر آپ کی نہی موجود ہے اور سورۃ کافرون کو آخر تک با جمع پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن حضرات فقہاء احناف اس کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور بدعت بھی اور دلیل صرف اتنی ہی پیش

کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ
ان پر صریح نہی بھی موجود نہیں ہے۔ مولوی عبدالسمیع صاحب وغیرہ کے خود ساختہ اور خود تراشیدہ قواعد
کے رو سے ان اشیاء کو بدعت اور مکروہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان میں صریح نہی موجود نہیں ہے۔ دیکھئے
اب مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ ان حضرات فقہاء احناف کی بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے حق ہونے کا
ثبوت دیتے ہیں یا صرف اسی پر ہی عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔
ان عبارات میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا خصوصیت سے حضرات فقہاء احناف نے ذکر کیا ہے
کہ چونکہ یہ کام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول نہیں لہٰذا بدعت ہے۔ مفتی صاحب کو آپ
یہ عبارت دیکھ کر کہ بدعت شدہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا اس میں صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کا ذکر نہیں۔ (جاء الحق ص ۲۱۵)
حق کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ خود آلوسیؒ نے مرقات اور اشعۃ اللمعات وغیرہ میں حدیث الخلفاء الراشدین، ما انا علیہ
و اصحابی اور خیر القرون کی حدیثیں بھی ضرور دیکھ لیں کہ کیا حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کی بات کو تسلیم کرنا سنت ہے یا بدعت؟
نیز انہی کے ہی مدینہ شریف ص ۳۲ میں ہے شب قدر میں جماعت کے ساتھ نماز نفل بعض لوگ ادا کرتے
ہیں فقہاء اسے ناجائز مکروہ و بدعت کہتے ہیں اور لوگ اس پر جو حدیث بیان کرتے ہیں محققین اسے موضوع کہتے ہیں۔

ـــہ حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ۔ ضرب جناب شیخ التقدس آپ ہیں

بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تحقیق | مناسب اور ضروری بھی معلوم ہوتا ہے کہ
بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی قدرے وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی کوتاہ فہم اور اہل فریب کو اس
سے غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہو چکی ہے تو بشرط انصاف زائل ہو جائے۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ لغوی بدعت اور شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر اس نو ایجاد کا نام
ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو، عام اس سے کہ وہ عبادت ہو
یا عادت۔ اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، مستحب، حرام، مکروہ، مباح۔ اور شرعی بدعت
وہ ہے جو قرون ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہو، اور اس پر قولاً، فعلاً، صراحتاً، اشارۃً کسی طرح بھی
شارع کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔ یہی وہ بدعت ہے جس کو بدعت ضلالۃ اور بدعت قبیحہ

اور بدعت سیئہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ان البدعة على قسمين بدعة لغوية و بدعة شرعية فالاولى هو المحدث مطلقا عادة كانت او عبادة وهي التي يقسمونها الى الاقسام الخمسة والثاني وهو ما زيد على ما شرع من حيث الطاعة بعد القرون الثلاثة بغير اذن من الشارع لا قولا ولا فعلا ولا صريحا ولا اشارة وهي المراد بالبدعة المحكوم عليها بالضلالة۔ (ترويح الجنان ص ۔ بالجہر ص ۱۲۱)

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لغوی بدعت، اور دوسری شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر نو ایجاد کا نام ہے جو عبادت یا عادت، اور اسی بدعت کی پانچ قسمیں کی جاتی ہیں اور دوسری بدعت ہے جو طاعت کی مد میں کسی مشروع امر پر زیادت (زیادتی) کی جائے مگر جو قرونِ ثلثہ کے ختم ہونے کے بعد اور بغیر شارع کے اذن سے ہو، نہ اس پر شارع کا قول موجود ہو اور نہ فعل، نہ صراحت اور نہ اشارہ، اور بدعتِ ضلالہ سے یہی مراد ہے۔

بدعت حسنہ اور سیئہ کی مزید بحث کے لئے ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۲۲ عمدۃ القاری ج ۵ ص ۲۵۱ نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵ اور مرقات ج ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ:

والتحقيق انها ان كانت مما تندرج تحت مستحسن في الشرع فهي حسنة وان كانت مما تندرج تحت مستقبح في الشرع فهي مستقبحة والا فهي من قسم المباح وقد تنقسم الى الاحكام الخمسة (فتح الباری ج ۴ ص ۲۱۹)

تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت، شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت قبیحہ ہوگی، ورنہ مباح ہوگی اور بدعت پانچ احکام کی طرف منقسم ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت علامہ عینیؒ کی ہے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۵۶۔

اب اس بات پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ مستحسن فی الشرع کیا ہے اور مستقبح فی الشرع کیا ہے؟ حضرت امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

البدعة بدعتان بدعة تخالف كتاباً وسنة أو إجماعاً أو أثراً عن بعض أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فهذه بدعة ضلالة وبدعة لم تخالف شيئاً من ذلك فهذه قد تكون حسنة لقول عمرؓ نعمت البدعة هذه۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ بدعت ہے جو کتاب یا سنت یا اجماع یا کسی صحابی کے اثر کے خلاف ہو ایسی بدعت گمراہی ہے اور دوسری بدعت وہ ہے جو ان میں سے کسی ایک کے خلاف نہ ہو تو ایسی بدعت کبھی اچھی ہوتی ہے جیسے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ کیا ہی اچھی نرالا اور بدعت ہے۔

(موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول لابن تیمیہؒ علی منہاج السنۃ ج ۲ ص ۱۲۸)

اس کی پوری تحقیق ناظرین کرام نے پڑھ لی ہے کہ مخالفت جیسے قول میں ہوتی ہے، اسی طرح فعل میں بھی مخالفت ہوتی ہے۔ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود دواعی و اسباب کے ترک کیا اور خیر القرون نے بھی اُسے ترک کیا تو وہ یقیناً بدعت اور ضلالت ہوگا۔ کیونکہ وہ کتاب و سنت اور اجماع خیر القرون اور قیاس صحیح کے مخالف ہے، اور جو ان میں سے کسی دلیل میں داخل ہو تو وہ کبھی اچھا ہوگا، جس پر ثواب ملے گا اور کبھی صرف مباح ہوگا جس پر ثواب ہوگا نہ عتاب۔

قیاس کی بحث میں مجالس الابرار کا حوالہ اور مذکورہ بالا عبارتیں پیش نظر رکھ کر بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تعریف یوں ہوگی:- بدعت حسنہ وہ دینی کام جس کا مانع آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد زائل ہوگیا ہو، یا اس کا داعیہ محرک اور سبب بعد کو پیش آیا ہو اور کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے اس پر روشنی پڑتی ہو اور ان میں سے کسی دلیل سے اس کا ثبوت ملتا ہو تو وہ بدعت حسنہ اور بالفاظ دیگر لغوی بدعت ہوگی جو مذموم نہیں ہے۔ علامہ ابن رجبؒ وغیرہ کی عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں جو اس پر صراحت سے دلالت کرتی ہیں۔ اور جس چیز کا محرک اور داعیہ اور سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں موجود تھا مگر آپ نے وہ دینی کام نہیں کیا اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعینؒ نے بھی باوجود کمال عشق و محبت اور محرکات و اسباب کے نہیں کیا تو وہ کام بدعت قبیحہ اور بدعت سیئہ اور بدعت شرعیہ کہلائے گا جو ہر حالت میں مذموم اور ضلالت و گمراہی ہوگا۔ باقی غیر مجتہد کا اجتہاد خصوصاً اس زمانہ میں ہرگز کسی بدعت کو حسنہ نہیں قرار دے سکتا۔ چنانچہ حضرات فقہاء کرامؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

"و در نصاب الفقہ نیز آوردہ ہر آنچہ بدعت حسنہ مجتہداں قرار دادہ اند ہمچناں صحیح است و اگر کسے دریں زمانہ چیزے بدعت حسنہ قرار دہد بر خلاف است زیرا کہ در معنی میگوید کہ کل بدعۃ ضلالۃ فی زماننا (فتاوی جامع الروایات۔ والجنۃ صفحہ [illegible])۔ یعنی نصاب الفقہ میں ہے کہ بدعت حسنہ وہ ہے جس کو حضرات مجتہدین نے بدعت حسنہ قرار دیا ہو سو درست ہے اور اگر کوئی شخص اس زمانہ میں کسی چیز کو بدعت حسنہ قرار دے گا تو وہ حق کے خلاف ہے کیونکہ معنی میں ہے کہ ہمارے زمانہ میں ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس عبارت سے صراحت کے ساتھ یہ بات واضح ہو گئی کہ بدعت حسنہ صرف وہی ہو گی جس میں حضرات مجتہدینؒ کا اجتہاد کار فرما ہو گا، اور اجتہاد و قیاس صرف اُن احکام اور مسائل میں ہی ہو سکتا ہے جو غیر منصوص ہوں اور ان کے دواعی اور اسباب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خیر القرون میں موجود نہ ہوں بلکہ بعد کو ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ اس نئی تہذیب کے زمانہ میں جو شخص بدعت کو حسنہ قرار دیتا ہے اس کا قول سراسر باطل اور مردود ہے۔ اور ایسی چیز کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سہ

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے — اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

اور یہی وہ بدعت ہے جس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ (وغیرہ) فرماتے ہیں کہ "چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند" (مکتوبات حصہ سوم صفحہ [illegible]) یعنی جو چیز مردود ہے وہ حسن اور خوبی کہاں سے پیدا کرے گی؟

مفتی احمد یار خان صاحب کی تعلّی | مفتی احمد یار خان صاحب نے تمام بدعات سیئہ کو بدعات حسنہ قرار دے کر اور بزعم خود اس کا مدار ان پر مرقات اور اشعۃ اللمعات کی مجمل عبارتوں سے دلائل پیش کر کے یہ سمجھا ہے کہ فتح کیا کر لی تھا کہ بگڑ جا کہ وہ رنگ میں یوں فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چار چیزوں (بدعت، شرک، دین اور عبادت) کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذہب بچ جاوے۔ آج بھی ہر دیوبندی اور ہر غیر مقلد کو اعلانِ عام ہے کہ ان کی ایسی جامع تعریف کرو جس سے محفل میلاد نہ ٹوٹے۔ (ملخصاً جاء الحق صفحہ [illegible])۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے کسی کام کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اس کا ترک کرنا سنت ہے، اور سنت کی مخالفت بدعت بھی ہے اور گمراہی بھی۔ مفتی صاحب ہی بتائیں کہ خیر القرون میں میلاد کس نے منائی؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بدعت کی تعریف تو اس کتاب میں ملاحظہ کر لیں، جس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اکابرین علماء دیوبند کے کسی کام کو بدعت کے ساتھ دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اور شرک اور عبادت وغیرہ کی تعریف راقم الحروف کے رسالہ گلدستہ توحید وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے۔ اور اپنی خاص محفل میں تو خوب تعلّی کا اظہار کیجئے، مگر میدان میں تعلّی کا کوئی کام نہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور بقول شیخ مصلح الدین سعدی (المتوفی ۶۹۱ھ) ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست　　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

فائدہ: یہ تحقیق ان حضرات کے نظریہ کے مطابق ہے جو بدعت کی تقسیم کے قائل ہیں، اور جو حضرات اس تقسیم کے قائل نہیں (مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ) تو وہ بدعت حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نزاع صرف لفظی ہو گا جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں:

"یہ کہ (جو) بدعت کی تقسیم نہیں کرتے وہ بدعت حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں پس بدعت حسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو تقسیم بدعت کا قائل ہو گا۔ اور جو تقسیم کا قائل نہ ہو گا وہ بدعت حسنہ کو سنت کہے گا۔" (انوار ساطعہ ص ۲۲)

بابِ سوم

بدعات کے جواز پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں
اُن پر ایک نظر

دیگر اہلِ بدعت حضرات کو نیز مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً لَا تَسْئَلُوا عَنْ اَشْيَاءَ (الآیۃ)
اور قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا (الآیۃ) نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "نیز فرماتے قُلْ مَنْ حَرَّمَ (اصل
میں مَنْ حَرَّمَ ہے) زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الآیۃ) ان آیات سے
معلوم ہوا کہ حرمت کی دلیل نہ ملنا حلال ہونے کی دلیل ہے نہ کہ حرام ہونے کی۔ یہ حضرات ان سے حرمت
ثابت کرتے ہیں الخ" (جاء الحق ص ۲۱۹)۔ ان آیات سے بدعات کے جواز پر تو ہرگز ثبوت نہیں پیش کیا
جا سکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔ مگر مرکزی نقطہ ان آیات سے اباحت کا سمجھا گیا ہے جو قطعی غلط ہے۔

کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟ اکثر مبتدعین حضرات بدعات کے جواز پر ان آیات سے
غلط مفہوم اخذ کر کے یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اس لئے یہ کام جائز
اور مباح ہیں۔ اور اسی قاعدہ پر وہ بے شمار بدعات کی عمارت استوار کرتے ہیں چنانچہ مولوی عبد السمیع
صاحب چند احادیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ان احادیث سے علماء نے ایک اصل عظیم پیدا کی ہے کہ
اصل اشیاء میں اباحت ہے۔" (انوار ساطعہ ص ۲۳) اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ ہم پوچھتے ہیں کہ
جو حضرات کہ ہر بدعت کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ کلیہ کے کیا معنی کریں گے کہ اَلْاَصْلُ فِی
الْاَشْيَاءِ الْاِبَاحَةُ " تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہیں یعنی ہر چیز ..... اصل ..... ہم

آگے شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: المختار ان الاصل الاباحۃ عند الجمہور من الحنفیۃ والشافعیۃ۔ جمہور حنفی اور شافعی کے نزدیک یہی مسلک ہے کہ اصل مباح ہونا ہے۔ (جاء الحق ج۱ ص۲۸ وراجع ص۲۳)۔

جواب: قطع نظر اس سے کہ بعض محققین کے نزدیک قاعدہ کلیہ صرف یہ ہے ان لا کلیۃ اور اس سے بھی صرف نظر کیجئے کہ ہر بدعت حرام ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض بدعتیں مکروہ بھی ہوتی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اباحت اصلیہ کا کیا مفہوم ہے اور احادیث سے اس پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ اور کیا یہ قاعدہ حضرات فقہاء کرامؒ کا اتفاقی اور مسلّمہ ہے یا اس میں بھی اختلاف ہے؟ اور راجح مسلک کے رو سے یہ کس گروہ کا مسلک ہے؟ اور یہ اختلاف ورود شریعت سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ نہایت متانت اور سنجیدگی سے ان امور پر غور کرنا ہے۔ اولاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامر ثلاثۃ امر بین رشدہ فاتبعہ وامر بین غیہ فاجتنبہ وامر اختلف فیہ فکلہ الی اللہ عز وجل۔ (رواہ احمد۔ مشکوٰۃ ج۱ ص۳۱)

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کام تین قسم کے ہیں: ایک وہ کہ اس کا ہدایت ہونا واضح ہو سو اس کی اتباع کرو اور دوسرا وہ کام ہے کہ اس کی گمراہی ظاہر ہو سو اس سے اجتناب کرو۔ اور تیسرا وہ جس میں اشتباہ واقع ہو سو اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اس روایت کے آخری جملہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس معاملہ کا حکم مخفی ہو اور اس میں اشتباہ ہو تو ایسے معاملہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر کے اس میں توقف کرنا چاہئے، نہ یہ کہ اس کے ساتھ مباح کا سا معاملہ ہو۔ چنانچہ علامہ طیبی الحنفیؒ (المتوفی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں:

وما لم یثبت حکمہ بالشرع فلا تقل فیہ شیئا وفوض امرہ الی اللہ۔

کہ جس چیز کا حکم شریعت سے ثابت نہ ہو تو اس میں تم کچھ بھی نہ کہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اور حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ فکلہ الی اللہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

پس بسپارید او را بخدا و توقف کنید در آں۔ — سو اس کو خدا تعالیٰ کے حوالے کر دو اور

(اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۴۷) اس میں توقف کرو۔

اس حدیث اور اس کی شرح سے بخوبی علم ہو گیا کہ جس چیز کا حکم شریعت سے ثابت نہ ہو اس میں توقف کیا جائے گا اور اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ نہ یہ کہ اس کو مباح سمجھ کر اس پر جواز کا فتویٰ صادر کیا جائے گا۔ اور حضرت ابو ثعلبہ الخشنیؓ (المتوفی ۷۵ھ) کی وہ روایت بھی اسی توقف کی دلیل ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ (رواہ الدارقطنی۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۵)

اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض متعین فرمائے ہیں سو ان کو مت ضائع کرو۔ اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے سو ان کی پردہ دری مت کرو۔ اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں سو ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے بغیر نسیان کے سکوت کیا ہے سو ان سے بحث نہ کرو۔

یہ روایت بھی توقف کی دلیل ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ باقی رہی وما سکت عنه فھو مما عفا عنه تو اس حدیث سے بھی توقف ہی مراد ہے۔ اس سے اباحت کا اثبات درست نہیں ہے کما لا یخفی۔

مشہور امام علاء الدین محمد بن علی الحصکفی الحنفیؒ (المتوفی ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں:

علی ما ھو المنصور من ان الاصل فی الاشیاء التوقف۔ (درمختار ج ۱ ص ۷۲)

یعنی منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔

اور طوالع الانوار حاشیہ درمختار میں اسی موقع پر ہے:

علی ما ھو المنصور ای المؤید بالادلۃ القویۃ من ان الاصل فی الاشیاء التوقف فلا یعرف اباحۃ المباح الا بقولہ وفعلہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

یعنی جس مسلک کی تائید قوی دلائل سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔ سو مباح کی اباحت بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔

اور یہی مضمون اسی موقع پر طحطاوی حاشیہ درمختار میں بھی ہے۔

اور تعلیقات شرح منار میں ہے:

قال اصحابنا الاصل فيها التوقف الا هذا اصح شيئ عندي في هذا الباب ان التوقف اصل التقوى في الامر المسكوت عنه وهو مذهب ابي بكرؓ وعمرؓ وعثمانؓ و اشباههم من الصحابةؓ والصحيح ان الاصل في الافعال التحريم وهو مذهب عليؓ وائمة اهل البيت ومذهب الكوفيين منهم ابو حنيفةؒ - (بحوالہ الجنہ ص۱۶۵)

اور ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ اصل اشیا میں توقف ہے اور اس باب میں میرے نزدیک سب سے صحیح تر بات تو یہ ہے کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کی طرف سے سکوت ہو اس میں توقف ہی اصل تقویٰ ہے اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور ان جیسے دیگر جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہی مذہب ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اصل افعال میں حرمت ہے اور یہی حضرت علیؓ اور حضرات ائمہ اہل بیتؓ اور اہل کوفہ کا مسلک ہے اور انہی میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔

دیکھئے اس عبارت نے یہ آشکارا کر دیا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ میں سے تین حضرات اور اسی طرح دیگر جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ مسلک ہے کہ اصل اشیا میں توقف ہے اور حضرت علیؓ اور اہل کوفہ کا جن میں خصوصیت سے حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی شامل ہیں یہ مسلک ہے کہ اصل اشیا میں حرمت ہے۔

اور شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۳۰ھ) لکھتے ہیں:

ان الاصل في الاشياء الاباحة كما هو مذهب طائفة بخلاف الجمهور فان عندهم الاصل هو الحرمة اي ان قال وعند الشافعي الاصل هو الحرمة في كل حال - (تفسیر احمدی ص۱)

کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے جیسا کہ ایک گروہ کا مسلک ہے اور جمہور اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اصل اشیاء میں حرمت ہے اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اصل اشیاء میں بہر حال حرمت ہے۔

اور مشہور اصولی اور محقق عالم ملا محب اللہ بہاری الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۱۹ھ) لکھتے ہیں:

الاباحة حكم شرعي لانه خطاب الشرع تخييراً - (مسلم الثبوت ص۴۹)

اباحت حکم شرعی ہے کیونکہ اباحت شریع کا خطاب ہے جس میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے

اور علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

وخُيِّر فيه وهو المباح (مرآة الاصول ج ۲ ص ۳۹۲)۔ — جس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے وہ مباح ہے۔

اور ملا مبین شرح مسلّم میں لکھتے ہیں کہ:

المباح ما اذن الشارع بالتخيير بين فعله وتركه۔ — مباح وہ ہے جس میں شارع نے اس کے کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا ہو۔

امام محمد بن محمد الغزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

وحد المباح انه الذي ورد الاذن من الله تعالى بفعله وتركه غير مقرون بذم فاعله ومدحه ولا بذم تاركه ومدحه۔ (المستصفی ج ۱ ص ۴۳)۔ — مباح کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کرنے اور چھوڑنے کا اذن دیا گیا ہو، نہ تو اس کے کرنے والے کی مذمت اور تعریف ہو اور نہ چھوڑنے والے کی مذمت اور تعریف کی گئی ہو۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ مباح بھی ایک شرعی حکم ہے جس کے کرنے اور نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے۔ اور کسی مباح کی اباحت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بعض نے اصل اشیاء میں اباحت تسلیم کی ہے لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے حضرت علیؓ اور حضرات اہل بیتؓ اور کوفہ کے فقہاءؒ و محدثینؒ اور خاص طور پر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اصل اشیاء میں حرمت کے قائل ہیں اور باقی جمہور اصل اشیاء میں توقف کے قائل ہیں بلکہ صاحب درمختار نے صاف لکھا ہے کہ:

الصحيح من مذهب اهل السنة ان الاصل في الاشياء التوقف والاباحة رأي المعتزلة۔ (در مختار مع شامی ج ۱ ص ۴۳)۔ — اہل سنت والجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کا خیال اور رائے ہے۔

مفتی صاحب تو دوسروں سے اس قاعدہ کا ماخذ دریافت کرتے تھے مگر اس عبارت کو سامنے رکھ کر ذرا یہ سوچنا چاہیے کہ اباحت کس کا مسلک ہے اور اس کے اختلافی ہونے میں تو شاید ہی کوئی کور مغز شک اور شبہ کر سکے گا۔ جب اصل ہی متفق علیہ نہیں تو اس پر قیاس کی دیوار رکھنا اور اس پر بدعات کی عمارت

کو شریک کرنا کیسے صحیح ہو گا؟ علاوہ بریں جو علماء اباحت کے قائل ہیں وہ بھی اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ محبّ اللہ صاحبؒ اپنی بے نظیر اور دقیق کتاب میں فرماتے ہیں:

واما الخلاف المذکور بین اہل السنۃ فی ان الاصل فی الافعال الاباحۃ کما ھو مختار اکثر الحنفیۃ والشافعیۃ او اصلھا الحظر کما ذھب الیہ غیرھم وقال صدر الاسلام الاباحۃ فی الاموال والحظر فی الانفس (الاشتراک التحریر صلا)

بہرحال اہلِ سنّت والجماعت کے درمیان جو اختلاف مذکور ہے کہ اصل اشیاء اور افعال میں اباحت ہے جیسا کہ اکثر حنفیہ اور شافعیہ کا مختار مسلک ہے یا اصل ان میں منع ہے جیسا کہ دوسرے علماء کا مسلک ہے۔ امام صدر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں کہ اموال میں تو اباحت اصل ہے اور نفوس میں حظر اور منع اصل ہے۔

اس عبارت سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ سنّت والجماعت کا آپس میں اختلاف محض اباحت اور توقف تک ہی محدود نہیں بلکہ اباحت اور حظر و منع کا اختلاف بھی ہے۔ اگر ایک گروہ اشیاء اور افعال کو اصل میں مباح کہتا ہے تو دوسرا ان کو اصل میں ممنوع اور محظور ٹھہراتا ہے اور امام صدر الاسلامؒ اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہوئے اوّل کو اصل میں مباح اور ثانی کو محظور اور ممنوع قرار دیتے ہیں۔

وثانیاً جو حضرات اباحتِ اصلیہ کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اصول اُمورِ تعبدیہ کے لئے نہیں بلکہ امورِ عادیہ کے لئے ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ معاملات میں تو اس قاعدہ کو قابلِ عمل بناتے ہیں لیکن عبادات میں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو نئی نئی عبادات کے ایجاد کرنے کا حق ہو گا اور وہ ایجاد کردہ عبادتیں اسی اُصول پر مباح اور درست ٹھہریں گی۔ مثلاً فرض کیجیے کہ کوئی بدعت پسند پانچ نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز ایجاد کرے اور اس کی ہر رکعت میں متعدد رکوع اور چار چار سجدے ایجاد کرے تو کیا اس اباحتِ اصلیہ کے قانون سے اس نو ایجاد نماز کو بھی جائز کہا جائے گا؟ الغرض اباحتِ اصلیہ کے قانون کو عبادات میں جاری کرنا سراسر جہالت ہے۔ چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی غرناطیؒ (المتوفی سنہ ۷۹۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یصح ان یقال فیما فیہ تعبد انہ مختلف فیہ ھل ھو علی المنع او ھو علی الاباحۃ

اُمورِ تعبدیہ کے متعلق یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع بالاصل ہیں یا مباح بالاصل۔

الإباحة بل هو امر زائد على المنع لأن التعبديات انما وضعها الشارع فلا يقال في صلاة سادسة مثلا انها على الإباحة فليتكلف وضعها على احد القولين ليتعبد بها لله لانه باطل بإطلاق۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۱۳)

(غرض وہ اس اختلاف کے تحت نہیں ہیں) کیونکہ عبادت کو شارع ہی نے مقرر کیا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر کوئی شخص چھٹی نماز ایجاد کرے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یا حسب اصلیت کے قول کی بنا پر یہ مباح اور جائز ہے اور مکلف کو اس کی ادائیگی کا حق ہے کیونکہ یہ مطلقاً باطل ہے (ملخصاً)۔

اور علامہ عبدالرحمن بن احمد بن رجب الحنبلیؒ (المتوفی ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں:

وان كان قد زاد في العمل المشروع ما ليس بمشروع فزيادته مردودة عليه يعني انها لا تكون قربة ولا يثاب عليها ولكن تارة يبطل بها العمل من اصله فيكون مردوداً كمن زاد ركعة عمداً في صلاته مثلا وتارة لا يبطله ولا يرده من اصله كمن توضأ اربعاً اربعاً۔ (جامع العلوم والحكم ص ۴۴)

کہ اگر کسی نے عمل شریع میں کوئی ایسی چیز بڑھا دی جو زیادت مشروع نہ تھی تو اس کی وہ زیادت مردود ہوگی بایں طور کہ وہ عبادت تصور نہ ہوگی اور اس کو اس پر ثواب نہ ملے گا۔ لیکن کبھی اس زیادت کی وجہ سے سرے سے اصل عمل ہی باطل ہو جاتا ہے اور وہ اصل اعتبار سے مردود ہے جیسے مثلاً کسی شخص نے عمداً نماز میں کوئی رکعت زائد کر دی۔ اور کبھی وہ عمل اصل سے تو باطل نہ ہوگا اور نہ اس معنی میں مردود ہوگا جیسے کوئی آدمی چار چار مرتبہ وضو کرے (مگر ایسا شخص ثواب کا اہل نہ ہوگا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس عمل مشروع کا فعل یا ترک کی صورت میں شریعت نے ایک معیار قائم کر دیا ہے تو اس میں اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی کمی یا زیادتی کرنا مردود ہوگا۔ اور اس زیادت کی وجہ کبھی تو سرے سے سارا عمل ہی مردود ہو جائے گا۔ اور کبھی بایں طور مردود ہوگا کہ اس پر ثواب نہ ملے گا۔ اور وہ قربت اور عبادت نہ ہوگا۔

و ثالثاً حضرات فقہاء کرام کا یہ اختلاف کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حظر اور توقف، تو یہ ورود شرع سے قبل کا معاملہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دنیا میں مبعوث ہونے سے قبل

ایک گروہ اشیاء و افعال میں اباحت کا قائل ہے اور ایک حرمت و حظر یا توقف کا اعتبار کئے کرتا ہے کہ وہ ہر دو نزدیک حرام ہی رہتا ہے) بالفاظ دیگر یہ اختلاف ہماری شریعت سے پہلے کا ہے نہ کہ شریعت کے آجانے کے بعد کا۔ شریعت نازل ہو چکنے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حرمت و حظر یا توقف۔ کیونکہ ہر عبادت اور ہر معاملہ کی شریعت مطہرہ نے حدود اور قیود متعین کر دی ہیں ان میں کسی دوسری اصل کو پیش کرنا ہرگز صحیح اور درست نہیں ہے۔ لہٰذا اباحت اصلیہ کا قول بھی نواب صدیق حسن خان صاحب وغیرہ کو مفید نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ عبد العلی بحر العلوم الحنفی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

يظهر من تتبع كلامهم ان الخلاف قبل ورود الشرع۔

علماء کے کلام میں تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف ورود شریعت سے قبل کا ہے۔

نیز وہ اسی مسئلہ کی محققانہ بحث کرتے ہوئے ایک علمی تنبیہ کے بعد فرماتے ہیں:

فاذا ليس الخلاف الا في زمان الفترة الذي اندرست فيه الشريعة بتقصير من قبلهم وحاصله ان الذين جاؤا بعد اندراس الشريعة وجهلوا الاحكام فما جهلهم هذا يكون عذراً فيما حل مع ان الافعال كلها متعلقة المباح اعني لا حرج بالفعل ولا بالترك كما في المباح وذهب اليه اكثر الحنفية والشافعية الى ان قال وانت تعلم ان القول بان الاباحة الاصلية بناء على زمن الفترة قبل شريعتنا يعني اذ لا اباحة حقيقة بل بمعنى نفي الحرج ونعني المراد من الافعال ما عدا الكفر ونحوه في حرمتهما في كل شرع

اس تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف زمانہ فترہ کے بارے میں ہے جس میں پہلے لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے شریعت مٹ چکی تھی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جو شریعت کے مٹ جانے کے بعد آئے اور احکام سے ناواقف رہے تو ان کا جہل معذور ہوگا اور سب افعال کے ساتھ مباح کا معاملہ کیا جائے گا یعنی نہ فعل پر ان کا مواخذہ ہوگا اور نہ ترک پر جیسا کہ مباح کا حکم ہے اور یہی اکثر حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور یہ بات بھی آپ جانتے ہیں کہ اباحت اصلیہ کا قول یعنی ہماری شریعت سے قبل زمانہ فترہ پر محمول ہے۔ اور اباحت بھی بایں معنی کہ حرج کوئی نہ ہوگا۔ اور شاید کہ مراد افعال سے کفر وغیرہ کے علاوہ ہے کیونکہ کفر وغیرہ کی حرمت ہر ایک شریعت میں واضح اور غیر مبہم طور پر بیان

فتنی ظهوراته فقا۔ (فواتح الرحموت ج ۱ ص ۴۹) کی گئی ہے۔

اس عبارت سے یہ معاملہ بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ اکثر حضرات شافعیہ اور حنفیہ کا اباحت اصلیہ کے بارے میں جو مختار قول ہے وہ ورود شرع سے قبل کے متعلق ہے۔ ورود شرع کے بعد وہ اباحت اصلیہ کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب البدائع والصنائع میں اور خاص طور پر تلویح شرح توضیح میں اس کی تصریح کی ہے کہ یہ اختلاف قبل البعثت کا ہے۔ قبل الشرع اور قبل البعثت کے الفاظ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ **الحاصل**: اشیاء میں اباحت اصلیہ کا قول حضرات فقہاء کرام کا متفق علیہ قول نہیں بلکہ بقول صاحب رد المختار یہ معتزلہ کا مذہب ہے اہل السنت کا نہیں اور اہل السنت میں بھی بہت سے علماء کا قول توقف بلکہ حظر یعنی حرمت کا ہے۔ اور وہ بھی عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے متعلق ہے پھر اباحت اصلیہ کا قول ورود شرع سے قبل کا ہے بعد کا نہیں۔ لہٰذا اس سے استدلال کر کے بدعات کی ترویج کرنا جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کر رہے ہیں، دینی اصطلاح میں اعلیٰ درجہ کی خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو اس سے بچائے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کی پارٹی کو اس سے کیا تعلق؟ ان کا تو اپنا کام چلتا رہے، اسلام جائے یا رہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً سے بدعتی کا استدلال اور اس کا جواب | اکثر بدعتی یہ حضرات اپنی بہ اس روایت کو بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اس کو نقل کر کے اس کا جواب بھی دیا جائے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ (ترجمہ مولانا وحید الزمان صاحب کا ہے)

من سن فی الاسلام سنة حسنة فعمل بها بعده کتب له مثل اجر من عمل بها ولا ینقص من اجورهم شیئ۔ (مسلم ج ۲ ص ۳۴۱)	ترجمہ: جو شخص نے نئی بات اسلام میں طریقہ نیک پر نکالی پھر اس طریقہ پر عمل کیا گیا تو لکھا جاوے گا اس شخص کے واسطے بعد اجر اور ثواب کے جتنا سب عمل کرنے والوں کو ملے گا بعد میں گا اور ان عمل کے ثواب میں کچھ کاٹ کر کمی نہ ہوگی۔ (انوار اللغۃ ص ۱۷۸)

جواب: اس روایت سے بدعات کی ترویج اور ان کے جواز پر استدلال کرنا باطل اور مردود ہے۔

اولاً اس لئے کہ حضرت ابوہریرہؓ (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]) اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ (ملاحظہ ہو حاشیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]) اور حضرت غضیف بن الحارث الثمالیؓ (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]) کی روایتوں میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من تمسک بسنتی جس نے میری سنت سے تمسک کیا اور مضبوطی سے اس کو پکڑا۔ اور فرمایا: فتمسک بسنۃ خیر الخ کہ سنت کے ساتھ تمسک کرنا بہتر ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ امتی کا کام سنت پر چلنا اور اس سے تمسک کرنا ہے نہ سنت جاری کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ رہا حضرات خلفاء راشدینؓ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور خیر القرون کا معاملہ تو محل نزاع سے خارج ہے اور اس کی پوری بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وثانیاً خود اسی روایت میں من سنّ فی الاسلام الخ کے بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ایما داعٍ دعا الی ھدی کہ جس داعی نے ہدایت کی طرف دعوت دی (مسلم ج ۲ ص [illegible] و ابن ماجہ ص [illegible] و مجمع الزوائد ج ۱ ص [illegible]) اور اسی روایت کے دوسرے طریق میں ہے:

من احیا سنۃ من سنتی قد امیتت بعدی (ابن ماجہ ص [illegible] ترمذی ج ۲ ص [illegible]۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]) — کہ جس نے میری کوئی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مردہ ہو چکی تھی۔

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

من احیا سنۃ من سنتی فعمل بھا الناس الحدیث (ابن ماجہ ص [illegible]) — کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی سنت زندہ کی کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوئے۔

اور نیز فرمایا:

من استن خیرا (ابن ماجہ ص [illegible]) — کہ جو شخص کسی اچھے راستہ پر چلا۔

اور ایک روایت میں ہے:

من علم علما فلہ اجر من عمل بہ لا ینقص من اجر العامل (ابن ماجہ ص [illegible]) — جس نے کوئی علم سکھایا تو اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا عمل کرنے والے کو اور اس کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔

ان روایات سے اس مجمل روایت کی تفصیل اور تشریح ہو جاتی ہے کہ سنت اور طریقہ کا جاری کرنا مراد

نہیں ہے بلکہ اس کی طرف دعوت دینا، اس کی تعلیم دینا، اس کو زندہ کرنا اور خود اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرنا مراد ہے۔ اس سے یہ مطلب سمجھنا اور مراد لینا کہ از خود کسی سنت کو جاری کرنا ہے یقیناً غلط ہے اور ان روایات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

وثالثاً اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا شریعت میں دلالۃً و اشارۃً ثبوت موجود ہو، اس کے اجراء کرنے میں ثواب ہوگا، اور وہ وہی فعل ہوگا جس کا داعیہ اور محرک خیر القرون میں موجود نہ ہو بلکہ بعد کو پیش آیا ہو اور ادلہ اربعہ میں سے کسی دلیل کے تحت وہ داخل ہو چنانچہ اسی حدیث میں سنۃ کی قید موجود ہے اور اہل سنت کے نزدیک کسی امر شرعی میں حُسن یا قبح نہیں پایا جا سکتا جب تک کہ شریعت سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ اور بدعات کی تو شریعت نے جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے، اس سے بھلا ان کا حسن ہونا کہاں سے اور کیسے ثابت ہوگا؟ الغرض اس روایت سے بدعات کے جواز پر استدلال کرنا محض جہالت اور شریعت مطہرہ سے ناقص بغاوت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کی ایک اور غلطی | اکثر اہل بدعت ہر قسم کی بدعات کے جواز پر ایک حدیث پیش کیا کرتے ہیں جس کو مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وقال علیہ السلام ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن (جاء الحق ص [illegible]) — جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر وہ جملہ بدعات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوں گی، اور اچھے کام پر تو نہ گرفت ہوتی ہے اور نہ گناہ۔

اس روایت کے متعلق چند ضروری ابحاث ہیں جن کو سمجھنا نہایت ہی اہم ہے۔

اوّل بحث یہ ہے کہ اگرچہ بعض حضرات فقہائے کرام نے اس روایت کو مرفوعاً بیان کیا ہے لیکن یہ روایت مرفوع نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر موقوف ہے۔ چنانچہ علامہ جمال الدین الزیلعی الحنفیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولم اجدہ الا موقوفا علی ابن مسعودؓ — میں نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن مسعود پر

(نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۳۳) موقوف ہی پایا ہے۔

اور مشہور محدث علامہ الامام صلاح الدین ابو سعید العلائی (المتوفی ۷۶۱ھ) فرماتے ہیں:

لم أجده مرفوعاً في شيء من كتب الحديث أصلاً ولا بسند ضعيف بعد طول البحث وكثرة الكشف والسؤال وإنما هو قول ابن مسعود موقوف عليه (كما في [illegible])

میں نے اس روایت کو باوجود طویل بحث و تحقیق اور زیادہ کھوج اور سوال کے حدیث کی کسی کتاب میں کسی ضعیف سند کے ساتھ بھی مرفوع نہیں پایا، بلکہ یہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا موقوف قول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابی کا قول خصوصاً حضرت عبداللہؓ بن مسعود جیسے بلند پایہ و ثقہ کا ثبوت میں معتمد علیہ کا اپنے مقام پر ایک وزنی دلیل ہے۔ مگر اصول حدیث کے رو سے مرفوع اور موقوف کا جو فرق ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل تو نہیں ہے۔ جو حیثیت حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کی ہے وہ یقیناً کسی صحابیؓ کے قول کی نہیں ہے، اگرچہ وہ صحیح بھی ہو۔ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اس موقوف قول کو پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

اسناد صحيح۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸) کہ اس کی سند صحیح ہے۔

دوسری[1] بحث یہ ہے کہ المسلمون سے کون مسلمان مراد ہیں؟ اگر الف اور لام اس میں جنس کے لیے ہو تو لازم یہ آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت کے تہتر فرقے سب کے سب ناجی ہو جائیں کیونکہ ہر ایک فرقہ اور ہر گروہ اپنے معمول کو حسن ہی سمجھتا ہے اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے جو ما انا علیہ و اصحابی کے الفاظ سے پیش کی جا چکی ہے۔ اور اگر الف اور لام سے استغراق مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی تو اس سے اجماع امت مراد ہوگی، اور اجماع کے حجت ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن اس سے مبتدعین کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ بدعات کا وجود خیر القرون میں ہرگز نہ تھا۔ لہٰذا سب مسلمانوں کا ان پر اتفاق و اجماع نہ ہوا۔ اور اگر الف و لام سے عہد خارجی مراد ہو تو اس سے مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ مراد ہوگا کہ مسلمانوں کا وہ

---

[1] علماء اصول کا یہ مسلک ہے کہ اصل الف و لام میں عہد خارجی ہے (دیکھئے تلویح ص ۱۲۲ و ص ۱۸۸ وغیرہ)

گروہ اور طبقہ جس چیز کو اچھا سمجھے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہوگی اور مسلمانوں کا وہ گروہ اولین درجہ پر بموجب حدیث ما انا علیہ و اصحابی صرف حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ پسند کریں وہ اچھی ہوگی۔ اگر حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی اس روایت اور ان سے مروی دیگر روایات کو سرسری نظر سے دیکھ لیا جائے تو المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی متعین ہو جاتا ہے۔

چنانچہ امام ابوداؤد طیالسیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) نے یہ روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے:

ان اللہ عز وجل نظر فی قلوب العباد فاختار محمدا فبعثہ برسالتہ وانتخبہ بعلمہ ثم نظر فی قلوب الناس بعدہ فاختار لہ اصحابہ فجعلہم انصار دینہ ووزراء نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فما رآہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن وما رآہ قبیحا فہو عند اللہ قبیح۔ (طیالسی ص ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے علم کے بموجب رسالت کے لئے چن لیا اور انتخاب فرمایا۔ پھر آپ کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ کے صحابہ کرامؓ کو انتخاب فرمایا اور ان کو اپنے دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔ سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی اور جس چیز کو وہ برا سمجھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بری ہوگی۔

(کم وبیش یہی الفاظ مسند احمد ج ۱ ص [illegible] میں بھی مروی ہیں۔ الفتح الربانی ج ۱ ص [illegible] والبدایہ ص [illegible])

اور امام ابو عبداللہ الحاکمؒ (المتوفی ۴۰۵ھ) صحیح سند کے ساتھ (جس کی تصحیح پر امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ دونوں متفق ہیں) اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

ما رآہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن وما رآہ المسلمون سیئا فہو عند اللہ سیئ وقد رأی الصحابۃ جمیعا ان یستخلفوا ابا بکرؓ۔ (المستدرک ج ۳ ص ۷۸)

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں تو وہ عند اللہ بھی بری ہوگی اور تمام صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا تو یقیناً ان کی خلافت عند اللہ بھی اچھی ہی ہوگی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کے نزدیک المسلمون کے لفظ میں حضرات صحابہ کرامؓ ہی کی طرف اشارہ ہے، بلکہ تصریح کر گئے ہیں کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کا پاک گروہ ہی مراد ہے۔

یہی نہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ ہی مراد لیتے ہیں بلکہ امت کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ حضرات صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔ کیونکہ ان کی اتباع ہی میں فلاح ہے۔

وعن ابن مسعودؓ قال من كان مستنا فليستن بمن قد مات فان الحي لا تؤمن عليه الفتنة اولئك اصحٰب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما واقلها تكلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم۔ (رواہ رزین مشکوٰۃ ج۱ ص۳۲)

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے تو وہ ان بزرگوں کے قدم پر چلے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ زندہ کسی فتنہ سے مامون نہیں ہو سکتے۔ وہ بزرگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس امت کے نہایت افضل لوگ اور نہایت نیک قلب والے اور نہایت گہرے علم والے اور نہایت کم تکلف اور کم بناوٹ والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ ان کی فضیلتوں کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور سیرت کو مضبوط پکڑو کیونکہ وہ لوگ ہدایت مستقیم پر تھے۔

اس روایت سے نہایت صراحت اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کا مصداق صرف اولٰئک اصحٰب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ واصحابی سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے حضرات صحابہ کرامؓ کی اتباع کی تاکید اور اس کے خلاف ابتداع کی مذمت کی ہے۔

اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد كفيتم۔

ہمارے نقش قدم کی پیروی کرو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت

(الاعتصام ج ۱ ص ۸۳) اپنا کوئی کیونکر دین قبول ہو سکتا ہے اور تم کفایت کئے گئے ہو

اور دوسری طرف سختی سے ان لوگوں کی تردید کی اور ان کو مسجد سے نکلوا دیا جنہوں نے مل کر بلند آواز سے ذکر کرنے اور درود شریف پڑھنے کو پسند کیا تھا (جس کا ذکر باحوالہ آگے آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ) اور ان کے اس فعل کو انہوں نے ما رآہ المسلمون حسنا کے تحت حسن اور اچھا نہ سمجھا کیونکہ ان لوگوں کا یہ طریقہ حضرات صحابہ کرامؓ کے طریقے کے خلاف تھا۔

تیسری بحث یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس مراد ہیں تو اس روایت کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے اچھا سمجھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے برا اور قبیح سمجھا تو وہ چیز عند اللہ بھی بری اور قبیح ہی ہوگی۔ اور اہل بدعت حضرات کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بیشتر بلکہ جملہ وہ بدعات جن پر وہ کاربند ہیں حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں ہیں۔ اگر وہ چیزیں ان کے نزدیک بھلی اور اچھی ہوتیں تو وہ ہرگز ان سے نہ چوکتے۔ اور اگر وہ ان کے نزدیک بری اور قبیح نہ ہوتیں تو وہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ ان کا علم بھی وسیع اور عمیق تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق بھی کامل تھا۔ خوف خدا اور فکر آخرت بھی ان میں اعلیٰ درجہ پر تھا لہٰذا جس چیز کو انہوں نے قبیح سمجھ کر اس پر عمل نہیں کیا تو یقیناً وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی قبیح اور بری ہی ہوگی۔ بہرکیف یہ روایت جملہ بدعات کی تردید کی دلیل ہے نہ کہ ان کی تائید اور ان کی ترویج اور اشاعت کی۔ مگر اللہ تعالیٰ جس کو سنت کے سمجھنے کی توفیق دے اور پھر اس پر عمل کی توفیق بخشے۔ یہ راستہ ہے تو کافی دشوار گذار مگر بحمد اللہ تعالیٰ ہم

ہم خوش ہی خوش ہیں عشق سے گو راہ عشق میں
زنجیر طوق و دار و رسن جا بجا ملے!

باب چہارم

عبادات کے اندر اپنی طرف سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کوئی چیز اصل ہی میں بری ہو تو وہ بدعت ہوگی بلکہ وہ تمام طاعات و عبادات بھی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے ان میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت بدل دینا، یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا، یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہوگی، اور شریعت اسلامی اس کو پسند نہیں کرے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ (المتوفی ۵۷ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تختصوا لیلة الجمعة بقیام من بین اللیالی ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومه احدکم۔

(مسلم ج ۱ ص [illegible])

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے علیحدہ اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور نہ جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے خاص کرو مگر ہاں اگر کوئی شخص روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے تو الگ بات ہے۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فضیلت کے باوجود اس وجہ سے کہ شریعت نے اس کی تخصیص نہیں کی، جمعہ کی رات کو نماز وغیرہ کے لئے اور دن کو روزہ کے لئے خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابو اسحاق شاطبیؒ عبادات کی تعیین اور تحدید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ومنها التزام الكيفيات والهيئات المعينة كالذكر بهيئة الاجتماع على صوت واحد (إلى أن قال) ومنها التزام العبادات المعينة في أوقات معينة لم يوجد لها ذلك التعيين في الشريعة۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۳۹)

اور انہی بدعات میں سے کیفیات مخصوصہ اور ہیئات معینہ کا التزام ہے جیسے کہ بہیئت اجتماع کے ساتھ ایک آواز پر ذکر کرنا (پھر آگے فرمایا) اور انہی بدعات میں سے خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا التزام کر لینا بھی ہے جن کے لئے شریعت مطہرہ نے وہ اوقات مقرر نہیں کئے ہیں۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

فإذا ندب الشرع مثلاً إلى ذكر الله فالتزم قوم الاجتماع عليه على لسان واحد وبصوت واحد أو في وقت معلوم مخصوص عن سائر الأوقات لم يكن في ندب الشرع ما يدل على هذا التخصيص الملتزم بل فيه ما يدل على خلافه۔ (الاعتصام ج ۲ ص [illegible])

جب شریعت کسی چیز کی ترغیب دے مثلاً ذکر اللہ ہے۔ اگر ایک قوم اس کا التزام کرے کہ ایک زبان ہو کر ایک آواز سے وہ ذکر کرتی ہے یا دیگر اوقات کے علاوہ کسی معلوم اور مخصوص وقت کے اندر وہ ذکر کرتی ہے تو شریعت کی ترغیب اس معینہ تخصیص اور التزام پر ہرگز دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ اس کے خلاف دلالت کرتی ہے۔

حافظ ابن دقیق العید لکھتے ہیں کہ:-

إن هذه الخصوصيات بالوقت أو بالحال والهيئة والفعل المخصوص يحتاج إلى دليل خاص يقتضي استحبابه بخصوصه وهذا أقرب

یعنی یہ خصوصیات جو وقت یا حال اور ہیئت اور فعل مخصوص کیساتھ ہوں کسی خاص دلیل کی محتاج ہیں جو کہ بالخصوص اسکے استحباب پر دلالت کرے اور یہی چیز قریب الی الصواب ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:-

لأن الحكم باستحبابه على تلك الهيئة الخاصة يحتاج دليلاً شرعياً عليه ولابد

کیونکہ کسی چیز کی کسی خاص ہیئت کے ساتھ مستحب ہونے پر لازمی طور پر یہ ضروری ہے کہ دلیل شرعی موجود ہو۔

پھر آگے روافض کی عید غدیر کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ما احدثته الروافض من عيد ثالث سموه عيد الغدير وكذلك الاجتماع واقامة شعارٍ في وقت مخصوص على شيء مخصوص لم يثبت شرعاً وقريب من ذلك ان تكون العبادة من جهة الشرع مرتبة على وجه مخصوص فيريد بعض الناس ان يحدث فيها امراً آخر لم يرد به الشرع زاعماً انه يندرج تحت عموم فهذا لا يستقيم لان الغالب على العبادات التعبد وماخذها التوقيف۔

(الاحکام ج ۲ ص ۱۱)

شیعوں نے جو تیسری عید جس کو وہ عید غدیر کہتے ہیں ایجاد کی ہے۔ اسی کے لئے اجتماع اور اس کے بطور شعار کے قائم کرنے پر جو مخصوص وقت اور خاص ہیئت کے ساتھ کی جاتی ہے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور اسی کے قریب یہ بات بھی ہے کہ کوئی عبادت شریعت میں کسی خاص طریقہ پر ثابت ہو اور بعض لوگ اس کے اندر کچھ تغیر کر دیں اور خیال یہ کریں کہ یہ بھی عموم کے نیچے داخل ہے تو ان کا ایسا خیال درست نہ ہوگا کیونکہ عبادات کے اندر تعبدی طریقہ غالب ہے اور اس کا ماخذ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اطلاع پانے پر موقوف ہے۔

صاحب مجالس الابرار ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت کا حوالہ دیتے ہوئے (اس روایت کا ذکر اپنے مقام پر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں:

فكذا يقال في كل من اتى في العبادات البدنية المحضة بصفة لم تكن في زمن الصحابة رضی اللہ عنہم۔

(مجالس الابرار ص ۱۲۹)

پس اس شخص کے متعلق ایسا ہی کہنا چاہیئے (کہ وہ بدعت کا مرتکب ہے) جو خالص بدنی عبادات میں کوئی ایسی صفت اور ہیئت پیدا کرے جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھی کیونکہ اس تغیر ہیئت کی وجہ سے دین بدل جائے گا اور اسی کا نام تحریف دین ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریف دین کے اسباب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

ومنها التشدد وحقيقته اختيار عبادات شاقة لم يأمر بها الشارع كدوام الصيام والقيام والتبتل وترك التزوج وان يلتزم

اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ تشدد اختیار کیا جائے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی شاق عبادات کو اختیار کیا جائے جن کے متعلق شریعت نے حکم نہیں دیا مثلاً کوئی دائمی طور پر

السنن والآداب كالتزام الواجبات (الى ان قال) فاذا كان هذا المتعمق او المتشدد معلم قوم ورثتهم ظنوا ان هذا امر الشرع ورضاه وهذا ادواء رهبان اليهود والنصارى۔ ([illegible] الشرعي ص [illegible])

دوسرے سنن اور آداب کو بھی واجبات کی طرح لازم سمجھ لے اور پھر جب کوئی ایسا متعمق یا متشدد کسی قوم کا معلم یا پیشوا بن جاتا ہے تو قوم یہ خیال کر لیتی ہے کہ اس کا یہ عمل شریعت کا حکم ہے اور اس کا پسندیدہ امر ہے۔ اور یہی بیماری تھی یہود اور نصاریٰ کے راہبوں کی۔

یہی وجہ ہے کہ قانون الٰہی نے انسانوں کو ان کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑا۔ عبادات و معاملات حتیٰ کہ حکومت اور سلطنت کے احکام میں بھی ان کو پابند کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی اہواء و خواہشات کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کا حلیہ نہ بگاڑ دیں۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

فجاءت الشرائع بحملهم على ذلك في جميع احوالهم من عبادة او معاملة حتى في الملك الذي هو طبيعي للاجتماع الانساني فاجرته على منهاج الدين ليكون الكل محوطا بنظر الشارع۔ (مقدمہ ص [illegible])

شرائع اسلامیہ اس لئے تو آئی ہیں کہ لوگوں کو تمام حالات میں (خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات حتیٰ کہ ملکی انتظام جو لوگوں کے اجتماع کا ایک طبعی امر ہے) دین پر قائم رہنے کی تلقین کریں اور دین کے طریقہ پر چلنے اور قائم رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ ان کے تمام معاملات شارع کی نگرانی میں چلیں۔

مشہور فقیہ ابو حنیفہ ثانی علامہ زین العابدین ابن نجیم المصری الحنفی (المتوفی سنہ ۹۷۰ھ) لکھتے ہیں:

لان ذكر الله تعالى اذا قصد به التخصيص بوقت دون وقت او بشيء دون شيء لم يكن مشروعا حيث لم يرد به الشرع لانه خلاف الشرع۔ (بحر الرائق ج ۲ ص ۱۵۹)

اس لئے کہ ذکر اللہ کی جب کسی ایک ہی وقت کے ساتھ تخصیص کا قصد کر لیا گیا اور دوسرے وقت میں وہ نہ ہوا یا کسی شے کے ساتھ ذکر اللہ کو مخصوص کر دیا گیا دوسری چیز کے ساتھ وہ نہیں کیا گیا تو وہ مشروع نہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق شریعت میں کوئی تخصیص نہیں آئی لہٰذا وہ خلاف شرع ہوگا۔

علامہ موصوف یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک بڑی عبادت ہے لیکن جب شریعت نے

اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ یا جہر اور اخفاء یا اجتماع و انفراد وغیرہ کسی خاص کیفیت اور ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تو اس کو اپنی طرف سے کسی خاص وقت یا کسی خاص کیفیت کے ساتھ متعین کر دینا غیر شرعی ہوگا، بلکہ تحریف دین۔ اس لئے کہ شریعت نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"عمل فقیر نیز بہمیں است و ہیچ سنتے را بہ روزے دیگر ترجیح نمی دہد تا آنکہ ترجیح آنہا از شارع معلوم نگردد کہ جمعہ و رمضان و دیگر عبادات" (مکتوبات حصہ چہارم ص ۲۹)

اس فقیر کا عمل بھی اسی پر ہے کہ کسی سنت کو کسی دن پر ترجیح نہیں دیتا تاوقتیکہ اس کی ترجیح شارع سے معلوم نہ کرلے۔ جیسا کہ جمعہ اور رمضان وغیرہ کی ترجیح شارع سے معلوم ہو چکی ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ جب شریعت نے کسی بات یا دن کو کسی عبادت کے لئے مخصوص نہ کیا ہو، اور جب ذکر اللہ وغیرہ عبادات کو کسی خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ متعین نہ کیا ہو تو اپنی طرف سے وقت اور کیفیت کا تعیین کرنا اور اس تعیین کا التزام کرنا بدعت بھی ہے اور غیر شرعی بھی۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا ایسی کیفیات اور ہیئت کی تعیین سے متعلق کیا فیصلہ ہے؟

زبان کی سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال اور بہتر سے بہتر شعار ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا وہ کامل اتباع رسول اور عمل ہے۔ انسانی سیرت کے جوہر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال اور خیالات نہیں، بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے تشدد دینی سے سرمست ہو کر اپنی جان دے دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کے لئے مربوط کر دینا اس طرح سے کہ کسی بات میں سنت محمدی سے قدم ادھر ادھر نہ ہو، سب سے زیادہ مشکل امتحان ہے اس اتباع کے امتحان میں تمام حضرات صحابہ کرامؓ پورے اترے۔ آپ کی زندگی کے آئینہ میں حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور یہ بولتی چالتی جیتی جاگتی تصویریں ہر مسلمان کی زندگی کی حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ

بن جاتی ہیں اور اسی اتباع سنت کے صحیح جذبہ نے حضرات تابعین اور تبع تابعین اور بعد کو آنے والوں کا یہ اہم فرض قرار دیا کہ وہ آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اور ایک ایک جنبش کو معلوم کریں اور پچھلوں کو بتا دیں تاکہ پچھلے اپنے امکان بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا گزر مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت پر ہوا جس میں ایک شخص کہتا تھا سو مرتبہ اللہ اکبر پڑھو تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر وہ کہتا سو بار لا الٰہ الا اللہ پڑھو تو وہ سو بار تہلیل پڑھتے۔ پھر وہ کہتا سو دفعہ سبحان اللہ کہو تو وہ کنکریوں پر سو دفعہ تسبیح پڑھتے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو۔ وہ کہنے لگے ہم تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھتے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

فقال فعدوا من سيئاتكم فانا ضامن ان لا يضيع من حسناتكم شيء ويحكم يا امة محمد صلى الله عليه وسلم ما اسرع هلكتكم هؤلاء صحابة نبيكم متوافرون وهذه ثيابه لم تبل وآنيته لم تكسر (الى ان قال) او مفتتحي باب ضلالة۔ (مسند دارمی ص ۳۱ طبع [illegible])

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کیا کرو۔ میں اس کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوگا۔ تعجب ہے تم پر اے امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا ہی جلدی تم ہلاکت میں پڑ گئے ہو۔ ابھی تک حضرات صحابہ کرامؓ تم میں کثرت سے موجود ہیں، اور ابھی تک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور ابھی تک آپ کے برتن نہیں ٹوٹے (آگے فرمایا) انہی حالات تم بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو۔

علامہ قاضی ابراہیم صاحبؒ، حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

ان عبد الله بن مسعود قال والذي لا اله غيره لقد جئتم ببدعة ظلماء او لقد فقتم على اصحٰب محمد صلى الله عليه وسلم۔ (مجالس الابرار ص [illegible])

میں عبداللہ بن مسعودؓ ہوں خدائے وحدہ لا شریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے یہ نہایت تاریک اور سیاہ بدعت ایجاد کی ہے یا کیا تم علم میں جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بڑھ گئے ہو؟

اور شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ ان کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

فقال إذا رأيتموه فأخبروني قال فأخبروه فأتاه ابن مسعودؓ متقنعا فقال من عرفني فقد عرفني ومن لم يعرفني فأنا عبد الله ابن مسعود تعلمون أنكم لأهدى من محمد صلى الله عليه وسلم وأصحابه (إلى أن قال) لقد جئتم ببدعة ظلماء أو لقد فضلتم أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم علما فهذا ابن مسعودؓ أنكر هذا الفعل مع إمكان إدراجه تحت عموم فضيلة الذكر۔ (احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۰۶)

فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب تم اس کو دیکھو تو مجھے اطلاع دو۔ راوی کہتا ہے کہ ان کو اطلاع دی گئی تو وہ تشریف لائے اور سر پر کپڑا ڈالے ہوئے تھے۔ فرمایا جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں بتاتا ہوں کہ میں عبداللہ بن مسعودؓ ہوں۔ تم جانتے ہو کہ تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے زیادہ ہدایت پر ہو (العیاذ باللہ تعالیٰ) پھر فرمایا تم نے ایک بہت بڑی بدعت ایجاد کی ہے یا تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ پر علم میں فضیلت حاصل کر چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خصوصی ہیئت اور کیفیت کے ساتھ اس عمل کا انکار کیا ہے حالانکہ فضیلت ذکر کے عام دلائل کے تحت اس کا اندراج ممکن تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ اگرچہ تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید کی بہت کچھ فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اور وہ محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طرز و طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کا بتایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ خود تمہارا ایجاد کردہ ہے۔ لہٰذا یہ بدعت ضلالت بھی ہے اور گمراہی بھی، یہ بدعت ظلمیٰ بھی ہے اور بدعت ظلماء بھی اور بقول امام ابن دقیق العیدؒ اس مخصوص کیفیت کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فضیلت ذکر کی عام دلیلوں کے نیچے داخل نہیں کیا۔

اور اس روایت کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں:۔

"عبداللہ بن مسعودؓ نے جہر سے ایک جماعت ذکر اللہ کرنے والوں کو دھمکایا اور ان کے فعل کو بدعت قرار دیا کتب فقہ اور حدیث میں یہ روایت مذکور ہے" (انوار ساطعہ ص ۱۲۳)۔ اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔ "اس روایت میں تنقید قاصر ہے۔ یعنی ایک آدمی قصہ گو رات کے وقت قصہ کہنے بیٹھا تھا اور دنیا کے قصے کرتی

کے لوگوں کو کہتا جاتا تھا کہ ایسا کہو، ایسا کہو۔ یہ خبر عبداللہ بن مسعودؓ کو پہنچی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور ان کو دھمکایا کہ تم نے یہ بدعت نکالی ہے۔ واضح ہو کہ یہ انکار کرنا بوجہ ہیئت جدیدہ کے سبب نہ تھا بلکہ وہ اس کا مجمع کرنا قصہ گوئی کے واسطے یہ خلاف شرع تھا۔ گو ذکر اللہ بھی کبھی درمیان میں ہوتا ہو، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصہ گویوں کو جو بے اصل قصے بیان کرتے تھے بدعت نکالا کرتے تھے۔ (انوار ساطعہ، بلفظہ ص۱۲۸)۔

مولوی عبدالسمیع صاحب نے اصولی طور پر یہ روایت تو بے تکلف تسلیم کر لی ہے۔ ہاں البتہ اس کی تاویل کی ہے کہ یہ مجلس بے اصل قصہ گوئی کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو پسند نہ آئی اور اسی لئے انہوں نے اس کو بدعت اور ضلالت کہا۔ اور اس کی دلیل لفظ قاص ہے (ایک قصہ گو) اور ذکر اللہ کی یہ توجیہ کی کہ ذکر ضمنی طور پر کبھی کبھی اثنائے قصہ گوئی میں ہوتا رہا۔ مگر صاحب انوار ساطعہ کی یہ تاویل نہایت رکیک اور سراسر باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ جس روایت اور روایت کے جن الفاظ سے ان کو دھوکا ہوا ہے وہ یہ ہیں:

قاص یجلس باللیل ویقول للناس قولوا کذا و قولوا کذا۔ (احکام الاحکام ج ۱ ص۲۸) — کہ ایک بیان کرنے والا رات کو بیٹھ جاتا اور لوگوں سے کہتا تم یہ کہو اور تم یہ کہو۔

یہ روایت اور اس کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس بات کو آشکار کرتے ہیں کہ وہ قاص لوگوں ہی سے کہلواتا تھا اور ان کو طریقہ بتلاتا تھا کہ تم یہ کہو تم یہ کہو۔ اس روایت میں کہیں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں کہ وہ بیہودہ اور لایعنی قصہ گوئی کرتا تھا اور درمیان میں کبھی کبھی لوگوں سے ذکر اللہ بھی کروایا کرتا تھا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ جو کچھ وہ کہتا جاتا تھا وہی کچھ جملہ اہل مجلس کہتے جاتے تھے۔ وثانیاً ہم نے مسند دارمی کی صحیح روایت سے یہ عرض کر دیا ہے کہ وہ سو سو مرتبہ اللہ اکبر، سو سو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ اور سو سو مرتبہ سبحان اللہ وغیرہ ان کو پڑھواتا تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پڑھتے جاتے تھے۔ اور ان کا اس اجتماعی رنگ میں ذکر کرنا ہی حضرت ابن مسعودؓ کو ناگوار گزرا اور اسی کو انہوں نے بدعت ضلالہ اور بدعت ظلمی سے تعبیر کیا ہے۔ صاحب انوار ساطعہ کا یہ کہنا کہ انکار کرنا بوجہ ہیئت جدیدہ کے سبب نہ تھا ان کی ذاتی اختراع اور ایجاد بندہ ہے جو کسی صورت میں بھی قابل

التفات نہیں ہے۔ مسند دارمی کا بعض مضمون کچھ ملاحظہ کر لیا جائے۔

فوقف عليهم فقال ما هذا الذي اراكم تصنعون قالوا يا ابا عبد الرحمٰن حصا نعد به التكبير والتهليل والتسبيح قال فعدوا سيئاتكم۔ (الحديث)

(مسند دارمی ص [illegible])

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ انکے پاس کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ یہ کیا معاملہ ہے جو میں تم سے دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا اے ابو عبدالرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت تھی) ہم ان کنکریوں پر اللہ اکبر و لا الٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ شمار کرتے ہیں۔ فرمایا تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو۔

غور فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صاحب انوار ساطعہ آنجناب ہی از روئے انصاف یہ فرمائیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نفس ذکر کو بدعت ظلماء سے تعبیر کیا ہے یا کنکریوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنے کو؟ اور یہ انکار محض ہیئت جدیدہ کی وجہ سے تھا یا نفس ذکر کی وجہ سے؟ اور ان لوگوں نے اپنا تصور کنکریوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنا بیان کیا ہے یا نفس ذکر کرنا؟ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فعدوا سیئاتکم ارشاد فرما کر تکبیر و تسبیح وغیرہ کے شمار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس فعل کو بدعت کہا ہے یا اس سے نفس ذکر کا کنکریوں پر شمار کرنا مراد ہے؟ الغرض صاحب انوار ساطعہ کی تاویل سراسر مردود ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا انکار صرف محض ہیئت جدیدہ کی وجہ سے تھا۔ اسی کی طرف شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ نے اشارہ کیا ہے اور اسی کو قاضی ابراہیمؒ نے بصفة لم تكن فى زمن الصحابة سے تعبیر کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کا انکار اس مخصوص ہیئت اور خاص کیفیت کے ساتھ اور شغلی صفت کے ساتھ ذکر اللہ پر جمع ہونے کی وجہ سے تھا اور اسی کو انہوں نے بدعت ظلماء اور بدعت عظمیٰ اور ضلالت فرمایا ہے۔

وثالثًا لفظ قاص کے معنی لغت عربی میں بیان کرنے والا ہے عام اس سے کہ اچھی بات بیان کرے یا بری۔ ہاں عرف میں قاص قصہ گو کو کہتے ہیں عام اس سے کہ وہ اچھے قصے بیان کرے یا برے۔ لفظ قاص سے علی التعیین قصہ گو مراد لینا اور قصہ گو سے بے اصل قصہ گو مراد لینا عجیب منطق ہے۔ صاحب انوار ساطعہ قرآن کریم میں يَقُصُّ الْحَقَّ یا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ اور وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ وغیرہ کی طرف

دھیان کرتے تو ہرگز ٹھوکر نہ کھاتے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور بآواز بلند مسجد میں مل کر درود شریف پڑھنا درود شریف کا پڑھنا ایک بہت بڑی عبادت ہے مگر انفرادی طور پر اور آہستہ۔ چنانچہ مشہور فقیہ علامہ محمد بن محمد الخوارزمی المعروف بالبزازی الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) صاحب بزازیہ جہر بالذکر کا مسئلہ نقل کرتے ہیں:

عن فتاوی القاضی انه حرام لما صح عن ابن مسعودؓ انه اخرج جماعة من المسجد یھللون و یصلون علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم جھرًا وقال لھم ما اراکم الا مبتدعین۔ (شامی ج ۲ ص ۲۹۵) (فتاوی بزازیہ ج ۲ ص ۳۷۸ علی ھامش الھندیة)	قاضی صاحب کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ جہر سے ذکر کرنا حرام ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے صحیح ثابت ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے محض اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الٰہ الا اللہ اور بلند آواز سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتی تھی اور فرمایا کہ میں تمہیں بدعتی خیال کرتا ہوں

انقلاب زمانہ دیکھئے کہ آج جو شخص بلند آواز سے جماعت کے ساتھ مل کر درود شریف نہیں پڑھتا، اہل بدعت اس کو مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بلند آواز کے ساتھ مسجد میں جہر کے ساتھ درود شریف پڑھنے والوں کو مسجد سے نکال دیا اور فرمایا میرے نزدیک تم بدعتی ہو۔ فریق مخالف کو اس صحیح روایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

قارئین کرام نے حضرت ابن مسعودؓ کا فیصلہ تو ملاحظہ کر ہی لیا ہے۔ اب ذرا مولوی محمد عمر صاحب اچھروی کی بھی سُن لیجئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں: "فرقہ وہابیہ دیوبندیہ نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کو بدعت سمجھتے ہیں اور پڑھنے والے کو روکتے ہیں۔ اور احناف کی مساجد میں صلوٰۃ فریضہ کے بعد درود شریف کو بلند آواز سے لازمی پڑھا جاتا ہے۔ اب تم اپنے عقل سے فیصلہ کر لو کہ تم وہابی ہو یا حنفی اہلسنت" (مقیاس حنفیت ص ۶۱۲) مولوی محمد عمر صاحب اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور گریبان میں منہ ڈال کر خوف خدا کو دل میں رکھتے ہوئے اور قبر و آخرت کا نقشہ سامنے رکھ کر یہ فیصلہ خود صادر فرمائیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کے اس فیصلہ کے بموجب وہ سنی ہیں یا بدعتی؟ اور بلند آواز سے اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کو تم دل سے نیکی

وغیرہ بھی بدعت کہتے ہیں یا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی بدعت کہا ہے؟ جوش میں آکر جواب دیجئے۔ باقی خود کو اپنی طرف سے جنتی کہہ دینے سے کوئی جنتی نہیں بن جاتا۔ سچ ہے کہ ؎

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ روایت فریق مخالف کے ہاں بھی صحیح اور مسلم ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں: "چنانچہ حموی میں ہے فی فتاوی القاضی الجہر بالذکر حرام وقد صح عن ابن مسعودؓ انہ سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یہللون ویصلون علیہ الصلوٰۃ والسلام جہرا فراح الیہم وقال ما عہدنا ذلک علی عہدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وما اراکم الا مبتدعین فما زال یذکر ذلک حتی اخرجہم من المسجد۔ اور روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو فقط احداث بدعت جدیدہ کے لئے نہیں بلکہ بدیں وجہ کہ ممانعت کی کہ یہ ذکر جہر کا ان کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممانعت کے اور یہی ہم کہتے ہیں کہ جو احداث مخالف امر شارع کی ہو وہ ممنوع ہے الخ" (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۲۴۹)

الغرض علامہ قاضی خاں، امام بزازی، علامہ شامی اور علامہ حموی سب کے سب بزرگ حضرت ابن مسعودؓ کی اس روایت کو وقد صح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو صحیح کہتے ہیں اور خود صاحب انوار ساطعہ وقد صح کے الفاظ سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔ اگر امام سیوطیؒ کو اس کی سند معلوم نہیں ہو سکی جیسا کہ مباحثہ الفکر ص ۴۹ میں نقل کیا گیا ہے کہ اس اثر کی سند اور اس کے تخریج کا پتہ ہونا چاہئے تا کہ اس کی صحت اور ضعف کا حال کھلے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور صاحب روح البیان نے جو اس روایت کو ما وجد بوجہ اور افتراء کہا ہے (تفسیر روح البیان جلد ۲ ص ۱۲۲) تو ان کا قول سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔ وہ تو موضوع اور جعلی حدیثوں کو صحیح اور صحیح احادیث کو ضعیف کہہ جاتے ہیں۔ پھر حدیث کی تصحیح اور تضعیف ان کا مقام ہی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ محدثین اور صاحب بصیرت فقہاء کا کام ہے۔ صاحب روح البیان تو ایک صوفی مزاج مفسر ہیں جنہوں نے رطب و یابس سب کچھ تفسیر میں جمع کر دیا ہے (دیکھئے اکسیر ص ۲۶) اور انہوں نے جو یہ کہا ہے کہ یہ احداث بحیثیت جدیدہ کے لئے نہیں، یہ توجیہ بھی صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

ما عهدوا ذلك على عهده صلى الله عليه وسلم۔ کہ یہ طرز و طریق آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں و محفل میں موجود نہ تھا۔

ان کا یہ قول بعینہٖ صحیح ہے کہ یہ کیفیت اور احداث ہیئت جدیدہ آپ کے زمانہ مبارک میں نہ تھی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس مخصوص طریقہ سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ خود حضرت ابن مسعودؓ کی پیش کردہ دلیل کو چھوڑ کر ذکر بالجہر سے منع کی عام روایتوں کو اس کی دلیل بنانا جیسا کہ صاحب انوار ساطعہ ص۲۸ میں آیت کریمہ وَادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اور حدیث اربعوا على انفسكم انكم لا تدعون اصم ولا غائبا کو نقل کر کے کہتے ہیں، اس سے بعض صحابہ سمجھے کہ ذکر جہر منع ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ذاکرین کو منع فرمایا اور یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے جو کسی طرح سے صحیح نہیں ہے۔ خیر یہ مؤلف صاحب انوار ساطعہ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مسجد میں باجماعت کے ساتھ مل کر درود شریف پڑھنے اور ذکر بالجہر کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف سمجھتے تھے۔ کاش کہ اہل بدعت اس سے کچھ عبرت حاصل کرتے۔ باقی امام احمدؒ کی کتاب الزہد کے حوالہ سے حضرت ابو وائل تابعیؒ کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود ذکر کرنے سے منع کرتے تھے میں تو جب بھی حضرت عبد اللہؓ کی مجلس میں جا کر بیٹھا ان کو ذکر اللہ کرتے ہوئے ہی پایا (تجرید الایمان)۔ تو یہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کی جہر سے ممانعت والی روایت کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ ذکر اللہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کا ذکر قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے اور یہ ایک بہت بڑی عبادت اور طاعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجتماعی صورت میں اور وہ بھی مسجد میں جہر سے ذکر کرنا اور اسی ہیئت کے ساتھ جہر سے درود شریف پڑھنا حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے ثابت ہے یا وہ اس کو منع کرتے اور اس کو بدعت سمجھتے ہیں؟ آپ نے صحیح روایات سے یہ معلوم کر لیا کہ وہ ان دونوں کو بدعت اور ان پر عمل کرنے والوں کو بدعتی سمجھتے ہیں اور ان کا وجود مسجد میں گوارا نہیں کرتے اور فوراً ان کو مسجد سے باہر نکال دیتے ہیں۔ فریق مخالف از راہ دیانت یہ فرمائے کہ مسجدوں میں اجتماعی شکل میں جہر سے ذکر اور درود شریف پڑھنے والوں کو منع کرنے سے ہم ہی وہابی ہوتے ہیں یا حضرت عبد اللہؓ بن مسعود

کو بھی اس مبارک فتویٰ سے کچھ حصہ نصیب ہو سکتا ہے۔ جناب شیخ سعدی کا کہنا ہو گا ؎

سعی ناکردم کہ ایں ممکن آں کن مصلحت بیں و کار آساں کن

حضرت ابن مسعودؓ کا مقام جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے ایسے جزوی فضائل اور مناقب حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جس چیز کو تمہارے لئے ابن مسعودؓ پسند کرتے ہیں میں بھی تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں اور اس پر راضی ہوں۔ (مستدرک ج ۳ ص۳۱۹) اور نیز ارشاد فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے لئے عبد اللہؓ بن مسعود ناپسند کرتے ہیں میں بھی اس چیز کو تمہارے لئے پسند نہیں کرتا۔ (الاستیعاب ج ۱ ص۳۷۳) ۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ حضرات خلفاء راشدینؓ سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم ج ۲ ص۲۹۳)

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں درجہ اوّل کے مفسر جن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلی اعتماد حاصل ہے۔ وہ اس اجتماعی صورت میں ذکر بالجہر کرنے اور مل کر بلند آواز کے ساتھ درود شریف پڑھنے والوں کو بدعتی سمجھتے ہیں اور اس فعل کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو یہ فعل پسند نہیں تو سابق روایت کے پیش نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ فعل ہرگز پسند نہیں۔ اب جس کا جی چاہے ان کی پیروی کرے یا کسی اور کی۔ ع ہے اپنا اپنا امام اپنا اپنا۔

بالکل تنہائی میں یا تعلیم کی خاطر ذکر بالجہر کا معاملہ الگ ہے۔ راقم نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب حکم الذکر بالجہر میں کر دی ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ: حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عروہؒ بن الزبیرؓ دونوں مسجد میں داخل ہوئے:

فاذا عبد اللہ بن عمرؓ جالس الی حجرۃ تو دیکھا کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے

عائشہؓ والناس یصلون الضحیٰ فی المسجد فسألناہ عن صلوٰتھم فقال بدعۃ ۔ (بخاری ج۱ ص۲۳۸ ، مسلم ج۱ ص۴۰۹)

پاس بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے ان لوگوں کی نماز کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بدعت ہے ۔

چاشت کی نماز صحیح اسانید کے ساتھ متعدد حضرات صحابہ کرامؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے لیکن چونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں اجتماعی حیثیت سے خاص اہتمام اس کے لئے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ کیف ما اتفق جہاں جہاں بھی کوئی ہوتا تھا وہیں ہی وہ نماز چاشت پڑھ لیتا تھا۔ اور یہ نفلی نماز ہے اور نفل نماز کو بجائے مسجد کے گھر میں پڑھنے کی زیادہ فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے مگر حضرت ابن عمرؓ نے جب لوگوں کو اس نماز کے لئے مسجدوں میں اجتماع اور خاص اہتمام دیکھا۔ تو ان کے اس فعل کو انہوں نے بدعت قرار دیا۔ چنانچہ اسی روایت کی شرح میں حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں :

مرادہ ان اظہارھا فی المسجد والاجتماع لھا ھو بدعۃ لا ان اصل صلوٰۃ الضحیٰ بدعۃ ۔ (نووی شرح مسلم ج۱ ص۲۴۹)

حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ چاشت کی نماز کو مسجد میں ظاہر کرکے پڑھنا اور اس کے لئے اجتماع اور اہتمام کرنا یہ بدعت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ مراد نہیں کہ اصل سے چاشت کی نماز ہی بدعت ہے ۔

تہجد کی نماز کی بہت بڑی فضیلت حدیثوں میں آئی ہے اور یہ بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی ہے ۔ لیکن اگر اس کے لئے بھی خصوصیت سے اہتمام اور اجتماع کیا گیا تو وہ بھی مکروہ ہوگا ۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک ایسے ہی فرقہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" نماز تہجد را بجماعت میگزارند از اطراف و جوانب در آں وقت مردم از برائے نماز تہجد جمع می گردند و بجمعیت تمام ادا می نمایند و ایں عمل مکروہ است بکراہت تحریمیہ از فقہاء کہ تداعی شرط کراہت داشتہ اند جواز جماعت نفل را مقید بجانبہ مسجد ساختہ زیادہ از سہ کس

نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں اطراف و جوانب سے اس وقت لوگ نماز تہجد کے لئے جمع ہوتے ہیں اور تمام اہتمام سے اس کو ادا کرتے ہیں اور یہ عمل مکروہ ہے اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے حضرت فقہاء کی ایک جماعت تداعی اور اہتمام کی شرط لگا کر کہتی ہے اور نفل نماز کے باجماعت ادا کرنے کو

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: اتباع وے ہی باید کرد بسیار امرے محمود کہ در حد ذات فضیلت دارد اما تخصیص مقام وارد نشدہ و درست نیامدہ چنانچہ مصافحہ بعد از نماز و امثال آن۔ (اشعۃ اللمعات) نیز لکھتے ہیں کہ: آنکہ بعضے مردم مصافحہ میکنند بعد از نماز یا بعد از نماز جمعہ چیزے نیست و بدعت است از جہت تخصیص وقت۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۲۰)۔

اگرچہ اپنے مقام پر مصافحہ اور معانقہ سنت ہے مگر چونکہ ہر نماز کے بعد اور اسی طرح نماز جمعہ کے بعد اس کا ثبوت نہیں لہٰذا یہ بدعت ہے۔ متعدد کتابوں میں اس مصافحہ کی تردید کی گئی ہے مثلاً التوشیح، للعلامہ طیبیؒ، ملتقط، ایضاح المطالب، منحۃ الطالبین، خلاصۃ الفقہ، کافی، حقائق، ابن نجیم، شامی، قاسمی، حاشیۃ المصابیح، مجالس الابرار، مدخل، فتاوی ابن حجر وغیرہ (دیکھئے المجد ص ۱۳۱)۔

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں:

يكره المصافحة بعد اداء الصلوة على كل حال لانها من سنن الروافض وهكذا الحكم في المعانقة۔ (انتہیٰ) بحوالہ المجد ص ۱۳۱

نماز سے فارغ ہو چکنے کے بعد مصافحہ کرنا ہر حالت میں مکروہ ہے کیونکہ یہ رافضیوں کی سنت ہے اور یہی حکم معانقہ کا ہے۔

باقی امام نوویؒ نے جو کتاب الاذکار میں اس مصافحہ کو لا بأس بہ کہا ہے تو یہ ان کی غلطی ہے چنانچہ ملا علی القاریؒ اور ابن امیر الحاجؒ نے امام نوویؒ کی شرح و بسط سے تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مصافحہ بدعت ہے۔ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں:

لا دليل في الشرع يدل على تخصيص تلك الاوقات بها بل هي مكروهة والاعتصام ج ۲ ص ۲۰

شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے ان اوقات کے اندر مصافحہ کی تخصیص ثابت ہوتی ہو بلکہ یہ مصافحہ مکروہ ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ احکام عامہ سے امورِ خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں ہے، تاوقتیکہ ان کی تخصیص کے لئے کوئی الگ اور مستقل خاص دلیل موجود نہ ہو کیونکہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں، مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عمومات کو اس طرح سے خصوص کے قالب میں ڈھال دینا، یہی احداث فی الدین اور منصب تشریع پر دست اندازی ہے۔ امام غزالیؒ نے

کیا خوب کہا ہے:

فالتقييد في المطلقات التي لم يثبت بالدليل الشرع تقييدها رأي في التشريع (الاعتصام ج ۲ ص ۳)
کہ ان مطلقات کو مقید کرنا کہ جن کی تقیید شریعت سے ثابت نہیں ہے شریعت میں اپنی رائے کو دخل دینا ہے۔

دلائل شرعیہ کی موجودگی میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم ہیں خصوصاً جبکہ ان میں اجتہاد اور تفقہ کی صحیح صلاحیت اور اہلیت بھی موجود نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تقولوا لما تصف ألسنتكم الكذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب (النحل ع ۱۵)
اور مت کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔

حافظ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ويدخل في هذا كل من ابتدع بدعة ليس له فيها مستند شرعي او حلل شيئا مما حرم الله او حرم شيئا مما اباح الله بمجرد رأيه وتشهيه (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۹۱)
کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے بلا دلیل شرعی کے کوئی بدعت گھڑی یا محض اپنی رائے اور خواہش سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال یا حلال کی ہوئی کو حرام کر دیا۔

علامہ آلوسیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے معنی کا حاصل یہ ہے کہ امام عسکریؒ نے صراحت کی ہے کہ تم اس چیز کو حلال و حرام مت کہو جس کی حلت و حرمت خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق سے ثابت نہ ہو ورنہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہنے والے ہو جاؤ گے۔

ولا تصفوا الحل والحرمة ليس لكم فيه حجة من الله (روح المعانی ج ۱۴ ص ۲۴۷)
کیونکہ ان کی صراحت کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے۔

اور یہی حال ہے زمانہ حال کے مبتدعین کا کہ وہ ہر بات کو اپنی نارسا عقل سے ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ کی باطل تاویلات کر کے خود بھی گمراہ ہوتے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور وہ بدعت کو رواج دے کر اس سنت کو مٹانے کے درپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

سيلي امورکم بعدي رجال يطفئون السنة
میرے بعد کچھ لوگ تمہارے امور کے سربراہ بنیں گے وہ

باب السنۃ — رواہ ابن ماجہ (جامع العلوم والحکم ص۲۳۲) بدعت سے سنت کو مٹا دیں گے۔

اور یہی اہلِ بدعت کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اور عقل کو مقدم رکھ کر دخل دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا گناہ اور عیب ہے؟ اس میں کیا قباحت ہے؟ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر انہوں نے مطلقاً غور نہ کیا کہ اگر ایک چیز مطلق جائز ہے تو قید لگانے سے شاید وہ جائز نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے مگر بحالت رکوع و سجود پڑھنا منع ہے (مسلم شریف ج ۱ ص۱۹۱ وغیرہ)۔ غیر محرم عورت سے نکاح تو جائز ہے مگر اس صورت میں کہ اس کی بہن یا خالہ یا پھوپھی یا بھانجی پہلے نکاح میں موجود نہ ہو۔ اپنی بیوی کے ساتھ جماع تو جائز ہے مگر بقید حیض حلال نہیں ہے۔ اور گندم وغیرہ تو حلال ہے مگر بقید چوری حرام ہے۔ کہاں تک اس قاعدہ کو لکھا اور بیان کیا جائے۔ الغرض اہلِ بدعت کی یہی اصولی غلطی ہے کہ وہ احکامِ عامہ سے امورِ خاصہ ثابت کرنے کی بے جا سعی کرتے ہیں۔

صاحب انوارِ ساطعہ کا ایک مغالطہ مولوی عبد السمیع صاحب نے زرقانی، ابن ابی شیبہ، عبد الرزاق اور فتح الباری وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ چاشت کی نماز کو بدعتِ حسنہ فرماتے تھے لہٰذا حضرت ابن عمرؓ کا انکار مانعین کے لئے مفید نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں: "پس معنی بدعت ثابت کرنے والوں کا ثابت اور رد کرنے والوں کا رد ہو گیا" (ملخصاً انوار ساطعہ ص۳۸)۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انوارِ ساطعہ نے اصل بات پر غور ہی نہیں کیا ورنہ وہ ہرگز یہ غلطی کا شکار نہ ہوتے۔ حضرت مجاہدؒ کی روایت جو بخاری اور مسلم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے، اس میں سوال چاشت کی نماز کے بارے میں نہیں ہے کہ آیا وہ بدعت ہے یا سنت۔ بدعتِ حسنہ ہے یا سیئہ؟ وہاں یہ مذکور ہے کہ پوچھنے والوں نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ پوچھا ہے کہ یہ جو لوگ مسجد میں اجتماعی شکل میں نماز پڑھتے ہیں، ان کی یہ نماز کیسی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے یہ فرمایا کہ یہ بدعت ہے اور اس بدعت کو وہ حسنہ سے مقید نہیں کرتے۔ اور مطلق بدعت سے بدعتِ سیئہ ہی مراد ہوتی ہے۔ ہاں نفسِ چاشت کی نماز کو وہ بدعتِ حسنہ فرماتے ہوں تو جدا بات ہے۔ الغرض اثبات اور چیز کا ہے اور نفی اور چیز کی ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ کو بھی بالآخر یہ بات تسلیم کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"اور بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ اصل نماز پر ان کا انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک بدعت حسنہ، افضل و احسن کام تھا، اس پر کس طرح انکار فرماتے۔ بلکہ اگر انہوں نے انکار کیا ہے تو اس بات پر کیا ہے کہ لوگ اس کو نماز فرائض کی طرح جمع ہو کر اہتمام سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ اور یہ بات خلاف اصل تھی"۔ (بلفظہ انوار ساطعہ ص۲۳)

یہیں ہم کہنا چاہتے ہیں کہ جس عبادت کو شریعت مطہرہ نے کسی خاص کیفیت اور مخصوص ہیئت کے ساتھ مقید نہیں کیا، اور اس کے لئے کسی خاص اہتمام اور اجتماع کی ترغیب نہیں دی تو یقیناً یہ مخصوص طرز و طریقہ بدعت ہوگا۔

حضرت نافعؒ (المتوفی ۱۱۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

ان رجلا عطس الی جنب ابن عمرؓ فقال الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ فقال ابن عمرؓ وانا اقول الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ ولیس ھکذا علمنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمنا ان نقول الحمد للہ علی کل حال۔ (ترمذی ج۲ ص۹۸ وسندہ صحیح و مشکوٰۃ ج۲ ص۴۰۶)

ایک شخص نے حضرت ابن عمرؓ کے پہلو میں چھینک مارا، اس شخص نے کہا الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اس کا تو میں بھی قائل ہوں کہ الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ لیکن یوں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم کو تعلیم نہیں دی بلکہ اس موقع پر ہم کو تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد للہ علی کل حال کہا کریں۔

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے مگر اس موقع پر والسلام علی رسول اللہ کے الفاظ کی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں دی۔ پوچھئے حضرت ابن عمرؓ سے کہ آپ نے درود و سلام سے کیوں منع کیا اور والسلام علی رسول اللہ کے الفاظ آپ کو کیا تکلیف دہ ہوئے ہیں؟ کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا بھی گناہ ہے؟ بے موقع اور بے محل درود و سلام سے تو وہابی منع کیا کرتے ہیں آپ اس زمرہ میں کیسے شامل ہوگئے؟ مگر وہ تو سراپا مطیع رسول تھے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور درود و سلام کے موقع اور محل کو خوب جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس سے منع کیا۔

مولوی عبد السمیع صاحب حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ درمختار کی

کتاب الشمائل میں ہے موطنان لا اذکر فیہما عند العطاس وعند الذبح - پس السلام علی رسول اللہ کہنا اس کا مقابل نہیں ہے واقع ہوا تھا - پھر اتفاق امر جزوی ہے کہ کس طرح وہ رضی اللہ عنہ منع فرماتے۔ امورِ سنیہ کو تو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ (بلفظہ۔ انوار ساطعہ ص ۱۸۱)

جواب: قطع نظر اس سے کہ یہ روایت کیسی ہے۔ عرض یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کا یہ جواب ہرگز نہیں اور یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے کیونکہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عطاس (چھینک) کے وقت اپنا نام مبارک لینے سے منع کیا ہے اس لئے میں تجھے اس سے روکتا ہوں۔ بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اسے تمہیں یوں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہمیں صرف الحمد للہ کی تعلیم دی ہے اور والسلام علیٰ رسول اللہ چونکہ اس پر زائد ہے اس لئے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ یہ حدیث اس امر کی سند اور دلیل ہے کہ جو امر شریعت میں ثابت ہوا اس پر زیادہ کرنا منع ہے۔ حضرت ابن عمرؓ موطنان لا اذکر اللہ سے استدلال نہیں کرتے جیسا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے غلطی کھائی ہے۔

حضرت سالمؓ بن عبید (المتوفی [illegible]ھ) کے پاس ایک شخص نے چھینک ماری اور:

فقال السلام علیکم فقال لہ سالم وعلیک و علی امک فکان الرجل وجد فی نفسہ فقال اما انی لم اقل الا ما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ الحدیث

یہ کہا۔ السلام علیکم، حضرت سالمؓ نے جواب دیا۔ تم پر اور تمہاری ماں پر۔ اس جملے سے وہ شخص ناراض ہو گیا۔ حضرت سالمؓ نے کہا۔ بہر حال میں نے صرف وہی کچھ کہا ہے جو حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ (مختصر)

(ترمذی ج ۲ ص ۹۸ - ابو داؤد ج ۲ ص ۳۲۹ - مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۰۶ - موارد الظمآن ص ۴۸۲)

اس روایت کے پیش نظر مولوی عبد السمیع صاحب نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ وہ انکار اس لئے تھا کہ وظیفہ معینہ شرعی کا جو الحمد للہ تھا، اس نے چھوڑ کر تحیت ملاقات کا وظیفہ اس کی جگہ قائم کیا تھا یہ

لے خان صاحب بریلوی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ حدیث ثابت نہیں (ملفوظات حصہ دوم ص ۸۴) اور علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ ولا یصح (المقاصد الحسنہ ص ۱۹۱) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

تشریع جدید اور تبدیلی دین ہے" (ملخصاً الواز ساطعہ ۱۵۲) بس ہم بھی اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیز شریعت مطہرہ نے جس جگہ رکھی ہے، اُس کو اُسی جگہ رہنے دو۔ نہ مطلق کو مقید کرو اور نہ مقید کو مطلق نہ عام کو خاص کرو اور نہ خاص کو عام۔ غیر مؤقت کو کیفیت اور ہیئت مخصوصہ کی زنجیر میں نہ جکڑو جس کو اجتماعی صورت میں کرنے کا حکم نہیں دیا گیا اس کو مجتمع ہو کر نہ کرو اور جس کو بآواز بلند کرنے کا حکم شریعت نے نہیں دیا، اس کو بلند آواز سے ادا نہ کرو۔ اور غیر معین یا لاوقت کو کسی وقت کے ساتھ خاص نہ کرو۔ کیونکہ یہ تشریع جدید اور تبدیلی دین ہے، جس کا نام بالفاظ دیگر بدعت ہے اور اہل السنت والجماعت کا دامن اس قبیح ترین حرکت سے یقیناً پاک ہے۔

حضرت مجاہدؒ (المتوفی ۱۰۳ھ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا۔ اذان ہو چکی تھی۔ ایک شخص نے تثویب شروع کر دی (ابن ابی شیبہ مجاہد کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مؤذن نے اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کے الفاظ سے تثویب کی، اور لوگوں کو نماز کی دعوت دی تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ تو پاگل ہے، تیری اذان میں جو دعوت تھی کیا لوگوں کو بلانے کے لئے وہ کافی نہ تھی؟) حضرت ابن عمرؓ نے مجاہدؒ سے فرمایا:

اخرج بنا فان هذه بدعة (ابوداؤد ج ۱ ص ۷۹) مجھے یہاں سے لے چل اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔

حضرت ابن عمرؓ اس مسجد سے چلے گئے اور نماز تک وہاں ادا نہ کی۔ چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

اخرج بنا من عند هذا المبتدع ولم یصل فیه (ترمذی ج ۱ ص ۲۸) مجھے اس بدعتی کے ہاں سے لے چل۔ اور اس مسجد میں نماز نہ پڑھی۔

حضرت ابن عمرؓ کی آخر عمر میں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس لئے آپ نے اپنے قائد سے فرمایا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے بدعت اور اہل بدعت سے کیسی نفرت کی کہ انہوں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھنی بھی گوارا نہ کی۔ آج کل کا دور ہوتا تو لوگ یہ کہہ دیتے کہ تثویب نے کسی کو گالیاں تو نہیں دیں بلکہ وہ نماز جیسی بہترین عبادت کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے، اور الدال علی الخیر کفاعله بھی ایک مسلّم امر ہے، مگر حضرات صحابہ کرامؓ تو رمز شناس رسول تھے۔ ان کی دور رس نگاہیں بدعات کی

ظاہری مجلس میں انہیں نہیں سنائی جاتی تھیں۔ وہ ہدایت کے اصل منبع اور سرچشمہ تک رسائی کر لیتی تھیں۔

امام نوویؒ شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

روی ان علیاً رأی مؤذناً یثوب فی العشاء فقال اخرجوا هذا المبتدع من المسجد وعن ابن عمرؓ مثله (مجموعہ العراقی بیان تثویب ج۱ ص۱۰۶)

تو حضرت علیؓ نے ایک مؤذن کو عشاء کی نماز کے لیے تثویب کرتے دیکھا اور فرمایا اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔ اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔

علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ سلف صالحینؒ نے جن بدعات کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک تثویب بھی ہے۔ (الاعتصام ج۲ ص۲۲) کتب فقہ میں جس تثویب کا ذکر ہے وہ قاضی وغیرہ مشغول حضرات کو آگاہ کرنے اور توجہ دلانے کے لیے ہے نہ کہ درود شریف پڑھنا اور مؤذن کی طرح بلند آواز سے چلانا۔

حضرت علیؓ: حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) سے ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔

ان رجلا یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰة العید فنهاه علیؓ فقال الرجل یا امیر المؤمنین انی اعلم ان الله تعالیٰ لا یعذب علی الصلوٰة فقال علیؓ وانی اعلم ان الله تعالیٰ لا یثیب علی فعل حتی یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم او یحث علیه فتکون صلوٰتک عبثا والعبث حرام فلعله تعالیٰ یعذبک به لمخالفتک لرسوله صلی الله علیه وسلم (شرح مجمع البحرین کذا فی مجموعہ فتاوی ج۱ ص۱۱۹ ونظم البیان ص۸۲)

ایک شخص نے عید کے دن نماز عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علیؓ نے اس کو منع کیا۔ اس نے کہا۔ اے امیر المؤمنین! میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر سزا نہ دے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جب تک کہ اس فعل کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کیا نہ ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو۔ پس تیری یہ نماز فعل عبث ہوگی اور فعل عبث حرام ہے اور شاید کہ تجھے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے سزا دے۔

حضرت علیؓ کی یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نماز عید سے قبل کوئی نفل نماز ثابت نہیں۔ نہ آپ نے فعلاً ادا کی اور نہ قولاً اس کی ترغیب دی۔ اس لئے یہ فعل عبث ہے اور فعل عبث حرام ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز جیسی اہم اور بہترین عبادت پر بھی شخص کو اس لئے سزا دے کہ اس کے پیارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے یہ ثابت نہیں اور آپ نے اس کی

ترغیب بھی نہیں دی۔ آج کل کے مفتی اس وقت ہوتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت علیؓ پر کیسے کیسے فتوے لگاتے کہ وہ نماز جیسی عبادت سے منع کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

صاحب انوار ساطعہ اصولی طور پر اس روایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: "واضح ہو کہ یہ منع فرمانا فقط اسی باعث سے نہ تھا کہ نماز اس وقت میں آپ سے منقول نہیں ہے اور جب منقول نہیں تو بدعت ٹھہری جیسا کہ فریق ثانی مغالطہ میں پڑا ہے۔ بلکہ منع فرمانے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک دلیل ہے جس پر علماء حنفیہ کا عمل ہے یعنی صریح نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ شرح مجمع میں ہے روی انه علیه السلام قال لا صلوٰة فی العیدین قبل الامام۔ یہی ہمارا دعویٰ ہے کہ احداث اس شے کا منع ہے جو امر و نہی شارع کے خلاف ہو الخ" (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۱۳۶)۔ صاحب انوار ساطعہ اتنی بات تو صراحت سے تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے نماز عید سے قبل ایک شخص کو نفل نماز پڑھنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کے منع کرنے کی وجہ دلیل شرح مجمع سے نقل کرتے ہیں کہ چونکہ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح نہی کے خلاف تھی اس لئے حضرت علیؓ نے اس سے منع کیا۔ یہ غلط ہے اور توجیہ القول بما لا یرضی به قائله کا مصداق ہے۔ سوال یہ نہیں کہ عید سے قبل نفل نماز کی ممانعت پر حضرات فقہاء احناف کے پاس کونسی دلیل ہے؟ اور آیا وہ دلیل آپ کا قول ہے یا عدم فعل؟ اور وہ اپنے مقام پر کسی صحیح سند سے ثابت ہے یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ نے اس شخص کو نماز عید سے قبل نفل نماز پڑھنے سے منع کرنے پر کونسی دلیل پیش کی ہے۔ صاحب انوار ساطعہ نے اس پر مطلقاً غور نہیں فرمایا۔ حضرت علیؓ نے اس منع کی دلیل صرف یہ پیش کی ہے:

وانی اعلم ان الله تعالیٰ لا یثیب علی فعل حتی یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم او یحث علیه۔

اور میں یقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دیگا جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو نہ کیا ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو۔

حضرت علیؓ کا یہ قول کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ارشاد اس امر کی غیر مبہم اور صاف دلیل

ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو نماز سے اس لئے منع کیا تھا کہ ان کے نزدیک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل سے یہ نماز ثابت نہ تھی اور اس کی ترغیب پر آپ کا کوئی قول بھی موجود نہ تھا۔ صاحب انوارِ ساطعہ کا وطیرہ بھی عجیب ہے۔ وہ خود قائل کی اپنی پیش کردہ دلیل کو ملاحظہ نہیں فرماتے اور گھر کی دلیل کو چھوڑ کر پڑوس سے دلائل تلاش کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ مگر یہ تو دلائل کا مقام ہے خورد و نوش کا محل نہیں۔ یہاں غور و فکر اور اس کے ساتھ انصاف درکار ہے ؎

ان مسائل میں ہے کچھ شدتِ نگاہی درکار ۔ یہ حقائق ہیں تماشائے لبِ بام نہیں

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ : حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے حضرت طاؤسؒ تابعی کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا (اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ نفل دو رکعت تھی) تو انہوں نے ان کو منع کیا حضرت طاؤسؒ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے کی نہی کی روایت کی تاویل پیش کی۔ حضرت ابن عباسؓ نے سخت لہجہ میں ارشاد فرمایا :

ما أدری أیعذب أم یؤجر لأن الله تعالیٰ یقول وما کان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضی الله ورسوله أمرًا أن یکون لهم الخیرة ۔ (مستدرک [illegible] قال الحاکم والذہبی علیٰ شرطہما)

میں نہیں جانتا کہ اس کو اس نماز پر سزا دی جائے گی یا اجر ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اپنے خیال کو اس میں جگہ دیں۔

اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح قولی نہی کی خلاف ورزی پر حضرت طاؤسؒ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ جیسے آپ کے قول کی مخالفت گناہ ہے اسی طرح آپ کے عدمِ فعل کی مخالفت میں بھی کوئی ثواب نہیں بلکہ وہ بھی جرم ہی ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے خلافِ سنت نماز پڑھنے پر بھی طاؤسؒ کو سزا کا مستوجب گردانا ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؒ : اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعتیں پڑھا کرتا تھا۔ اس نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے دریافت کیا کہ :

یا أبا محمد أیعذبنی الله علی الصلوة قال لا

اے ابو محمدؒ کیا مجھے اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے کی وجہ سے سزا دیگا؟

ولکن یعذبک بخلاف السنۃ ۔ حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ نہیں لیکن تجھے خدا تعالیٰ
(مسند دارمی صلا) سنت کی مخالفت کی وجہ سے ضرور سزا دے گا ۔

حضرت سعید بن المسیبؒ گویا یہ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ نفسِ نماز پر اللہ تعالیٰ کسی کو سزا نہیں دیگا کیونکہ وہ ایک عبادت ہے مگر ایسی نماز پر جس میں سنت کی خلاف ورزی ہو اللہ تعالیٰ ضرور سزا دے دیگا ۔

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص : حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (المتوفی ۵۱ھ) کو کسی ختنہ میں دعوت دی گئی تو انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان سے اس انکار کی وجہ دریافت کی گئی، تو صاف الفاظ میں یہ جواب ارشاد فرمایا کہ :

انا کنا لا ناتی الختان علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا ندعی لہ (مسند احمد ج ۴ ص۲۱۷) ہم لوگ زمانہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ختنوں میں نہیں جایا کرتے تھے اور نہ اس کیلئے ہمیں دعوت دی جاتی تھی

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص بھی اسی قاعدہ سے کام لے رہے ہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ختنوں میں بلائے جانے کا دستور نہ تھا اور نہ لوگوں کو دعوتیں موصول ہوا کرتی تھیں اس لئے میں بھی اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ختنوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے اور اس سے نہی فرمائی ہے لہٰذا میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابن عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بن ابی العاص وغیرہ جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ نے نماز جیسی بہترین عبادت اور ذکر جیسی اعلیٰ قربت اور درود شریف جیسی عمدہ طاعت وغیرہ کو مخصوص کیفیت اور خاص ہیئت اور پابندئ وقت کے ساتھ ادا کرنے سے محض اس لئے منع کیا کہ اس طرز و طریقہ سے یہ کام جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں کئے اور ان کی ترغیب بھی نہیں دی اور آپ کے عہد مبارک میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہ امور بدعت ہیں اور معمولی بدعت بھی نہیں، بلکہ بدعت منکر اور بدعت ظلماء ہیں بلکہ ضلالت بھی ہیں اور گمراہی بھی ہیں اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا ۔ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک کل وہی عمل

ہوگا جو اخلاص اور اتباعِ سنت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہو، اگرچہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو، اور وہ عمل بالکل رائیگاں ہوگا جو دیکھنے میں تو بہت زیادہ نظر آئے لیکن اس میں اخلاص اور اتباعِ سنت نہ پائی جاتی ہوں اور بدعت موجود ہو۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر ایسی ہی خوب ارشاد فرمایا۔ ایک روایت آئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں کسی نے نذر مانی کہ اگر عبدالرحمٰنؓ کے بچہ پیدا ہوا تو ہم (عقیقہ میں) ایک اونٹ ذبح کریں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:

لا بل السنة افضل عن الغلام شاتان مكافئتان وعن الجارية شاة۔ (مستدرک ج۴ ص۲۳۸ قال الحاکم والذہبی صحیح)

نہیں، بلکہ سنت ہی افضل ہے دو بکریاں لڑکے کی طرف سے اور لڑکی کی طرف سے (عقیقہ میں) ایک بکری ہی کافی ہے۔

اونٹ اور دو بکریوں کی قیمت اور گوشت کا اگر موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا مگر حضرت عائشہؓ بکریوں کے بجائے اونٹ پر محض اسلئے راضی نہیں کہ انکے نزدیک سنت کا شرف ہے، ایسے ہی اگر اسکی قیمت یا گوشت زیادہ ہے تو پھر بھی اسکی چنداں قدر نہیں ہے، سنت ہی افضل ہے اور اسکی پابندی لازم ہے۔ جمہور اونٹ اور گائے کا عقیقہ بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث الطبرانی فی الصغیر ص۲۵ میں ہے: یعق عنه من الابل والبقر والغنم (دیکھئے فتح الباری ج۹ ص۵۹۳ و نیل الاوطار ج۵ ص۱۳۶)

بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل | دنیا کی ہر حکومت نے اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین مرتب کئے ہوتے ہیں اور ان پر عمل کرانا نہایت ضروری ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی کو کوئی حکومت گوارا نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکتِ پاکستان یا ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کے نوٹ چھاپنا چاہے تو یہ ایک جرم ہوگا اور حکومت ایسے شخص پر مقدمہ چلائے گی۔ اگر پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی امریکہ وغیرہ کسی غیر ملکی فوج کی وردی اور یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے تو اس کا حشر سب کے سامنے ہے۔ غیر ملکی وردی اور یونیفارم کی تو بات ہی جانے دیجئے، اگر کوئی فوجی سپاہی کسی کمانڈر کی وردی میں حاضری دے تو اس کا انجام بھی مخفی نہیں ہے۔ الغرض جس محکمہ کے لئے جو لباس، وضع قطع، وردی اور یونیفارم حکومتِ وقت متعین کرے اس کی پابندی لازم ہوگی

کیا مجال کہ کوئی اس کی مخالفت کر سکے۔ دوسری طرح کوئی شخص ریلوے ٹکٹ کی جگہ چونگی رقم کا ڈاک خانہ کے محکمہ کا منظور شدہ ٹکٹ دے کر کامیاب نہ ہوگا۔ اور دس پیسے کے کارڈ پر بیس روپے کا ریلوے ٹکٹ لگانا بے کار ہوگا۔ پھر کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعین کئے ہوئے طریق عبادات میں اپنی طرف سے تغیر روا رکھا جائے اور اس پر گرفت بھی نہ ہو۔ خدائی حکومت نہ ہوئی اندھیر نگری ہوئی (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔ دور نہ جائیے ہمارے روزمرہ کے معمولات میں یہ ہے کہ درزی اور موچی کو اپنے لباس اور پاپوش کا ناپ اور تصریح دیتے ہیں۔ اگر ایک گرہ اور ایک انچ بھی ہمارے حساب سے اوپر نیچے ہو جائے تو ہم وہ لباس اور جوتا درزی اور موچی کے سر پر دے مارتے ہیں کہ یہ ہمارے پیمانے پر پورے نہیں اترتے۔ کپڑا بھی وہی ہو جو ہمیں پسند تھا، اور کپڑا بھی وہی ہو جو ہمیں مرغوب تھا مگر چونکہ وہ ہمارے معیار سے کم یا زیادہ، ہم ان کو کبھی لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس درزی اور ناپ وغیرہ میں کسی طرح کی کمی بیشی ہم گوارا نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال کا ایک معیار، ہمارے افعال کا ایک مقیاس اور ہماری زندگی کا ایک نمونہ بتایا ہے، اور وہ اُسوۂ رسول، سیرت رسول اور اتباع رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔ اور حضرات صحابہ کرام وتابعین اور تبع تابعین اسی نمونہ پر صحیح اترنے والے ہیں۔ اسی اسلامی یونیفارم اور اس اتباع سنت کی موجودگی کے خلاف تمام قبیح بجملہ رسوم اور ہر قسم کی بدعات خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کامل و مکمل آئین اور نظام میں مردود ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے والا کوئی بھی شخص کسی طرح حقیقی نجات و فلاح کا مستحق نہیں ہے۔

الحاصل نہ تو کوئی حکومت زندگی کے کسی شعبہ میں رعایا کو اپنی خواہش اور مرضی پر چھوڑتی ہے اور نہ ہم اپنے مزدوروں اور اجیروں کو ان کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ شریعت اسلامی ایسے اعمال اور عبادات ہم سے قبول کرے، جو اس کے بتلائے اور متعین کئے ہوئے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

سنت اور بدعت کے مقام اور اس کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے کے لئے یہ چند حروف بھی

کافی ہیں۔ ہاں البتہ زمانے والے کے لئے دفتر کے دفتر بھی بالکل بیکار ہیں۔ سُنّت کو (جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قول و عمل ہے) اگر اصلی شکل و صورت میں محفوظ رکھا جاسکے، تو وہی قیمتی موتی ہے اور اس کی قیمت دنیا و مافیہا کے خزانے بھی پوری نہیں کر سکتے ؎

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

کیا بدعات میں کوئی خوبی اور ان پر دلائل بھی پیش کئے جاتے ہیں؟

دنیا میں شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس میں اس کی خرابی کے باوجود اس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ شراب اور جوئے جیسی بدترین چیز کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے:

فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ ان دونوں میں گناہ بڑا ہے اور لوگوں کیلئے ان میں کچھ منافع بھی ہیں۔ (پ۲ - بقرہ رکوع ۲۷)

یہ ٹھیک ہے کہ ان میں گناہ بہت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں قلیل منافع کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان قلیل منافع کی وجہ سے ان کو جواز کا درجہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مضرات اور منفعت کے پہلو کو غالب قرار دے کر ان کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا گیا اور اکبر الکبائر کی مد میں ان کا شمار کیا گیا۔ جب بھی کسی گمراہ فرقہ نے کوئی بڑے سے بڑی بدعت دین کے نام پر ایجاد کی ہے تو اس نے اس میں محاسن اور خوبیوں کا دعویٰ بھی ضرور کیا ہے۔ اور اس کی ترویج اور اشاعت کے لئے خدا اور مذہب کے نام پر رسول اور اولیاء سے عشق اور محبت کے نام پر کچھ نہ کچھ دلائل بھی تراشے ہیں اور ضرور ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے ایک عام اور سادہ لوح مسلمان تو ضرور مغالطے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مشرکین عرب نے شرک جیسے بدترین اور قبیح ترین عمل کو جائز اور مستحسن ثابت کرنے کیلئے تقرب الٰہی کا نام ہی تو لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ (مشرک کہتے تھے) ہم ان دیوتاؤں وسائط کی پوجا نہیں

زُلْفٰى - (پ۲۳ - زمر - رکوع ۱) کہ ہم صرف اس لئے کہ یہ ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں
اور دوسرے مقام پر ذکر فرمایا کہ مشرکین نے یہ کہا:
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (پ۱۱ - یونس - رکوع ۲) یہ ہمارے وسائل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں

دیکھا آپ نے کہ مشرکین نے شرک کے اثبات کے لئے تقرب خداوندی کی کوشش کن الفاظ سے تسکین قلب کا سامان مہیا کیا، پھر انہی مشرکین نے ملت ابراہیمی میں ایک بدترین بدعت ایجاد کی کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ بالکل مادرزاد ننگے ہو جاتے تھے حتیٰ کہ عورتیں بھی ایک تسمہ سے جس تسمہ کے علاوہ (جو شرمگاہ کو ڈھانپنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا) تمام لباس اتار کر یہ کہتے ہوئے طواف کرتی تھیں: اليوم يبدو بعضه أو كله - فما بدا منه فلا أحله (مسلم ج۲ ص۴۲۱ و سنن الکبریٰ وغیرہ) یعنی آج کے دن اگر میرے بدن کا بعض حصہ یا سارا ظاہر ہو تو میں اس ظاہر شدہ حصہ کو کسی کے لئے حلال نہیں کرتی۔ اور اس قبیح فعل کی توجیہ یوں نقل کی گئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ کپڑے ہیں کہ ہم ان میں گناہ کرتے ہیں، پھر انہی کپڑوں میں اللہ تعالیٰ کے پاک گھر کا طواف کیسے کریں؟ نیز ہم کپڑے پہن کر فخر کرتے اور دنیادار ہو جاتے ہیں اور رب العزت کے گھر کا طواف ہم دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر کیوں نہ کریں؟ مگر آپ نے دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے اس باطل اور بے ہودہ تصوف کی کیسی خبر لی؟ اور کس طرح سنہ ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایام حج میں یہ اعلان کروایا کہ خبردار آج کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ طواف نہیں کر سکتا۔ (بخاری ج۱ ص۲۲۰ وغیرہ) یوں اس کی بدعت اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ختم کی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کیا ہی سچی بات ارشاد فرمائی ہے:

أما بعد أوصيك بتقوى الله والاقتصاد في أمره واتباع سنة نبيه صلى الله عليه وسلم وترك ما أحدث المحدثون بعد ما جرت

اما بعد میں تجھے خدا تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم میں میانہ روی اختیار کرنے اور اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں

به سنته وكفوا مؤنته فعليك بلزوم
السنة فانها لك باذن الله عصمة ثم
اعلم انه لم يبتدع الناس بدعة
الا قد مضى قبلها ما هو دليل عليها
او عبرة فيها فان السنة انما سنها
من قد علم ما في خلافها من الخطا
والزلل والحمق والتعمق فارض
لنفسك ما رضي به القوم لانفسهم
فانهم على علم وقفوا وببصر نافذ
كفوا ولهم على كشف الامور كانوا
اقوى وبفضل ما كانوا فيه اولى
فان كان الهدى ما انتم عليه لقد
سبقتموهم اليه۔

(ابوداؤد۔ جلد ۲۔ [illegible])

اور میں وصیت کرتا ہوں کہ اہل بدعت نے جو بدعتیں ایجاد
کی ہیں ان کو ترک کرو۔ جبکہ سنت اس سے قبل جاری ہے
اور سنت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کیا مصیبت ہے؟
سنت کو مضبوطی سے پکڑو کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے سنت
حفاظت کا ذریعہ ہے اور جان لو کہ لوگوں نے جو بدعت ایجاد
کی ہے اس سے قبل ہی وہ چیز گزر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو
سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی کیونکہ سنت ان پاک
نفوس کی طرف سے آئی ہے جنہوں نے اس کے خلاف خطاء،
لغزش، حماقت اور تعمق کو بخوبی دیکھا تھا اور اس کو اختیار
نہ کیا۔ تم کو صرف اسی چیز پر راضی رہنا چاہئے جس پر قوم راضی ہو
چکی ہے کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دوربیں نگاہ
سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ یہ معاملات کی
تحقیق پر قوی تر تھے اور جس حالت پر تھے وہ افضل تر
حالت تھی۔ سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم ہو تو اس کا
مطلب یہ ہوا کہ تم ان سے فضیلت میں بڑھ گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد واضح ہے کہ سنت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ
کے حضرات صحابہ کرامؓ کا بتلایا ہوا اور متعین کیا ہوا طریقہ ہے۔ سنت کے خلاف جو بدعت تھی اس طریقہ
پر بھی ان کی نگاہ اٹھی ہے مگر انہوں نے ہرگز اس کو اختیار نہیں کیا۔ اور آج جو دلائل اہل بدعت
پیش کرتے ہیں بعینہٖ یہ دلائل اس وقت بھی موجود تھے۔ مگر نہ تو ان کو ان دلائل سے بدعت کا جواز
معلوم ہوا اور نہ ان میں ان کے نزدیک کوئی آنکھ کو بھانے والی عبرت ہی نظر آئی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ
آج ان دلائل سے بدعات کا جواز اور ثبوت مل سکتا ہے اور اس وقت نہ مل سکا؟ لہٰذا تم اسی چیز کو

اپنے لئے پسند کر دین کو وہ پسند کر چکے ہیں۔ وہ بڑی فضیلت کے مالک اور دُور رس نگاہ رکھنے والے تھے اور ہدایت مستقیم پر تھے۔ پھر اگر آج یہ بدعات جائز اور کارِ ثواب ہیں تو اس کا یہی مطلب نکلے گا کہ ہم علم و تقویٰ دین و دیانت اور ہدایت میں اُن سے سبقت لے گئے ہیں کہ یہ عبادات اور طاعات ان کو باوجود مجتہد ہونے کے ڈھونڈے نہیں ملیں اور ہمیں دستیاب ہو گئیں (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

علامہ شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں :

انک لا تجد مبتدعا ممن ینسب الی الملۃ الا وھو یستشھد علی بدعتہ بدلیل شرعی فینزلہ علی ما وافق عقلہ وشہوتہ۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۱۳۴)

تم کسی ایسے مبتدع کو نہ پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استشہاد کرتا اور اسی طرح سے وہ اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لیتا ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ارقام فرماتے ہیں :

"زیرا کہ ہر مبتدع وضال عقائد فاسدہ خود را بزعم فاسد خود از کتاب و سنت اخذ می کند پس ہر معنی از معانی مفہومہ ازینہا معتبر نہ باشد۔" (مکتوبات حصہ سوم ص ۹۷ مکتوب ۲۸۶)

کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے فاسد عقائد کو اپنے فاسد گمان کے مطابق کتاب اور سنت سے اخذ کرتا ہے لیکن ہر معنی معانی مفہومہ میں سے حجت اور معتبر نہیں ہو سکتا۔

ان عبارات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر مبتدع اور گمراہ جو ملت اسلامیہ سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اپنے باطل اور فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات پر کتاب و سنت سے تسکین قلب یا الزام خصم کے لئے ضرور دلائل تلاش کرتا ہے اور ان دلائل کو اپنی نارسا عقل اور اپنی خواہش کی تجویزوں میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا قرآن اور حدیث کا نام لے کر خود فریبی میں مبتلا ہونا اور لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا کسی طرح صحیح نہیں ہے نہ اس کی سمجھ درست ہے اور نہ قرآن کریم اور حدیث شریف سے اس کی پیش کردہ دلیل ہی صحیح ہے۔ کیونکہ یہی دلائل حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے سامنے بھی تھے مگر ان کو یہ فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات

اور رسول ان سے سمجھ نہ آسکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج ان سے یہ عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ ثابت ہوں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے منکرین تقدیر کے ایک مناظرہ کو (کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے تقدیر کی نفی معلوم ہوتی ہے) دُور کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لقد قرؤا منه ما قرأتم و علموا من تاويله ما جهلتم و قالوا بعد ذلك كله بكتاب و قدر۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۲۸۲)

یعنی حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور سلف صالحینؒ نے یہ آیتیں بھی پڑھی ہیں جن کو تم پڑھتے ہو لیکن وہ ان کے مطلب کو جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے اور انہوں نے یہ سب آیات پڑھنے کے باوجود تقدیر کا اقرار کیا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگر تمہاری طرف سے پیش کردہ آیات کا وہی مفہوم ہوتا جو تم پیش کرتے ہو تو یہ آیات حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون کے سامنے بھی تو تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان آیات سے اُن کو یہ مطلب سمجھ نہ آسکا۔ اور تم اس مطلب کو سمجھ گئے؟ کیسے باور کر لیا جائے کہ تم حق پر ہو اور وہ باطل پر تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) نے کیا ہی فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے:

"و میزان در معرفت حق و باطل فہم صحابہؓ و تابعینؒ است چنانچہ این جماعت از تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص قرآن معانی و مقاصد فہمیدہ اند و در آن تخطیہ ظاہر نکردہ واجب القبول است الیٰ ان قال اگر بر خلاف قرآن قول عمل میکند پس در حجت او ملاحظہ باید نمود اگر مخالفت او از قطعیہ یعنی نصوص متواترہ و اجماع قطعی است او با

حق اور باطل کے سمجھنے کے لئے میزان اور معیار حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا فہم ہے جو کچھ ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم سے معانی اور مقاصد قرآن کے الفاظ کے ساتھ سمجھا ہے جبکہ اس فہم میں خطا ظاہر نہ کی گئی ہو تو وہ فہم واجب القبول ہے (پھر آگے فرمایا) اگر قرآن و نقل کے خلاف کسی بدعتی نے کوئی مفہوم بیان کیا تو اس کی بدعت کو ملاحظہ کرنا ہوگا اگر اس کا مستنبط کردہ مفہوم کسی قطعی دلیل مثلاً نصوص متواترہ اور اجماع قطعی

کافر باید شمرد. گر مخالفت اولہ ظنیہ قریبہ بالیقین است مانند اخبار مشہورہ و اجماع عرفی گمراہ تواں فہمید دون الکفر۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ صفحہ ۱۶۱)

کے خلاف ہے تو ایسے بدعتی کو کافر شمار کرنا چاہیئے اور اگر یہ مخالفت ظنی دلائل کی ہے جو یقین کے قریب ہیں۔ مثلاً اخبار مشہورہ اور اجماع عرفی تو ایسے بدعتی کو گمراہ سمجھنا چاہیئے نہ کہ کافر۔

ان عبارات سے چند امور نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے ہیں (۱) یہ کہ کوئی بدعتی اور گمراہ محض دعویٰ کر کے ہی خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر دلائل پیش کیا کرتا ہے۔ (۲) دلائل بھی محض عقلی نہیں بلکہ قرآن کریم اور احادیث سے وہ اپنے مزعوم پر دلائل لاتا ہے (۳) مگر قرآن کریم اور حدیث سے جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ (۴) اس سے پہلے قرآن اور حدیث حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہ سلف صالحینؒ کے سامنے بھی تھے مگر انہوں نے ان سے یہ مفہوم نہیں سمجھا جو اہل بدعت سمجھے ہیں۔ (۵) قرآن کریم اور حدیث کا صحیح مفہوم صرف وہی ہوگا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے سمجھا ہے۔ (۶) اہل بدعت کا پیش کردہ مفہوم اگر دلائل قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہوگا اور ظنی دلائل کے خلاف ہے تو بدعت اور گمراہی ہوگا بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور اسی طرح جو شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی منقول تفسیر کو نہیں جانتا تو اس کے لئے فن تفسیر میں سرے سے دخل دینا ہی حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اقول یحرم الخوض فی التفسیر لمن لا یعرف اللسان الذی نزل القرآن بہ والمنقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ والتابعین من شرح غریب وسبب نزول وناسخ ومنسوخ۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہو جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو شخص غریب لغات اور شان نزول اور ناسخ و منسوخ سے بے خبر ہو جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے منقول ہے تو ایسے شخص کے لئے تفسیر میں

(حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۴۱) دخل دینا بھی حرام ہے۔

اور اہلِ بدعت کی اپنی بدعت کی تائید میں ہر تفسیر صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ سے منقول و ماثور ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور طرفہ یہ کہ وہ بھی محض خود تراشیدہ اور خود ساختہ، اور ایسے ہی لوگوں کی خود تراشیدہ تفاسیر نے اُمتِ مرحومہ کا شیرازہ بکھیر کر انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ سچ ہے ؎

این چنین ارکانِ دولت مُلک را ویراں کنند

اور اگر کوئی تفسیر ماثور اور منقول بھی وہ پیش کرتے ہیں تو اس کی بنیاد بھی جعلی، موضوع، معلول شاذ اور منکر و ضعیف وغیرہ روایات اور آثار پر قائم کی جاتی ہے اور صحیح تفاسیر سے عمداً اغماض کیا جاتا ہے اور کوئی روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے تو اس کا معنیٰ غلط لیا جاتا ہے اور یہی کچھ وہ قرآن کریم سے کرتے ہیں کہ اپنے باطل عقائد اور آراء کو اس میں دخل دیتے ہیں، چنانچہ امام سیوطیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

مثل طوائف من اهل البدع اعتقدوا مذاهب باطلة وعمدوا الى القرآن فتأولوه على رأيهم وليس لهم سلف من الصحابة والتابعين لا في رأيهم ولا في تفسيرهم۔

جیسے اہلِ بدعت کے مختلف گروہوں نے باطل عقائد قائم کیے اور قرآن کریم سے اپنی باطل آراء پر استدلال کر کے اپنی مرضی پر اس کو ڈھال لیا حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں ان کا کوئی بھی پیش رو نہیں نہ رائے میں اور نہ تفسیر میں۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

وفي الجملة من عدل عن مذاهب الصحابةؓ والتابعينؒ وتفسيرهم الى ما يخالف ذلك كان مخطئا في ذلك بل مبتدعا لانهم كانوا اعلم بتفسيره ومعانيه كما انهم اعلم

حاصل کلام یہ ہے کہ جس نے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے اعراض کیا، اور اس کے خلاف کو اختیار کیا تو وہ شخص خطا کار بلکہ مبتدع ہوگا کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ

بالحق الذی بعث اللہ بہ رسولہ۔

(تفسیر اتقان جلد دوم ص۱۸۱ طبع مصر)

قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے معانی کو زیادہ جانتے تھے جیسا کہ وہ اُس حق کو زیادہ جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا تھا۔

اور یہی علامت ہے غلط مذہب کی کہ اس کی بنیاد غلط روایت اور بے بنیاد روایت پر رکھی جاتی ہے۔ اگر اہل بدعت حضرات صرف اسی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ان کو جملہ مشتبہات اور بدعات پر نعرہ انکار و دلائل پیش کرنے سے یقیناً رستگاری حاصل ہو جائے ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

جب کسی چیز کے سنت اور بدعت ہونے میں اشتباہ واقع ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

سابق پیش کردہ دلائل سے بحمد اللہ تعالیٰ سنت اور بدعت کی حقیقت اور اس کا حکم واضح سے واضح تر ہو گیا ہے لیکن اگر بالفرض کسی کوتاہ مغز اور کم فہم کو اشتباہ باقی رہے یا عوام الناس جو اس قسم کے مسائل میں فریقین کے دلائل کا موازنہ کر کے صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں تو ان کے لئے صحیح راہِ عمل صرف یہی ہے کہ وہ ایسے مشکوک اور مشتبہ کام کے پاس ہی نہ جائیں، اور اگر کسی چیز کے بدعت اور سنت یا مستحب اور مباح ہونے میں شبہ ہو تو اس سے بچنا ہی ان کے لئے صحیح راہِ عمل ہے، اور باتفاق علماء ان کے لئے یہی طریقہ صحیح رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔ چنانچہ حضرت وابصہ بن معبدؓ (المتوفی [illegible]) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

والاثم ما حاک فی نفسک و تردد فی الصدر وان افتاک الناس۔ — گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تیرے دل میں تردد واقع ہو اگرچہ لوگ (اور نام کے مفتی) تجھے فتویٰ بھی دے دیں۔

(مسند احمد و الدارمی، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۲)

اور حضرت عطیہ السعدیؓ (المتوفی [illegible]) فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ

لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين حتى يدع ما لا بأس به حذرا لما به بأس۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۲)

پرہیزگاروں کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ وہ چیزیں نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ ذریعہ بنتی ہیں ایسی چیزوں کا جن میں حرج ہے۔

حضرت معاذؓ بن جبلؓ کو جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا:

لا تقضين ولا تفصلن إلا بما تعلم وإن أشكل عليك أمر فقف حتى تبينه أو تكتب إلي فيه۔ (ابن ماجہ ص ۵)

کہ تم بغیر علم کے کوئی حکم اور فیصلہ ہرگز صادر نہ کرنا اور اگر تم پر کسی چیز میں اشکال گزرے تو توقف کرنا حتیٰ کہ تم اس کو اچھی طرح روشن پا لو یا میری طرف خط لکھنا۔

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ (المتوفی ۶۴ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال بين والحرام بين وبينهما مشبهات لا يعلمها كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي حول الحمى يوشك أن يرتع فيه۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۳، ابن ماجہ ص ۲۹۱)

کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے سو جو شخص ان مشتبہات سے بچا تو اس نے اپنا دین اور عزت بچا لی اور جو مشتبہات میں جا پڑا تو (گویا) وہ حرام میں جا پڑا جیسے چراگاہ کے ارد گرد جانوروں کو چرانے والا قریب ہے کہ چراگاہ میں جا پڑے۔

ان روایات سے آفتاب نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن امور میں اشتباہ واقع ہو ان میں اپنے دین اور عزت کو صرف اسی صورت میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے کہ ایسے کاموں میں انسان دخل ہی نہ دے اور ان پر عمل پیرا ہو کر ہرگز اپنی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے اور خلق خدا کو گمراہ ہونے سے بچائے خصوصاً ایسے کام جو کفر اور شرک و بدعت کا ذریعہ بنتے ہوں اور یہ معاملہ صرف یہیں تک نہیں رہ جاتا بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تردد اور اشتباہ والے کاموں سے بچنے کا صریح حکم ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ بن علیؓ (المتوفی ۵۰ھ) روایت کرتے ہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

یقول دع ما یریبک الی ما لا یریبک فان الخیر طمانینۃ وان الشر ریبۃ۔
(مستدرک ج ۲ ص ۱۳ قال الحاکم والذہبی صحیح)

وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے تردد اور اشتباہ میں ڈالے اور ایسی چیز اختیار کر جو تیرے لئے باعث تردد نہ ہو کیونکہ خیر باعث اطمینان اور شر باعث شک ہے۔

یہ صریح اور صحیح حدیث بھی اس امر کو روشن کرتی ہے کہ جس چیز میں تردد اور اشتباہ ہو تو ایسی چیز کو چھوڑنا ہی ضروری ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روشن سنتیں بلا شک ہر شعبہ میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں کسی قسم کا ادنیٰ سے ادنیٰ شک اور شبہ بھی نہیں ہے اور یہی روشن سنتیں طمانیت قلب کا کافی سامان مہیا کر دیتی ہیں اور ان کی خلاف ورزی شک اور شبہ کے تاریک گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ احادیث میں اس کی تصریح آتی ہے کہ (کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیامن) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (سرمہ لگانے، کپڑا پہننے، وضو کرنے میں حتی کہ ہر کام میں) دائیں پہلو اور جانب کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

قال لا یجعل احدکم للشیطان شیئا من صلاتہ یری ان حقا علیہ ان لا ینصرف الا عن یمینہ لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثیرا ینصرف عن یسارہ۔
(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۷)

تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کے لئے کچھ حصہ نہ ٹھہرائے بایں طور کہ نماز سے فارغ ہوتے وقت دائیں طرف ہی پھرنے کو اپنے اوپر لازم سمجھے بے شک میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بسا اوقات بائیں طرف بھی مڑتے دیکھا ہے۔

اس حدیث کی تفسیر اور تشریح میں مشہور محقق علامہ محمد طاہر الحنفیؒ (المتوفی ۹۸۶ھ) فرماتے ہیں:

فیہ من اصر علی امر مندوب وجعلہ عزما ولم یعمل بالرخصۃ فقد اصاب منہ الشیطان من الاضلال فکیف من اصر علی بدعۃ او منکر۔ (مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ...)

کہ جس کسی نے کسی مندوب اور مستحب چیز پر اصرار کیا اور اسی کو عزیمت بنا لیا اور رخصت پر عمل نہ کیا تو گویا اس کو شیطان نے گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا تو کیا حال ہوگا اس شخص کا جو کسی بدعت اور منکر چیز پر اصرار کرتا ہے۔

اور یہی الفاظ علامہ طیبیؒ (الحنفی المتوفی) شرح مشکوٰۃ میں اور حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات [illegible] میں تحریر فرمائے ہیں جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ بدعت اور منکر پر اصرار کرنا تو کجا رہا اگر کوئی شخص امر مندوب اور مستحب پر یا رخصت پر بھی اصرار کرے گا تو وہ بھی شیطان کا پیروکار ہوگا اور اس کے اس فعل میں شیطان کا حصہ ہوگا۔ علامہ برکلی الحنفیؒ (المتوفی) لکھتے ہیں کہ:

ثم اعلم ان فعل البدعة اشد ضررا من ترك السنة بدليل ان الفقهاء قالوا اذا تردد الحكم فى شئ بين كونه سنة وبدعة فتركه لازم۔ (طریقہ محمدیہ ص [illegible])

تم جان لو کہ بدعت کا کام کرنا ترک سنت سے زیادہ مضر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ حضرات فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی حکم سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو اس کا ترک کرنا ہی ضروری ہوگا۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:

وما تردد بين البدعة والسنة يترك۔ (عالمگیری ج ۱ ص [illegible] مصری)

جو چیز سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو وہ چھوڑ دی جائے گی۔

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ:

اذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك السنة راجحا على فعل البدعة (شامی)

جب حکم سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو سنت کا ترک کرنا فعل بدعت پر مقدم ہوگا۔

قاضی ابراہیم صاحب الحنفیؒ فرماتے ہیں:

"جس کام کے بدعت اور سنت ہونے میں شبہ ہو اس کو چھوڑ دے کیونکہ بدعت کا چھوڑنا ضروری ہے اور سنت کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ (نفائس الاظہار ترجمہ مجالس الابرار ص [illegible])

اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"وہرچہ درآں شبہ بود توقف دراں لازم است"۔ (مکتوبات حضرت شیخؒ بر حاشیہ اخبار الاخیار ص [illegible])۔

بلکہ علامہ ابن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویلزم ان ما تردد بین بدعة وواجب اصطلاحی فانه یترک کالسنة ۔

جو چیز بدعت اور واجب اصطلاحی کے درمیان دائر ہو تو لازم ہے کہ اس کو سنت کی طرح ترک کر دیا جائے ۔ (بحر الرائق ۔ ج ۲ ص ۱۹۱)

یہ عبارات اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ جب کوئی چیز ایسی ہو کہ اس میں سنت کے پہلو کے ادا کرنے سے بدعت لازم آتی ہو تو سنت کے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کو مطلقاً ترک کرنا ضروری ہوگا ۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ بدعت کا پہلو بھی تو شامل ہے ۔ سنت تو خیر پھر سنت ہے اگر کوئی چیز بدعت اور حضرات فقہاء کرام کے اصطلاحی واجب کے درمیان بھی دائر ہو تو اس کو بھی ترک کرنا لازم اور ضروری ہے ۔ کیونکہ اس سے فی الجملہ بدعت کی ترویج اور اشاعت کا اندیشہ ہے ۔ اور بدعت اتنی قبیح ترین چیز ہے کہ شریعت مطہرہ اس کے وجود نامسعود تک کو گوارا نہیں کرتی ، چہ جائیکہ اس کی نشر و اشاعت کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے ۔ یہی وجہ ہے کہ بدعت کو ختم کرنے کے لئے مستحب ، سنت اور حتیٰ کہ واجب تک کی قربانی بھی گوارا کر لی جائے گی مگر بدعت کو ہرگز ہرگز فروغ نہ دیا جائے گا ۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ بدعت میں آلودہ ہونا چاہتا ہے تو اس کی مرضی ۔ ہمارے لئے سنت کافی ہے اور ہمیں محدثات اور خرافات میں الجھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے ۔ کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے ، وللہ درّہٗ ؎

وخیر امور الدین ما کان سنة
وشر الامور المحدثات البدائع

قارئین ! اگر آپ کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق اور محبت ہے تو اس کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ سنت کی اتباع کریں اور حضرات صحابہ کرامؓ ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے نقش قدم پر چلیں ۔ وہی عقائد و اعمال اختیار کریں جو انہوں نے اختیار کئے اور ان تمام عقائد اور اعمال سے احتراز کریں جن سے انہوں نے احتراز کیا ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قول (جو درحقیقت مرفوع حدیث میں ہے) کے مطابق مستقبل میں

بھی اجتماع ہو اور ایمان سے بھی محروم ہوں۔

قال یأتی علی الناس زمان یجتمعون فی المساجد لیس فیھم مؤمن۔ (مستدرک ج ۴ ص ۴۴۳ قال الحاکم والذہبی صحیح)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ مسجدوں میں اکٹھے تو ہوں گے لیکن ان میں ایک بھی مومن نہ ہوگا۔

یہ دیکھا حضرت ابن عمرؓ ہیں جنہوں نے تثویب جیسی بدعت کی وجہ سے ایک مسجد ہی ترک کر دی تھی۔ الغرض اخلاص اور اتباع سنت کے ساتھ معمولی عبادات بھی مفید ہے اور شرک اور بدعت کو دل میں جگہ دینے سے بڑی سے بڑی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عمل اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف اسی کی بارگاہ سے سب کچھ مل سکتا ہے۔

اُسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

اس باب میں فرداً فرداً ان تمام بدعات پر بحث ہوگی، جن پر فریقِ
مخالف عمل پیرا ہے اور جن کو وہ بزعمِ خود شعارِ حنفیت قرار دیتا ہے

محفلِ میلاد

اس میں شک و شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و عقیدت اور محبت عینِ ایمان ہے۔ اور آپ کی ولادت سے لے کر وفات تک زندگی کے ہر شعبے کے صحیح حالات و واقعات اور آپ کے اقوال و افعال کو پیش کرنا باعثِ تحصیلِ ثوابِ اُخروی ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے حالات کو معلوم کرے اور ان کو مشعلِ راہ بنائے۔ سال کے ہر مہینہ میں اور مہینے کے ہر ہفتہ میں اور ہفتہ کے ہر دن میں اور دن کے ہر گھنٹہ اور منٹ میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں آپ کی زندگی کے حالات بیان کرنے اور سننے ممنوع ہوں۔ یہ بات محلِ نزاع نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو مقرر کر کے اس میں میلاد سنانا، محفل اور مجلس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اسی دن کو مخصوص کر کے فقراء اور مساکین کو کھانا کھلانا، وغیرہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ خیر القرون سے ثابت ہے؟ اگر نہیں ہے تو کسی مسلمان کو اس میں پس و پیش کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے فعلاً یا ترکاً کیا، وہی دین ہے اور اس کی مخالفت بے دینی ہے۔ تیئیس سال آپ بعد از نبوت قوم میں زندہ رہے

اور پھر تیس سال خلافتِ راشدہ کے گزرے ہیں اور پھر ایک سو دس ہجری تک حضرات صحابۂ کرامؓ کا دور رہا ہے۔ کم و بیش دو سو بیس برس تک اتباعِ تابعین کا زمانہ تھا۔ عشق ان میں کامل تھا، محبت ان میں زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احترام اور تعظیم ان سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے؟ اگر فریقِ مخالف ہمت کرکے ان سے یہ ثابت کردے تو بسر و چشم بادو شن دل ماشاء اللہ کسی مسلمان کو اس سے سرِمو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر فریقِ مخالف خیر القرون سے اس کا ثبوت نہ پیش کرسکے اور تا قیامت نہیں کر سکے گا، تو سوال یہ ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے یہ مبارک کام اور کارِ ثواب اُس وقت کیوں نہ ہوا؟ اور آج یہ کیسے کارِ ثواب اور مبارک ہوگیا ہے؟ بس صرف اسی ایک نقطۂ نگاہ پر جاکر وہ لوگ فیصلہ کرنا چاہیئے۔ وہ تمام فوائد و برکات اور منافع اس وقت بھی تھے، جن کو آج اہلِ بدعت حضرات بیان کرتے ہیں، احمد رضا خان صاحب بریلوی، مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی، مولوی عبدالسمیع صاحب، مولوی محمد صالح صاحب، مفتی احمد یار خان صاحب اور مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے اس کے اثبات پر جو دفتر کا دفتر بے فائدہ اور لایعنی دلائل پیش کرکے صفحات کے صفحات سیاہ کردیئے ہیں۔ اُن کو صرف اور صرف اسی مرکزی نقطۂ نگاہ پر جانی چاہیئے تھی کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور اہلِ خیر القرون نے کہا اور کیا وہی دین ہے اور بس ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ یاد رہے کہ محفلِ میلاد و مجلسِ میلاد اور چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نفسِ ذکرِ ولادت باسعادت اور شئے ہے۔ اوّل بدعت ہے اور ثانی مندوب و مستحب ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"نفسِ ذکرِ ولادت مندوب ہے اور اس میں کراہت قیود کے سبب سے آئی ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج۱ ص[illegible]) - نیز لکھتے ہیں: نفسِ ذکرِ ولادت فخرِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندوب ہے مگر بسبب انضمام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہوگئی"۔ (ج۱ ص[illegible])۔

اگر کسی عالی فہم کو نفسِ ذکرِ ولادت اور منعقدہ مجلس اور محفلِ میلاد کا فرق سمجھ نہ آئے تو اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟ ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

مجلسِ میلاد کی تاریخ | پوری چھ صدیاں گزر چکی تھیں کہ اس بدعت کا کہیں مسلمانوں میں رواج نہ تھا۔ نہ تو کسی صحابی کو سوجھی نہ تابعی کو، نہ کسی محدث کو اور نہ فقیہ کو، نہ کسی پیشوا کو اور نہ کسی ولی کو۔ یہ بدعت اگر سوجھی تو ایک مسرف بادشاہ کو اور اس کے ایک رفیق دنیا پرست مولوی کو۔ یہ بدعت ۶۰۴ھ میں موصل کے شہر میں مظفر الدین کوکری بن اربل (المتوفی ۶۳۰ھ) کے حکم سے ایجاد ہوئی جو ایک مسرف اور دین سے بے پروا بادشاہ تھا (دیکھئے ابن خلکان وغیرہ) اور امام احمد بن محمد مصری مالکیؒ (المتوفی ...ھ) لکھتے ہیں کہ:

كان ملكاً مسرفاً يأمر علماء زمانه ان يعملوا باستنباطهم واجتهادهم وان لا يتبعوا لمذهب غيرهم حتى مالت اليه جماعة من العلماء وطائفة من الفضلاء ويحتفل لمولد النبي صلى الله عليه وسلم في الربيع الاول وهو اول من احدث من الملوك هذا العمل (القول المعتمد في عمل المولد)

وہ ایک مسرف بادشاہ تھا۔ علماءِ زمانہ کو حکم دیا کرتا تھا کہ وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں اور غیر کے مذہب کی پیروی نہ کریں۔ حتیٰ کہ (دنیا پرست) علماء اور فضلاء کی ایک جماعت اس کی طرف مائل ہو گئی اور وہ ربیع الاول میں میلاد منعقد کیا کرتا تھا۔ بادشاہوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔

اور یہ مسرف بادشاہ بیت المال اور رعایا کی لاکھوں کی رقم اس بدعت اور جشن پر صرف کر دیتا تھا اور اس طرح اس نے بے دینوں کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کا ایک دینی ڈھونگ رچا رکھا تھا اور بیدریغ ملک اور قوم کی رقم کو اس طرح برباد کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ علامہ ذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) نقل کرتے ہیں کہ:

كان ينفق كل سنة على مولد النبي صلى الله عليه وسلم نحو ثلاث مائة الف۔

وہ ہر سال میلاد (جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر تقریباً تین لاکھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔

اور جس دُنیا پرست مولوی نے اس جشن کے دلدادہ بادشاہ کے لئے محفلِ میلاد کے جواز پر مواد اکٹھا کر دیا تھا، اُس کا نام عمر بن دحیہ ابوالخطاب (المتوفی ۶۳۳ھ) تھا جس کو اس کتاب کے مصنف صاحب اربل اور مسرف بادشاہ نے ایک ہزار پونڈ انعام دیا تھا (دول الاسلام ج۲ ص۱۰۲) اب ذرا اس مولوی کی تعریف بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ حضرت کیسے تھے؟ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نقل کرتے ہیں کہ:

كان كثير الوقيعة في الائمة وفي السلف من العلماء، خبيث اللسان احمق شديد الكبر قليل النظر في امور الدين متهاونا (لسان الميزان ج۴ ص۲۹۶)

وہ آئمہ دین اور سلف کی شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتا تھا۔ گندی زبان کا مالک تھا۔ بڑا احمق اور متکبر تھا۔ دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سست تھا۔

نیز حافظ موصوف نقل کرتے ہیں کہ:

قال ابن النجار رأيت الناس مجتمعين على كذبه وضعفه (لسان الميزان ج۴ ص۲۹۵)

علامہ ابن نجارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس کے جھوٹ اور ضعف پر متفق پایا۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ مجلس میلاد کو رائج کرنے والا ایک فریب خوردہ اور مسرف بادشاہ تھا۔ جو علماء کو بجائے سلف صالحینؒ کے مذہب کی اتباع کرنے کے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لینے کا حکم دیا کرتا تھا۔ اور دنیا کی رسوائی اور مذہبی شورش سے بچاؤ تا مہ آشنا کر اس نے اپنی ملکی سیاست کو مضبوط کیا اور حظِ نفس کے لئے راستہ ہموار کیا، اور جوازِ میلاد پر کتاب لکھنے والا وہ دُنیا پرست مولوی اُس کو مل گیا جس کی گندی اور ناپاک زبان سے سلف صالحینؒ بھی نہ چھوٹے اور وہ احمق اور متکبر ہونے کے ساتھ دین کے معاملات میں بھی بہت بے پروا اور سست تھا۔ اور ایسے چالاک بادشاہ اور ہوشیار مولوی کے ساتھ وہ بے چارے پیر اور صوفی بھی شامل ہو گئے جو دین کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جو سادہ ہونے کی وجہ سے ہر چھلکے اور پوست کو مغز سمجھ لیتے ہیں۔ پھر جب بادشاہ اور ماہر نفسیات مولوی اور سادہ قسم کے صوفیاء اس کام کو دین کا کام بتا کر عوام سے اپیل کریں تو عوام بے چارے اس میں کیوں نہ پھنسیں۔

حضرت عبداللہؒ بن مبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

وهل افسد الدين الا الملوك ۔۔۔ واحبار سوء ورهبانها

اب جس کی مرضی ہے کہ وہ خیر القرون کی اتباع کرے یا نفس پرست بادشاہ اور دنیا پرست مولوی کی؟ ہم تو خیر القرون کی اقتداء کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی کی توفیق دے۔ اور اس محفل میلاد کی ہر زمانہ کے اہلِ حق اور سرِ فہرست علماء نے پُر زور تردید کی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلیؒ نے (اپنے فتاویٰ جلد ۱ صفحہ ۳۱۲ میں) اور امام نصیر الدین شافعیؒ نے (دیکھئے ارشاد الاخیار ص ۲۲) اور حضرت مجدد الف ثانی الحنفیؒ نے (مکتوبات حصہ ۵ ص ۴۲ میں) اور علامہ ابن امیر الحاج مالکیؒ نے پوری صراحت اور وضاحت سے اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ :

ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلونه فى الشهر ربيع الاول من المولد وقد احتوى ذلك على بدع ومحرمات الى ان قال فهذه المفاسد مترتبة على فعل المولد اذا عمل بالسماع فان خلا منه وعمل طعاما فقط ونوى به المولد ودعا اليه الاخوان وسلم من كل ما تقدم ذكره فهو بدعة بنفس نيته فقط اذ ان ذلك زيادة فى الدين وليس من عمل السلف الماضين واتباع السلف اولى۔ (مدخل ابن الحاج مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۱۱)

لوگوں کی اُن بدعتوں اور نو ایجاد باتوں میں سے جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شعائرِ اسلام کا اظہار سمجھتے ہیں ایک مجلس میلاد بھی ہے جس کو وہ ربیع الاول میں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے (آخر میں فرماتے ہیں) اور اس مجلس میلاد پر یہ مفاسد اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جبکہ اس میں سماع ہو سو اگر مجلس میلاد سماع سے پاک ہو اور صرف بنیتِ مولد کھانا تیار کیا ہو اور بھائیوں اور دوستوں کو اس کے لئے بلایا جائے اور تمام مذکورہ بالا مفاسد سے محفوظ ہو تب بھی وہ صرف نیت انعقادِ مجلس میلاد کی وجہ سے بدعت ہے اور دین کے اندر ایک جدید امر کا اضافہ کرنا ہے، جو سلف صالحین کے عمل میں نہ تھا حالانکہ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

اور علامہ عبد الرحمن مغربیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ :

ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعله

بہ تحقیق میلاد کا کرنا بدعت ہے۔ نہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

رسول الله صلى الله عليه وسلم والخلفاء والائمة ۔ (كذا في الشرعة الالهية)

عليہ وسلم نے اور آپ کے حضرات خلفاء راشدینؓ اور ائمہ مجتہدین نے خود اس کو کیا اور نہ اس کا حکم دیا۔

اور علامہ احمد بن محمد مصری مالکیؒ لکھتے ہیں کہ:

قد اتفق علماء المذاهب الاربعة بذم هذا العمل ۔ (القول المعتمد)

چاروں مذہب کے علماء اس عمل میلاد کی مذمت پر متفق ہیں۔

قارئین کرام! آپ ان ٹھوس حوالوں سے اس مسئلہ کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ خیر القرون میں یہ عمل نہ تھا بلکہ چھٹی صدی کے بعد یہ ایجاد ہوا تھا، اور اس کے موجدین کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے کہ بادشاہ وقت اس کا سرپرست تھا اور بحسب "الناس على دين ملوكهم" عوام کا اس سے متاثر ہونا ہرگز بعید از قیاس نہ تھا۔ عوام تو کیا بلکہ بعض خواص بھی اس کے عالمگیر پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان مسلمانوں کے اس عمل کے جواز کے لئے شرعی دلائل کی تلاش باوجود تحری شروع کر دی گئی اور دور دراز کے قیاسات سے کام لے کر اس گاڑی کو چلانے کی کوشش کی گئی اور امام جلال الدین سیوطی مصریؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) جیسے وسیع النظر عالم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

ليس فيه نص ولكن فيه قياس ۔

اس کے جواز پر نص تو کوئی نہیں البتہ قیاس ہے۔

(حسن المقصد في عمل المولد)

اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا کہ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع سے کوئی نص اس میلاد کے جواز پر موجود نہیں ہے، ہاں البتہ قیاس ہے۔ اور قیاس جو پیش کیا وہ بھی فاسد، اور یہ بات بھی نظر انداز کر دی گئی کہ جس چیز کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا اس میں قیاس اور اجتہاد کرنے کی گنجائش ہی کہاں سے پیدا ہو گئی؟ اور مولوی عبد السمیع صاحب ؒ (وغیرہ) جب آگے تو انہوں نے اپنے دل کی تسکین اور اپنے حواریوں کی تشفی کے لئے تبرکاً ناموں کی فہرست بھی دے دی کہ یہ حضرات عمل مولد کو مستحسن سمجھتے تھے (انوار ساطعہ ص ۱۴۹، ۱۵۰) مگر اس پر غور نہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا نام بھی ان میں ہے یا نہیں؟ حضرات ائمہ مجتہدین اور مستند محدثینؒ کا ذکر بھی ہے یا نہیں؟ پھر اس پر

بھی غور کیا کہ ان میں اکثریت صوفیائے کرام کی ہے، جن کا عمل بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ حجت نہیں
عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست — اور جو بعض محقق عالم ہیں، وہ خود قیاس فاسد کی غلطی کا
شکار ہیں، اور بعض وہ بھی ہیں جو اس تاریخ میں فقط فقراء کو کھانا کھلاتے تھے اور بعض نفس ذکر ولادت
کے استحباب کے قائل ہیں اور بعض صرف دل میں خوشی کے اظہار کے قائل ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) سے بھی محفل
میلاد کے اثبات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اپنے رسالہ "ہفت مسئلہ" ص ۵ میں اس کو جائز اور باعث
برکت کہتے ہیں (محصلہ جاء الحق ص ۲۳۱)۔ مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسالہ ہفت مسائل
حضرت حاجی صاحب کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (المتوفی
۱۳۶۲ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ نفس مضمون حاجی صاحبؒ کا ہے اور عبارت حضرت تھانویؒ کی ہے۔
(دیکھئے حاشیہ فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۱۳) اور حضرت تھانوی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کے
جواز کے قائل تھے، پھر رجوع کر لیا تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ نفس ذکر مندوب
اور قیود بدعت ہیں (حاشیہ مذکورہ ص ۱۱۳) پھر وہ مفاسد بھی ان کے وقت اور ان کے ذہن میں نہ تھے
جو لوگوں میں مروج تھے۔ (دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۱۳) پھر حاجی صاحبؒ کسی شرعی دلیل کا نام
نہیں ہے۔ لہٰذا حاجی صاحبؒ کا ذکر کرنا سوالات شرعیہ میں بے جا ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۱۵)

یہ یاد رہے کہ میلاد کا جلوس انگریز کے زمانہ میں ایک خاص مصلحت کے تحت پنجاب میں لاہور کے
دو شخصوں نے ایجاد کیا تھا۔ مولوی عبد المجید صاحب جو فوت ہو چکے ہیں اور جناب حاجی عنایت اللہ
صاحب جو تادم تحریر لاہور میں بقید حیات ہیں۔ بلکہ وہ اس جلوس کے بانی ہونے کے مدعی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل وہ لکھتے ہیں کہ حرمین شریفین میں بھی نہایت اہتمام
سے یہ مجلس پاک منعقد کی جاتی ہے۔ جس ملک میں بھی جاؤ مسلمانوں میں یہ عمل پاؤ گے۔ اولیاء اللہ و
علماء امت نے اس کے بڑے بڑے فائدے اور برکات بیان فرمائی ہیں (الیٰ ان قال) لہٰذا محفل میلاد
پاک مستحب ہے (جاء الحق ص ۲۲۶) اور ص ۲۲۷ میں لکھتے ہیں کہ استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ

مسلمان اس کو اچھا جانتے ہیں۔ (بلفظہ)

الجواب: یہی حرمین الشریفین پہلے بھی تھے اور حضرات صحابۂ کرامؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ جیسے اولیاء اللہ اور علماء امت بھی تھے، اُن کو یہ فائدے اور برکات کیوں نہ سمجھ آ سکے؟ اور وہ اس مروجہ مجلس پاک کے منافع سے کیوں محروم رہے، پھر چھ صدیوں تک جس ملک کے مسلمانوں کو دیکھا، اُن میں یہ عمل نہ پایا گیا۔ نہ معلوم وہ اس کی برکات سے کیوں بہرہ ور نہ ہو سکے؟

بلاشک حرمین الشریفین کی نصوص سے بڑی فضیلت اور رتبہ ثابت ہے۔ لیکن شرعی دلائل صرف چار ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر حرمین الشریفین میں اچھے کام ہوں تو نور علیٰ نور، ورنہ ہرگز حجت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت ملا علی القاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

في الحرمين الشريفين من شيوع الظلم و كثرة الجهل وقلة العلم وظهور المنكرات و فشو البدع و اكل الحرام والشبهات (مرقات ج ۲ ص ۲۱۲)

حرمین شریفین میں ظلم شائع ہے، جہالت کثیر ہے، علم کم ہے، منکرات کا ظہور ہے، بدعات رائج ہیں، حرام کھایا جاتا ہے، دینی شبہات بھی بکثرت ہیں۔

مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ رشک ہے کہ استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمان اس کو اچھا جانیں — بدعات کی نشر و اشاعت کے لئے کیا چور دروازہ تلاش کیا گیا ہے، اور یہ بھول گئے کہ استحباب تو اونچی چیز ہے، اباحت بھی حکم شرعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر اس کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا، جس کی پوری تفصیل با دلائل گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

المندوب حکم شرعی لا بد له من دليل (رد المحتار) — استحباب شرعی حکم ہے، اس کے لئے دلیل درکار ہے۔

مفتی صاحب تو یوں ہی گلو خلاصی کرنا چاہتے ہیں مگر کون اس طرح ان کو چھوڑتا ہے جلے

کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

میلاد وغیرہ میں قیام کرنا کسی بزرگ کے لئے جو بنفس نفیس آئے۔ بعض حالات میں بشرطیکہ اقرار...

تعظیماً نہ ہو، قیام درست ہے اور اس پر حضرت امام نوویؒ وغیرہ نے قوموا الیٰ سیدکم کی حدیث سے استدلال کیا ہے (شرح مسلم ج ۲ ص ۹۵)

بعض دوسرے حضرات اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ زخمی تھے اور آپ نے ان کو گدھے سے اتارنے کے لئے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے ، قوموا الیٰ سیدکم فانزلوہ من الحمار ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قوموا الیٰ سیدکم فرمایا ہے لسیدکم نہیں فرمایا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل اس موقع پر کیا تھا ، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس موقع پر کس عمل کو پسند اور کس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ :

لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا راوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذالک۔ (رواہ الترمذی ج ۲ ص ۱۰۰ وقال ہذا حدیث حسن صحیح۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بڑھ کر اور کوئی محبوب نہ تھا لیکن جب وہ آپ کو دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس قیام کے عمل کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۰۳ ومسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲ والادب المفرد ص ۱۳۸)

اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے لئے قیام کو پسند نہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ باوجودیکہ ان کو آپ سے انتہائی محبت تھی قیام نہ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پسند نہ کرتے ہوں اور کمال محبت کے باوجود حضرات صحابہ کرامؓ بھی اس پر عمل نہ کرتے ہوں (جبکہ بنفس نفیس آپ موجود بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو نظر بھی آتے تھے) تو پھر آج جبکہ آپ کا کسی مجلس میلاد میں آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت ہی نہیں (دیکھئے راقم الحروف کی کتاب تبرید النواظر) اور نہ کسی کو نظر آتے ہیں تو پھر کس طرح قیام کو جائز اور مستحب قرار دیا جاتا ہے ، بلکہ واجب اور فرض کہا جاتا ہے اور قیام نہ کرنے والے کی تکفیر کی جاتی ہے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب محمد بن یحییٰ مفتی حنابلہ سے اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ :-

یجب القیام عند ذکر ولادتہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (انوار ساطعہ ص۱۵۱) — آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت کے ذکر کے وقت قیام کرنا واجب ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی غفلت ملاحظہ کیجئے کہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ مسلمانوں پر محض بہتان ہے کہ وہ قیام میلاد کو واجب سمجھتے ہیں۔ نہ کسی عالم دین نے لکھا کہ قیام واجب ہے اور نہ تقریر وعظ میں کہا۔ عوام بھی یہی سمجھتے ہیں کہ قیام اور میلاد کار ثواب ہے۔ پھر آپ ان پر واجب سمجھنے کا کس طرح الزام لگاتے ہیں"؟ (بلفظہ جاء الحق ص۲۴۵)

مفتی صاحب انوار ساطعہ کا حوالہ بار بار دیکھ لیں کہ یہ بہتان ہے یا ایک نفس الامری حقیقت ہے؟ صرف واجب ہی نہیں بلکہ اس کو فرض بھی کہا ہے اور قیام نہ کرنے والے کو کافر کہا ہے۔ اہل بدعت کے مشہور مجموعہ فتاویٰ یعنی غایۃ الکلام کے ص۳۶، ص۳۸، ص۴۷ وغیرہ میں صاف لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر محفل میلاد میں تشریف لاتے ہیں تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا فرض ہے۔ قیام نہ کرنے والا کافر ہے۔ جامع الفتاویٰ ص۱۲۲ ج۱ از مولانا نظام الدین خان بریلوی میں ہے کہ مجلس میلاد میں بوقت صلوٰۃ وسلام قیام کرنا مستحب و مستحسن ہے اور ایک روایت میں واجب لکھا ہے۔ مفتی صاحب تو خیر سے واجب کو روتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ ع

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ایصال ثواب کے لئے ربیع الاول کی تعیین بھی بدعت ہے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحبؒ سے کسی نے سوال کیا تھا:

سوال: پختن طعام در ایام ربیع الاول برائے خدا و رسانیدن ثواب آں بروح پرفتوح حضرت سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت امام حسین علیہ السلام در ایام محرم و دیگر ایام اظہار سید مختار صحیح است یا نہ۔

جواب: ... برائے ایں کار وقتے روز تعین نمودن و مانند مقرر کردن بدعت است آرے اگر در وقتے عمل آرند کہ درآں ثواب زیادہ شود مثل ماہ رمضان کہ عمل بندہ مومن بہ ہفتاد درجہ ثواب زیادہ در و مضاعف میشود زیرا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بداں ترغیب فرمودہ اند بلفظ

حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ "و ہر چیزیکہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نیافتہ آں
فعل عبث است و مخالف سنت سید الانام و مخالفت سنت حرام است پس ہرگز روا نباشد
و دیگر دشمن خواہد گشت خیرات کہ مدد بر روز کہ باشد نمودہ نشود" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص [illegible])۔

ایک عقل مند اور صاحب انصاف کو یہ دلائل بس ہیں۔ نہ ماننے والے کے لئے کوئی دلیل
سود مند نہیں ہے۔

عرس کرنا

بزرگان دین سے حسن عقیدت اور محبت الحب فی اللہ کے موافق افضل ترین اعمال میں داخل
ہے۔ ان کے نقش قدم پہ چلنا اور ان کی صحیح معنی میں پیروی کرنا باعث سعادت ہے۔ ان کی وفات
کے بعد ان کے لئے شرعی قواعد کے تحت ایصال ثواب کرنا اور ان کے رفع درجات کے لئے دعا کرنا،
ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر قریب ہو تو اس پہ حاضر ہو کر دعا کرنا اور سنت کے مطابق
سلام کہنا بھی درست اور جائز ہے۔ ہاں البتہ دور دراز کی مسافت طے کر کے زیارت قبور کے لئے
جانا، اہل سنت میں مختلف فیہ امر ہے اور منع کرنے والے حضرات حدیث لا تشد الرحال الا الی
ثلاثۃ مساجد (الحدیث) سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ طور سے واپس آئے تو
اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ (المتوفی سنہ [illegible]) نے اسی حدیث سے
طور کا سفر اختیار کرنے کی ممانعت ثابت کی اور فرمایا۔ اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! اگر میں آپ سے آپ کے طور
پر جانے سے پہلے ملاقات کر لیتا تو اسی حدیث کے تحت میں آپ کو ہرگز وہاں نہ جانے دیتا۔ (نسائی
ج ۱ ص [illegible]) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حق میرے
نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کا محل اور طور سب کے سب اسی
نہی میں برابر ہیں (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص [illegible]) بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص اجمیر میں حضرت خواجہ چشتی رحمہ اللہ
کی قبر پر یا حضرت سالار مسعود غازی کی قبر یا ان جیسی کسی اور قبر پر اس لئے گیا کہ وہاں کوئی حاجت

طلب کرے تو اس نے ایسا گناہ کیا کہ جو قتل اور زنا سے بھی بدترین گناہ ہے (تفہیمات الٰہیہ ج۲ ص۴۵)
لیکن قبروں کی زیارت کے لئے دن مقرر کرنا اور معین دن میں اجتماع کرنا ہرگز شریعت سے ثابت نہیں ہے اور خصوصاً سال کے بعد جو دن مقرر کیا جاتا ہے جس کو عرس کہتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :

لا تجعلوا قبری عیدا (نسائی، مشکوٰۃ ج۱ ص۸۶) تم میری قبر کو عید نہ بناؤ۔

شراح حدیث نے اس کے متعدد معانی اور مطالب بیان کئے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ :-

لا تجتمعوا للزیارۃ اجتماعکم للعید — تم زیارت کے لئے ایسے مجتمع نہ ہو جیسے کہ تم عید کے لئے مجتمع ہوتے ہو۔

اور یہی اجتماع عرس میں ہوتا ہے جس سے آپ نے منع کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے :-

المراد الحث علی کثرۃ الزیارۃ ای لا تجعلوا کالعید الذی لا یاتی فی السنۃ الا مرۃ ۔ (ذکرہ فی المرقات، اشعۃ اللمعات ج۱ ص۸۶) — کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت زیارۃ پر آمادہ کیا گیا ہے کہ تم میری قبر کو عید کی طرح نہ بناؤ جو سال میں صرف ایک ہی مرتبہ آتی ہے۔

اور عرس بھی مقرر طور پر سال میں صرف ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے اور ایسا کرنا اس حدیث کے خلاف ہے جب آپ کی قبر پر عرس کرنا اور میلہ لگانا درست نہ ہوا تو کسی اور کی قبر پر کیسے صحیح اور درست ہوگا!

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :

لا تجعلوا زیارۃ قبری عیدا اقول ہذا اشارۃ الی سد مدخل التحریف کما فعل الیہود والنصاریٰ بقبور انبیاءہم وجعلوہا عیدا وموسما بمنزلۃ الحج ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج۲ ص۷۷ طبع مصر)

میں کہتا ہوں کہ آپ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کی زیارت کو عید مت بناؤ اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ بند کر دیا جائے کیونکہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح عید اور موسم بنا دیا تھا۔

تو جیسے حج کے لئے ایام کی تخصیص اور خاص اہتمام کیا جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح یہود اور نصاریٰ

نے قبور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا اور ماشاء اللہ تعالیٰ تمام کے مسلمانوں نے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کے علاوہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں (بلکہ مصنوعی قبروں) سے بھی وہ کچھ کیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ بھی شرما جائیں۔ نیز تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومن اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور واتخذوا اعیادا (تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۶۴)

بڑی بدعتوں میں سے یہ ہے کہ لوگوں نے قبروں کے بارے میں بہت کچھ اختراع کیا ہے اور قبروں کو میلہ گاہ بنا لیا ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

سوال: برائے زیارت قبور روز معین نمودن و روز عرس ایشاں کہ معین است رفتن درست است یا نہ؟

جواب: "برائے زیارت قبور روز معین نمودن بدعت است، و اصل زیارت جائز و تعیین وقت در سلف نبود و ایں بدعت از آں قبیل است کہ اصلش جائز است و خصوصیت وقت بدعتی مثل مصافحہ بعد العصر کہ در بعض بلاد توران وغیرہ رائج است و روز عرس برائے یاد دہانی تعیین وقت زیارت اگر باشد مضائقہ ندارد لیکن التزام آں نیز بدعت است از ہمیں قبیل کہ گذشت۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸۹)

جناب قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفیؒ لکھتے ہیں:

لا یجوز ما یفعلہ الجہال بقبور الاولیاء والشہداء من السجود والطواف حولہا واتخاذ السرج والمساجد الیہا ومن الاجتماع بعد الحول کالاعیاد ویسمونہ عرسا۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۶۵)

کہ جاہل لوگ حضرات اولیاء و شہداء کے مزارات کے ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں یعنی ان کو سجدہ کرنا، ان کے گرد طواف کرنا اور ان پر چراغاں کرنا اور ان کی طرف سجدہ کرنا اور عیدوں کی طرح ان پر جمع ہونا جس کا نام عرس ہے۔

اور ارشاد الطالبین ص ۲۱ میں لکھتے ہیں:

"قبور اولیاء بلند کردن و گنبد بر آں ساختن و عرس و امثال آں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است بعضے از آں حرام است و بعضے مکروہ۔ پیغمبر خدا ﷺ بر شمع افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ۔"

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب لکھتے ہیں کہ:

مقرر ساختن روز عرس جائز نیست (مسائل اربعین ص۲۶)   عرس کا دن مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، بہت سی برکات جمع ہو جاتی ہیں (جاء الحق ص۳۱۲)۔ تو یہ صرف سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔ چنانچہ الشیخ علی متقی الحنفی لکھتے ہیں:

الاجتماع لقراءة القرآن على الميت بالتخصيص في المقبرة او المسجد او البيت بدعة مذمومة (رسالہ رد بدعات)   کہ تخصیص کے ساتھ قبرستان میں یا مسجد میں یا گھر میں میت کے لئے قراءت قرآن کے لئے اجتماع کرنا بدعت مذمومہ ہے۔

جب یہ اجتماع ہی بدعت مذمومہ ہے تو لوگوں کے قرآن خوانی کے لئے جمع ہونے کا کیا معنی؟ اور مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا ان روایات سے استدلال کرنا جن میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سال کے بعد شہداء کی قبروں پر السلام علیکم الخ کے الفاظ سے دعا کیا کرتے تھے اور اسی طرح آپ کے بعد حضرات خلفاء راشدین بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، تو ان سے ان کا استدلال باطل ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ یہ روایتیں کتب حدیث کے اس طبقہ کی ہیں جن میں بکثرت باسند صحیح احادیث کے بجائے پرست کا تو اول ہے اکثر احادیث کو محققین ہرگز قبول نہیں کرتے نہ عقیدہ میں اور نہ عمل میں (دیکھئے عجالہ نافعہ ص۶) وثانیاً ان روایتوں میں اجتماع کا کہیں ذکر نہیں اور نہ قرآن خوانی اور مجلس وعظ منعقد کرنے کا کہیں ذکر ہے۔ الغرض کوئی صحیح نقلی یا عقلی دلیل عرس کے جواز پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں: "فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب الحظر والاباحۃ ص۵۸ میں ہے۔ زیارت بزرگان کے لئے سفر کر کے جانا علماء اہل سنت میں مختلف ہے۔ بعض درست کہتے ہیں اور بعض ناجائز، دونوں اہل سنت کے علماء ہیں، مسئلہ مختلف ہے اس میں تکرار درست نہیں۔ اور فیصلہ بھی ہم مقلدوں سے محال ہے۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ اب کسی دیوبندی کو حق نہیں کہ سفر عرس سے کسی کو منع

کرے کیونکہ مولوی رشید احمد صاحب مکرات سے منع فرماتے ہیں اور اس کا فیصلہ نہیں فرماسکتے (جاء الحق صفحہ ۳۱۲)

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اس عبارت سے سفر عرس کے جواز پر استدلال کرنا مفتی احمد یار خاں صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے خود یہ مسئلہ یوں حل کیا ہے۔

الجواب: قبور بزرگان کی زیارت کو سفر کر کے جانا مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء درست کہتے ہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس میں تنازع نہیں چاہیئے مگر ہاں عرس کے دن زیارت کو جانا حرام ہے فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم صفحہ ۱۰۴)

اب فرمائیے کہ کسی دیوبندی کو سفر عرس سے منع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

اور پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں کہ زیارت قبور کے لئے دن مقرر کرنا اور عرس کرنا بدعت ہے اور قاضی صاحبؒ نے بعض اشیاء حرام و بعض مکروہ لکھا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی دیگر عبارتیں حضرت مولانا گنگوہیؒ کا مآخذ ہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے پیر ان پیر حضرت شاہ حمزہ صاحب مارہرویؒ (المتوفی ۱۱۹۸ھ) نے یہ وصیت کی تھی کہ فاتحہ میری بالکل مذکریں کہ حکم اسی طرح سے ہے۔ (انوار العارفین صفحہ ۴۹۶) لیجئے اب یہاں منع میں بریلویوں کا پیر بھی شریک ہو گیا۔

ذکر بالجہر

اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک عمدہ ترین عبادت ہے اور دعا کرنا بھی ایک اعلیٰ ترین نیکی اور قربت ہے مگر اُسی طریقے سے جس سے شریعت محمدیہ نے راہنمائی کی ہے۔ جس موقع پر جہر کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم ہے (مثلاً عرفہ کی فجر سے لے کر آخر ایام تشریق تک عام اور حج کے دنوں میں تلبیہ وغیرہ) تو وہاں جہر کرنا سنت ہے۔ اور جہاں جہر کا حکم نہیں دیا وہاں آہستہ ذکر کرنا بہتر ہوگا۔ اور اسی صورت میں شریعت کی مراد پوری ہوگی۔ اور یہی حکم ہے دعا کا۔ اگرچہ حضرات صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) نے اور ان کے علاوہ بعض مقامات میں امام ابن حزمؒ اور اکثر صوفیاء کرامؒ نے اکثر مقامات پر جہر سے ذکر کرنے کو صرف پسند

کیا جاتا ہے لیکن ذکر کرنے والوں کو نہ تو ملامت کی اور نہ وہابی کہا۔ مگر دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ذکر ہو یا دعا آہستہ طریقے سے بہتر ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ جب حضرات ائمہ اربعہ کا ایک مسئلہ پر اتفاق ہو رہا ہے تو کیا امید رکھنی چاہیے کہ حق ان کے ساتھ ہے اور پھر آج اگر صرف ذکر بالجہر کو پسند ہی کیا جاتا اور دوسرے پہلو کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا تب بھی ایک بات ہوتی مگر غضب تو یہ ہے کہ آج ذکر بالجہر نہ کرنے والے کو وہابی وغیرہ کہہ کر اسے ملامت کی جاتی اور محلِ طعن بنایا جاتا ہے، اور آج مسلمان اور اہل سنت ہونے کی یہ علامت قرار دی جا رہی ہے کہ اگر ذکر بالجہر کرتا ہو تو سنی ورنہ وہابی۔ اس لئے اس مسئلہ پر غور کی ضرورت ہے۔ مختصر طریق پر دلائل عرض ہیں۔ غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (الآیہ پ ۹، اعراف ع ۲۴)

اور ذکر کر اپنے رب کا اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے اور جہر سے کم آواز میں

اور فرمایا کہ :

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (پ ۸، اعراف، رکوع ۷)

پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے اور چپکے بیشک وہ محبت نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کے ساتھ۔

اس آیت کریمہ میں ذکر اور دعا کرنے کے لئے دو قیدیں لگائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر اور دعا نہایت اخلاص، عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو، اور دوسری یہ کہ آہستہ اور چپکے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایک موقع پر بلند آواز سے ذکر کیا تو آپ نے ان کو منع کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ :

؎ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں واختار ان الامام والمأموم يخفيان الذكر الا ان احتيج الى التعليم (فتح الباری ج ۲ ص ۲۶۱) کہ مختار بات صرف یہی ہے کہ امام اور مقتدی دونوں ذکر آہستہ کریں۔ ہاں مگر جب تعلیم کی ضرورت محسوس ہو تو الگ بات ہے۔

أیها الناس اربعوا علیٰ انفسکم فانکم لیس تدعون اصم ولا غائبا وانکم تدعون سمیعا قریبا وهو معکم (بخاری ج ۲ ص ۹۴۵ ومسلم ج ۲ ص ۳۴۶ واللفظ له)

اے لوگو! اپنی جان پر نرمی کرو، تم ایسی ذات کو نہیں پکار رہے جو بہری یا غائب ہو، تم تو سمیع اور قریب ذات کو پکار رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے روکتے ہوئے آہستہ ذکر کرنے کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

ففیه الندب الی خفض الصوت بالذکر اذا لم تدع حاجة الی رفعه (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۴۶)

کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آہستہ ذکر کرنا بہتر ہے جبکہ کوئی داعیہ رفع صوت کا پیش نہ آئے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن حزم ظاہریؒ (المتوفی ۴۵۶ھ) وغیرہ نے نمازوں کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنے کو مستحب کہا ہے لیکن:

وقال ابن بطالؒ المذاهب الاربعة علیٰ عدم استحبابه (البدایه والنهایه ج [illegible] ص [illegible])

ومثله فی فتح الباری ج ۲ ص [illegible]

حضرت ابن بطالؒ فرماتے ہیں کہ چاروں مذہب اس پر متفق ہیں کہ جہر سے ذکر کرنا مستحب نہیں ہے۔

امام ابن حزمؒ وغیرہ کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ فرماتے ہیں:

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبة کان علیٰ عهد النبی صلی اللہ علیه وسلم (مسلم ج ۱ ص ۲۱۷)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔

حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

ونقل ابن بطالؒ وآخرون ان اصحاب المذاهب المتبوعة وغیرهم متفقون علیٰ عدم استحباب رفع الصوت بالذکر والتکبیر.

امام ابن بطالؒ وغیرہ علماء نے یہ بات نقل کی ہے کہ مذاہب جن کی دوسرے لوگ اتباع کرتے ہیں (یعنی ائمہ اربعہؒ) اور اسی طرح دیگر ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ جہر آواز سے

وحمل الشافعیؒ ہذا الحدیث علی انہ جہر وقتا یسیرا حتی یعلمہم صفۃ الذکر لا انہم جہروا دائماً۔ (شرح مسلم ج ۱ صکالا)

ذکر کرنا اور تکبیر کہنا مستحب نہیں ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مطلب امام شافعیؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک لوگوں کو تعلیم دینے کی غرض سے ذکر بالجہر ہوتا رہا، نہ یہ کہ انہوں نے اس پر دوام کیا۔

اور یہی بات قرین قیاس و انصاف ہے۔ ورنہ ضرور ذکر بالجہر پر حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل ہوتا اور حضرت ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہرگز ذکر بالجہر اور بلند آواز سے درود شریف پڑھنے والوں کو یہ فرماتے ہوئے مسجد سے نہ نکال دیتے کہ تم نے صحابہؓ کی موجودگی میں تاریک بدعت ایجاد کی ہے ؟ جس طرح جہر سے بطریق تعلیم بسم اللہ پڑھنا آپ سے ثابت ہے لیکن اس پر دوام کرنا بدعت ہے جیسا کہ حضرت ابن مغفلؓ سے نقل ہو چکا ہے، اسی طرح ذکر بالجہر کا مسئلہ ہے۔ علامہ حلبی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

وعند ابی حنیفۃؒ ان رفع الصوت بالذکر بدعۃ مخالف للامر فی قولہ تعالٰی ادعوا ربکم الایۃ (کبیری ص۱۲۶)

حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے کہ تم چپکے چپکے عاجزی سے اپنے رب کو پکارو۔

اس عبارت سے بصراحت یہ معلوم ہوا کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا امام اعظمؒ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے مذکورہ ارشاد کے مخالف بھی ہے اور بدعت بھی ہے۔ فریق مخالف کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ذکر بالسر کرنے والوں کو وہابی کہتا ہے اور ذکر بالجہر کو اہل سنت کی علامت قرار دیتا ہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

حضرت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

وقد نص بعض علمائنا بان رفع الصوت فی المسجد ولو بالذکر حرام (مرقات ج ۱ المشکوٰۃ ج ۲ ص۲۴۳)

ہمارے بعض علماء نے صراحت سے یہ حکم بیان کیا ہے کہ مسجد میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے ساتھ ہو حرام ہے۔

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرت امام اعظمؒ ذکر بالجہر کو بدعت فرماتے ہیں اور حضرت ملا علی قاریؒ اس کا حرام ہونا نقل کرتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں کہ "مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں اور

طرح طرح کے حیلوں سے اس کو روکنا چاہتے ہیں۔ ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے، اصولِ حنفیہ کے خلاف ہے الخ (جاء الحق ص۲۹۱)۔ انصاف سے فرمائیں کہ یہ حرام اور بدعت کس نے کہا ہے؟ کیا امام اعظمؒ اور ملا علی قاریؒ بھی آپ کے مخالفین کی فہرست میں شامل ہیں؟ اور کیا وہ بھی طرح طرح کے حیلوں سے اس کو منع کرنے والوں میں ہیں؟ خوب جوش میں آکر جواب دیتا، بھٹی تو جیوا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

اما الدعاء فیسر بہ بلا خلاف (شرح مسلم ج۱ ص۲۱۷)   اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ دعا آہستہ کرنی چاہئے۔

امام سراج الدین الحنفیؒ اور ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

یستحب فی الدعاء الاخفاء ورفع الصوت بالدعاء بدعۃ (فتاویٰ سراجیہ ص۸۲ و موضوعات کبیر ص۱۰۸)۔   کہ مستحب یہ ہے کہ دعا آہستہ کی جائے اور بلند آواز سے دعا کرنا بدعت ہے۔

یہ تمام عبارات اپنے مفہوم میں بالکل نصِ صریح اور واضح ہیں اور یہی پہلو سیرت اور منشاءِ شریعت کے قریب تر ہے۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا بحوالہ شامی یہ نقل کرنا کہ "متقدمین اور متاخرین نے اس پر اتفاق کیا کہ مسجدوں میں جماعتوں کا بلند آواز سے ذکر کرنا مستحب ہے، مگر یہ کہ اُن کے جہر سے کسی سونے والے یا نمازی یا قاری کو پریشانی ہو" (جاء الحق ص۲۹۲) تو یہ ہرگز قابلِ التفات نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب قرآن کریم اور حدیث شریف میں آہستہ ذکر کرنے کا حکم ہے تو اس کے خلاف کسی کا عمل کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟ وثانیاً حضرات ائمہ اربعہؒ جہر سے ذکر کرنے کو غیر مستحب کہتے ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ اس کو بدعت کہتے ہیں۔ نیز تصریح کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے۔ جب حضرت ائمہ اربعہؒ کا ذکر بالجہر کے خلاف اتفاق ہے تو ذکر بالجہر کے جواز پر اتفاق کیسے ہوا؟ اور کیا حضرات ائمہ اربعہؒ متقدمین میں نہ تھے؟ وثالثاً علماء متاخرین بھی ذکر بالجہر کے مستحب ہونے پر ہرگز متفق نہیں ہیں۔ ہر مسلک کے علماء نے اس کی تردید کی ہے۔ حتیٰ کہ حضرات صوفیاء کرام بھی اس پر متفق نہیں ہیں دیکھئے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اسی طرح دیگر علماء اور فقہاء و محدثین کی کتابیں بغور ملاحظہ کیجئے۔ محض اتفاق کے خوشنما الفاظ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ باقی مفتی احمد یار خان

صاحب کا رسالہ دلائل الاذکار صلا کے مصنف شیخ محمد صاحب تھانویؒ کے حوالے سے یہ نقل کرنا کہ "حضور علیہ السلام نماز کے بعد صحابہ کرامؓ کے ساتھ تسبیح و تہلیل بلند آواز سے پڑھتے تھے" (جواہر الحق صلا) تو یہ دلیل بھی چنداں مفید نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب تک اصول حدیث کے مطابق اس کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو جائے اس سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ وثانیاً اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب بھی وہی ہوگا جو حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا حضرت امام شافعیؒ نے بیان کیا ہے کہ کسی وقت تعلیم کے لئے آپ نے ایسا کیا تھا بعد کو چھوڑ دیا، دوام اس پر ہرگز نہ ہوا تھا۔ اگر دوام ہوتا تو حضرات ائمہ اربعہؒ کبھی ذکر بالجہر کو غیر مستحب نہ کہتے۔ یہ ایک ایسی بین حقیقت ہے جس کا ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذکر بالجہر اور آہستہ ذکر کی بحث لا محالہ طویل ہے مگر راقم کی مستقل کتاب حکم الذکر بالجہر و الاخفاء ملاحظہ کریں، بخوف طوالت یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اس کے مضمون کو عرض کیے جا سکیں۔ واللہ الموفق۔

مزاراتِ حضرات اولیاءِ کرام کو پختہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ حتی المقدور قبور کی توہین نہ کی جائے یعنی قبور پر بیٹھنا، ان کو روندنا، وہاں پیشاب و پاخانہ کرنے جانا اور قبور کی شکل و صورت کو بگاڑنا وغیرہ سب امور شریعت میں ممنوع ہیں۔ قبر مسلمان کی عالم برزخ میں ایک رہائش گاہ ہے، اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور اس کی توہین ہرگز درست نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قبروں کو پختہ بنانا یا ان پر گنبد وغیرہ بنانا بھی کیا اس احترام میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب ایک مسلمان با تہذیب کے لئے بالکل آسان ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ قبور پر گنبد وغیرہ بنانے میں احترام نہیں اور نہ بنانے میں ہرگز توہین نہیں ہے کیونکہ اگر قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر گنبد وغیرہ تعمیر کرنے میں احترام ہوتا اور اس میں کوئی بھی شرعی فائدہ اور دینی مصلحت ہوتی تو سرور دو جہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز اس سے منع نہ کرتے۔ اگر آج مولوی احمد رضا خان اور مولوی عبد السمیع صاحب اور مولوی محمد عمر اور

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کہ اس میں دینی مصلحتیں اور شرعی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جس کی بنا پر وہ یہ سب کچھ جائز کہتے اور اس کو کار ثواب اور کم از کم مستحب سمجھتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کیوں اس سے منع کیا اور ان دینی فوائد اور مصالح سے کیوں اُمت کو محروم رکھا؟ غرضیکہ یہ تمام تر فوائد اور مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہونے کی وجہ سے مردود اور باطل ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ بقول

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ وان یقعد علیہ۔ (مسلم ج ۱ ص ۳۱۲، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۴۸ و ترمذی ج ۱ ص ۱۲۵)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع کیا ہے۔

جب سرور دو جہان امام الانبیاء سید الرسل اور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے تو کون ماں کا لال ہے جو آپ کی منع کی ہوئی چیز میں کوئی مصلحت اور فائدہ ثابت کر سکے۔ گنبد کے ساتھ پختہ بنانے اور قلم خوش کے ساتھ کچھ لکھ دینے کا نام ثبوت نہیں ہوتا۔ حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

والبناء علیہ فان کان فی ملک البانی فمکروہ وان کان فی مقبرۃ مسبلۃ فحرام نص علیہ الشافعی والاصحاب قال الشافعی فی الام ورأیت الائمۃ بمکۃ یأمرون بھدم ما یبنی ویؤید الھدم قولہ ولا قبرا مشرفا الا سویتہ۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲)

قبر پر عمارت بنانا اگر وہ جگہ عمارت بنانے والے کی ملک میں ہے تو مکروہ ہے اور اگر عام مقبرہ میں ہے تو حرام ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور دیگر اصحاب نے صراحت سے اس کو بیان کیا ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں ائمہ کو قبر پر عمارت کو ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا ہے اور ولا قبرا مشرفا والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھئے کہ حضرت امام شافعیؒ نے جو مکہ مکرمہ میں حضرات ائمہ کو قبروں پر عمارت ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا، یہ کون امام تھے؟ اور کیا یہ گمراہوں اور وہابیوں کے امام تھے جو مکہ مکرمہ جیسی پاک سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں اور حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں کی حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ میں یوں توہین کرتے تھے؟ مفتی احمد یار خان صاحب تو یوں لب کشائی کرتے ہیں، ''نوٹ ضروری: اس حدیث کو آڑ بنا کر نجدی وہابیوں نے صحابہ کرامؓ و اہل بیت کے مزارات کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیا۔'' (بلفظہٖ جاء الحق صفحہ ۲۸۲)

حضرت امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) فرماتے ہیں کہ:

ولا نری ان یزاد علی ما خرج منه و نکرہ ان یجصص او یطین او یجعل عندہ مسجدا ... ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نھی عن تربیع القبور و تجصیصھا قال محمد به ناخذ وھو قول ابی حنیفة۔ (کتاب الآثار امام محمدؒ صفحہ ۴۵)

ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے۔ اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر پختہ بنائی جائے یا اس پر لپائی کی جائے (آگے فرمایا) اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو مربع بنانے سے اور اس کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

حضرات کیا کسی مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کو رد کر دے؟ اور کیا کسی حنفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول اور ان کا فتویٰ جس کی بنیاد صحیح حدیث پر ہو ترک دے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حنفی کا حنفی بنا رہے۔ یاد رہے کہ یہ قول حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ان کے بلاواسطہ شاگرد حضرت امام محمدؒ نقل کرتے ہیں اور اپنا مذہب بھی یہی بتاتے ہیں۔ مفتی احمد یار خان صاحب کی خیانت یا جہالت ملاحظہ کیجئے، کہ وہ امام شعرانیؒ (المتوفی ۹۷۳ھ) کے حوالے سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ قبروں پر مکان اور گنبد بنانا اور قبروں کو پختہ کرنا جائز ہے، اور پھر آگے اس قاعدہ کو فتح کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان

صاحب یوں انعام فرماتے ہیں: اب تو رجسٹری ہو گئی کہ خود امام مذہب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان مل گیا کہ قبر پر قبہ وغیرہ بنانا جائز ہے" (ملفوظ جاء الحق ص۲۸۲) سبحان اللہ تعالیٰ اور کیا صدی کے ایک صوفی کی بے سند نقل اور بے سروپا روایت سے (جو نقل مذاہب میں سینکڑوں غلطیاں کر جاتے ہیں) حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں قبوں کے جواز پر رجسٹری ہو گئی اور حضرت امام محمدؒ کی نقل سے جو امام صاحبؒ کے بلا واسطہ شاگرد اور نقل مذہب میں بڑے حافظ اور معتبر ہیں، ان کے قول اور نہی سے قبوں کے عدم جواز پر رجسٹری نہ ہوئی؟ شعر

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

صریح حدیث اور حضرت امام صاحبؒ کے قول کے بعد ضرورت تو نہیں، مگر تکمیل فائدہ کیلئے حضرات فقہاء احناف کی چند عبارتیں اور ملاحظہ کر لیجئے تاکہ اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے۔

علامہ حلبی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ تجصیص القبر و تطیینہ و بہ قالت الائمۃ الثلاثۃ الیٰ ان قال وعن ابی حنیفۃ انہ یکرہ ان یبنی علیہ بناء من بیت او قبۃ او نحو ذلک لما مر من الحدیث آنفاً (کبیری ص۵۹۹)

قبر کو پختہ بنانا اور اس کی لپائی کرنا مکروہ ہے اور یہی تینوں اماموں کا قول ہے (پھر آگے فرمایا) اور امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ قبر پر مکان یا قبہ یا اس کی مانند کوئی اور عمارت بنانا مکروہ ہے۔ اور یہ مذکورہ حدیث اس کی دلیل ہے۔

امام سراج الدین اودی الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۷۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ البناء علی القبور (فتاویٰ سراجیہ ص۲۴) قبور پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

امام قاضی خان الحنفیؒ (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یجصص القبر لما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نہی عن التجصیص والتقضیض وعن البناء فوق القبر (قاضی خاں ج ۱ ص۱۹۴)

قبر کو پختہ نہ بنایا جائے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے اور چونے کے پانی سے چھڑکاؤ کرنے اور قبر پر عمارت بنانے سے منع کیا ہے۔

حافظ ابن ہمام الحنفیؒ (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن تربیع القبور وتجصیصہا (فتح القدیر ج ۲ ص ۱۰۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کے مربع اونچا بنانے اور ان کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ویسنم القبر قدر الشبر ولا یربع ولا یجصص ویکرہ ان یبنی علی القبر۔ (عالمگیری مصری ج ۱ ص ۱۶۶)

قبر کو اونٹ کے کوہان کی طرح بنانا چاہیئے اور وہ بھی صرف ایک بالشت۔ اور قبر کو مربع نہ بنایا جائے اور نہ اس کو پختہ کیا جائے۔ اور قبر پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

علامہ ابن عابدین الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

اما البناء فلم ار من اختار جوازہ۔ (شامی ج ۱ ص ۶۰۱)

مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے عمارت بنانے کے جواز کو پسند کیا ہو۔

نوٹ: مطلق مکروہ[1] حضرت امام اعظمؒ اور دیگر سلف صالحین کی اصطلاح میں مکروہ تحریمی پر اطلاق ہوتا ہے چنانچہ علامہ ابوالمکارم الحنفیؒ (المتوفی سنہ ۹۰۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

المکروہ التحریم عند الامام (ابو المکارم ج ۱ ص ۱۲۷)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ سے مراد حرام ہے۔

اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں:

حافظ ابن القیمؒ در اعلام الموقعین تصریح کردہ است باکثر استعمال کراہت در محاورہ سلف تحریم بود۔ (الدلیل الطالب ص ۲۵۶)

کہ حافظ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے کہ حضرات سلفؒ کے محاورہ میں کراہت کا اطلاق و استعمال تحریم پر ہوتا تھا۔

حضرت ملا علی القاریؒ حدیث من ابتدع بدعۃ ضلالۃ کی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وہی ما انکرہ ائمۃ المسلمین کالبناء علی القبور وتجصیصہا۔ (مرقات ج ۱ ص ۱۷۹)

بدعت ضلالت وہ ہے جس کا ائمہ مسلمینؒ نے انکار کیا جیسے قبر پر عمارت بنانا اور ان کو پختہ کرنا۔

---

[1] آفندی کی حاشیہ توضیح ص ۲۹۲ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دونوں سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ مکروہ سے کراہت تحریمیہ مراد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مسلمین نے قبر پر عمارت بنانے اور اس کو پختہ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور اس کو بدعت قرار دیتے ہوئے انکار کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں :

آنچہ بر قبور اولیاء عمارات رفیعہ بنا میکنند	وہ جو کچھ کہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر کیا جاتا ہے
و چراغاں روشن می کنند و ازیں قبیل ہر چہ میکنند	کہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور چراغ روشن کرتے
حرام است۔ (مالا بد منہ ص۹۵)	اور اس قسم کی جو چیزیں بھی کرتے ہیں، حرام ہے۔

ایک منصف مزاج اور حق کے متلاشی کے لئے یہ قرآنی اور حدیثی دلائل بالکل کافی ہیں البتہ معاند اور سرکش کے لئے دلائل کا انبار بھی ناکافی ہے ـــــــ مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ نے شیخ عبد الغنی نابلسیؒ صاحب کشف النور و الحدیقہ اور امام طحطاویؒ اور طحطاوی وغیرہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مشائخ، علماء اور سادات کی قبروں پر عمارت اور گنبد بنانا جائز ہے، اور اس کو کم از کم مستحب اور جواز کا اختیار کیا ہے تو یہ سراسر باطل اور مردود ہے۔ اس کا مختصر اور پورا جواب صرف اتنا ہی کافی ہے کہ نہ تو یہ حضرات معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر جناب نبی معصوم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امام مجتہد کے صریح ارشاد کے مقابلہ میں ان کی بات کون سنتا ہے؟ رہا مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا یہ ارشاد کہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت محمد بن الحنفیہؒ سے قبروں پر خیمے لگانے کا ثبوت ہے اور اس پر روایتیں نقل کی ہیں تو اولاً اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بے اصل اور بے سند روایتیں ہیں ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔ وثانیاً اگر یہ درست اور صحیح بھی ہوں تب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں ان کی کوئی پوزیشن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ نقل کیا ہے کہ امام زین العابدینؒ کی بیوی نے اپنے خاوند کی قبر پر خیمہ لگایا تھا اس میں بھی مفتی صاحب نے خیانت کی ہے۔ اگر پوری روایت نقل کر دیتے تو خود بخود معاملہ حل ہو جاتا۔ اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ ماتم کے طور پر صدائے غیبی آئی جس نے اس فعل کی نا پسندیدگی کا صاف اعلان کر دیا تھا (مشکوٰۃ جلد ۱ ص۱۵۱) ۔ باقی حضرت عثمان بن مظعون

کی قبر کے سرہانے بطور علامت کے ایک پتھر رکھنے سے قبر پر عمارت اور قبہ بنانے پر استدلال کرنا یہ صرف مفتی صاحب اور ان کے ہم مشرب رفقاء کا ہی کام ہے، آخر مفتی جو ہوئے۔

الغرض قبور حضرات اولیاء کرامؒ پر عمارت اور گنبد بنانے پر کوئی صحیح روایت اور عقلی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف دلائل اور براہین کا انبار موجود ہے۔ وفیما کفایۃ لمن لہ هدایۃ۔

قبوں کو گرانے کا حکم | حضرت امام شافعیؒ کے حوالہ سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں حضرات ائمہ کرامؒ کو قبور پر قبوں کو مسمار کرنے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ولا قبرا مشرفا کی حدیث سے ان کا استدلال تھا۔ اب وہ حدیث سن لیجئے۔ حضرت ابو الہیاج الاسدیؒ (المتوفی سنہ) جو تابعی اور ثقہ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ:

قال لی علیؓ الا ابعثک علی ما بعثنی علیه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان لا تدع تمثالا الا طمسته ولا قبرا مشرفا الا سویته (مسلم، مشکوٰۃ، ترمذی)

مجھے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا میں تجھے اس کام کے لئے نہ بھیجوں جس کے لئے مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھیجا تھا وہ یہ کہ کوئی فوٹو اور مجسمہ مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اس کو برابر کر دینا۔

برابر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قبروں کو زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر دیا جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جو شریعت کے منشا کے مطابق ہیں۔ چنانچہ علامہ علاء الدین الماردینیؒ الحنفیؒ (المتوفی سنہ) لکھتے ہیں کہ:

الا سویته ای سویته بالقبور المعتادۃ۔ (الجوہر النقی علی البیہقی)

برابر کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو ان قبروں کے ساتھ برابر کر دینا جن کا شریعت کی عادت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

حضرت امام بیہقیؒ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر ورفع قبرہ من الارض نحوا من شبر۔ (سنن الکبریٰ ج ۳) زمین سے ایک بالشت کے قریب اونچی تھی۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

ان السنۃ ان القبر لا یرفع علی الارض رفعا — سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے زیادہ اونچی نہ ہو ... بلکہ

كثيرًا — بل يرفع نحو شبر۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲)	صرف ایک بالشت کے اندازہ کی اونچی ہو۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا تھا اور ابوالہیاج اسدی (حضرت علی) کو اس کام کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی نے اپنی خلافت میں یہ کام اپنے ایک پولیس افسر سے لیا جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذموم عمارتیں شریعت کی روح کے سراسر خلاف ہیں۔ اور ان کے وجود کو شریعت گوارا نہیں کرتی اور یہ ممانعت شرعی حکم کے تحت تھی، نہ جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا (جاء الحق ص ۲۹۸)۔ اگر بالفرض یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا تو تمہیں یہ زہد اور تقویٰ کیوں راس نہیں آتا؟

علامہ ابن حجر مکی شافعیؒ (المتوفی ۹۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

تجب المبادرة الى هدمها وهدم القباب التي عليها۔ (کتاب الزواجر ج ۱ ص ۱۲۱)	ان اونچی قبروں کو اور ان قبروں پر جو قبے اور گنبد بنائے گئے ہیں ان کو گرا دینا واجب ہے۔

اور حضرت ملا علی قاری نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ:

ويجب الهدم وان كان مسجدا (مرقات ج ۲ ص ۳۷۲)	گرانا واجب ہے، اگرچہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔

یعنی اگرچہ کسی چالاک اور ہوشیار نے قبروں کے پاس مسجد کا نام دے کر قبے اور گنبد تعمیر کئے ہوں تو ان کو بھی گرانا واجب ہے کیونکہ مسجد قرار بھی آخر مسجد کے نام سے تعمیر کی گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھنے والے اس کے حشر سے آگاہ ہیں۔ علامہ سید محمود آلوسی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اجماعا فان اعظم المحرمات واسباب الشرك الصلوة عندها واتخاذها مساجد او بناءها عليه وتجب المبادرة الى هدمها وهدم القباب التي على القبور اذ هي اضر من مسجد الضرار لانها اسست على معصية رسول الله صلى الله عليه وسلم وتجب ازالة كل قنديل او سراج على قبر ولا يصح	اس پر اجماع ہے کہ حرام ترین اور اسباب شرک کی چیزوں میں سے قبروں کے پاس نماز پڑھنا ہے یا ان پر مسجدیں بنانا یا عمارتیں تعمیر کرنا ہے۔ واجب ہے کہ اونچی قبروں کو اور جو ان پر قبے ہیں ان کو گرا دیا جائے کیونکہ یہ مسجد ضرار سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں، اس وجہ سے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ آپ نے تو اونچی قبروں کو گرانے کا حکم دیا ہے اور واجب ہے کہ

وقفہ و تنذیرہ ۔ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۳۱) قبروں پر جو بھی قندیل یا چراغ ہو اس کو دور کر دیا جائے اور اس کا وقف کرنا اور نذر بھی ناجائز ہے ۔

حافظ ابن القیم الحنبلیؒ (المتوفی ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

لا یجوز ابقاؤها ویجب هدمها (زاد المعاد ج ۳ ص ۲۲) ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے اور ان کا گرانا واجب ہے

اور اسی کے قریب الفاظ شیخ الحنابلہ حافظ ابن تیمیہؒ کے ہیں (ملاحظہ ہو تلخیص کتاب الاستغاثہ ص ...) ۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ کیا حنفیؒ اور کیا شافعیؒ اور کیا حنبلیؒ سب اونچی قبروں اور ان پر تعمیر شدہ قبوں کو گرانے کا حکم دیتے اور اس کو واجب کہتے ہیں ۔

نوٹ : اکثر اہل بدعت حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتے ہیں مگر حضرت ملا علی القاری الحنفیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں :

کانا من اکابر اھل السنۃ والجماعۃ ومن اولیاء ھذہ الامۃ (جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۰۷ طبع مصر) کہ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ دونوں اہل سنت والجماعت کے اکابر میں اور اس امت کے اولیاء میں تھے ۔

اور حافظ ابن القیمؒ کی تعریف کرتے کرتے امام جلال الدین سیوطیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) بھی نہیں تھکتے ۔ (بغیۃ الوعاۃ)

قارئین کرام ! آپ نے ملاحظہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے تحت حضرت علیؓ نے اونچی قبروں کو گرایا اور پھر گرا دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور حضرات علماء کرام اور خصوصاً ملا علی القاری الحنفیؒ اور سید محمود آلوسی الحنفیؒ وغیرہ نے قبروں پر قبوں اور گنبدوں کے گرانے کو واجب کہا ہے مگر مفتی احمد یار خان صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو ۔ وہ لکھتے ہیں کہ " اگر ان کی قبریں پختہ بنی گئی ہوں تو ان کو گرانا حرام ہے " ۔ (جاء الحق ص ۲۹۹ ملخصاً) ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے ایک حرام کام کیا اور کرایا ! اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حرام کام کا حکم دیا (العیاذ باللہ تعالیٰ)

اور کیا اسی حرام کا فتویٰ حضرات فقہاء کرام نے دیا ہے ۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے کیا خوب اور انصاف کی بات ارشاد فرمائی ہے :

سوال : قبور کا پختہ بنانا اور اُن پر عمارات و قبہ و روشنی و فرش فروش وغیرہ جو کچھ کہ لوگ کرتے ہیں الخ ۔ **الجواب** : ہرگاہ کہ احادیث میں ممانعت ان اُمور کی وارد ہے پھر کسی کے فعل سے وہ جائز نہیں ہو سکتے ۔ اور اعتبار قرآن و حدیث و اقوال مجتہدین کا ہے نہ افعال مخالف شرع کا ۔ اگر عرب اور حرمین میں امور غیر مشروع خلاف کتاب و سنت رائج ہو گئے تو جواز اُن کا نہیں ہو سکتا ۔ اور جو والیان ان بدعات کو کوئی منع نہ کر سکے تو یہ حجت جواز کی نہیں ہو سکتی ، اس پر سکوت کی کوئی وجہ نہیں ، کتاب و سنت سے رد کرنا چاہیئے ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم ، رشید احمد عفی عنہ ۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل ص۱۰۲)

فریق مخالفت کا اعتراض | مفتی احمد یار خان صاحب نے اس حدیث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث کہ قبروں کو مٹا دو اور گرا دو ، مشرکین کی قبروں کے متعلق ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکوں کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا اور لکھتے ہیں کہ شیخ ابن حجر مکیؒ ، فتح الباری جلد ۲ ص۱۲۲ میں تحریر فرماتے ہیں (عربی عبارت کا ترجمہ خود مفتی صاحب کی زبانی یہ ہے) کیا جاہلیت کے مشرکین کی قبریں اکھیڑ دی جائیں (باب) فرماتے ہیں یعنی ماسوا انبیاء اور اُن کے متبعین کے کیونکہ ان کی قبریں ڈھانے میں ان کی اہانت ہے (جاء الحق ص۲۸۲) دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کھیل ذکر ہے مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفار کی قبریں مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میت کا فوٹو بھی ہوتا ہے تیسرے اس سے کہ فرماتے ہیں کہ اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو اور مسلمان کی قبر کے لئے سنت ہے کہ زمین سے ایک ہاتھ اونچی ہے (بلفظہ جاء الحق ص۲۸۲)

الجواب : یہ سب باتیں مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور علم سے بے خبری کا نتیجہ ہیں اوّلاً اس لئے کہ فتح الباری کا مصنف وہ ابن حجر مکیؒ کو قرار دیتے ہیں ، حالانکہ فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی تصنیف ہے جو ابن حجر مکیؒ سے اقدم بھی ہیں اور اعلم بھی ہیں ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس بازار میں ایسے لوگ مفتی بن گئے ہیں جن کو فتح الباری جیسی کتاب کے مؤلف کا صحیح علم

نہیں ہے۔ حیرت ہے ایسے مفتی پر۔ وثانیاً مفتی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نبش قبور الگ چیز ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکین کی قبروں کی کھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور مفتی صاحب کے قول کے مطابق شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں اس کی شرح کی ہے۔ اور تسویۃ قبور اور چیز ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وثالثاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابل داد ہے کہ قبر کے ساتھ فوٹو کا ذکر ہے اور مسلمان کی قبر پہ فوٹو کہاں؟ سبحان اللہ تعالیٰ! گویا مفتی صاحب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فوٹو اور قبر ایک ساتھ ہوں، حالانکہ قبروں کو ڈھانے کا حکم الگ ہے اور تصویروں کو مٹانے کا حکم جدا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں اُن کو مٹانا چاہیئے۔ چنانچہ نسائی شریف ج ۲ ص ۲۲۱ میں اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں ولا صورۃ فی بیت "کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا"۔ مفتی صاحب ہی فرمائیں کیا آج کل مسلمانوں کے گھروں میں بھی فوٹو اور تصویریں ہوتی ہیں یا نہیں؟ ورابعاً یہ بھی مفتی صاحب نے خوب کہی کہ اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو۔ حالانکہ ہم علامہ ماوردیؒ کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں کہ زمین کے ساتھ برابر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ مسنون قبروں کے ساتھ برابر کرنا مراد ہے۔ وخامساً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابل داد ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اونچی ہے۔ نہ معلوم یہ کس حدیث کا ترجمہ ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اونچی ہو۔ یہ بریلوی تحقیق بھی بہت ہی نرالی ہے۔ پہلے ملا علی قاریؒ اور عالمگیری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ قبر صرف ایک شبر (بالشت) کے قریب اونچی ہونی چاہیئے۔ [illegible] رد المحتار [illegible] میں بھی قبر کی اونچائی ایک بالشت لکھی ہے۔ وسادساً عجیب بات ہے کہ روایت نقل کرتے ہیں جس سے مفتی احمد یار خان اور ان کی طرح ان حضرات کی کھلی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث مشرکوں کی قبروں سے متعلق ہے۔ چنانچہ مشہور و معروف تابعی حضرت ثمامہ بن شفی الہمدانی مصری روایت کرتے ہیں کہ

قال کنا مع فضالۃؓ بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالۃؓ بقبرہ فسوی ثم قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامر بتسویتھا

ترجمہ: حضرت فضالہؓ بن عبید الانصاری (م ۵۳ھ) کے ساتھ روم کی سرزمین رودس کے مقام پر تھے کہ ہمارا ایک ساتھی فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہؓ نے اس کی قبر کو عام قبروں کے ساتھ برابر کرنے کا حکم دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں نے جناب

(مسلم ج ۱ ص ۳۱۲ و نسائی ج ۱ ص ۲۲۱ و ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۳) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہی روایت اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ امام بیہقیؒ نے یوں نقل کی ہے :

عن ثمامة بن شفيؒ قال خرجنا غزاة زمن معاويةؓ الى هذه الدروب وعلينا فضالة بن عبيد فتوفي ابن عم لي يقال له نافع بن عبد قال فقام فضالة في حفرته فلما دفناه قال خففوا عنه التراب فان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأمرنا بتسوية القبور۔

(سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۳)

ثمامہ بن شفیؒ کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں ان سرحدی قلعوں میں جہاد کرنے کی غرض سے نکلے۔ ہم پر حضرت فضالہؓ بن عبید سالار مقرر تھے۔ میرا چچا زاد بھائی جس کا نام نافعؓ بن عبد تھا وہ فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہؓ ان کی قبر میں کھڑے ہوئے جب ہم ان کو دفن کر چکے تو حضرت فضالہؓ نے فرمایا۔ قبر پر سے مٹی تھوڑی اور ہلکی کرو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ صحیح روایت اس بات کی روشن اور واضح دلیل ہے کہ تسویۂ قبور کا حکم مشرکوں کی قبروں کے ساتھ خاص نہ تھا ورنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور فوج کے سپہ سالار ایک مسلمان کی قبر کے تسویہ کا حکم ہرگز نہ دیتے اور اس پر دلیل یہ نہ پیش کرتے کہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کا دور تھا اور حضرت امیر معاویہؓ (المتوفی ۶۰ھ) کی حکومت تھی۔ کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ حضرت فضالہؓ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تسویۂ قبور کا حکم تو مشرکوں کی قبروں سے متعلق ہے۔

الغرض حضرات صحابۂ کرامؓ سے بلا نکیر یہ امر ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی یہ حکم عام تھا مشرکوں کی قبروں سے اس کی تخصیص کی ہرگز کوئی وجہ ان کے نزدیک نہ تھی۔

باقی عام قبوں کو اور قبروں پر عمارات کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر قیاس کرنا درست نہیں ہے اس لئے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو :

فقال ناس یدفن عند المنبر وقال آخرون یدفن بالبقیع فجاء ابوبکر الصدیقؓ فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما دفن نبی قط الا فی مکانہ الذی توفی فیہ فحفر لہ فیہ۔ (موطا امام مالک ص۲۳۱ و شمائل ترمذی ص۲۷)	بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کو منبر کے پاس دفن کیا جائے اور بعض دوسروں نے کہا کہ آپ کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ نبی صرف اسی جگہ میں دفن کیا جاتا ہے جس میں اس کی وفات ہوئی ہے۔ سو اسی جگہ آپ کی قبر کھودی گئی۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہوئی تھی، لہذا اس حدیث کی رو سے آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ باقی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بالتبع وہاں دفن ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اگر وہ اس جگہ سے باہر کہیں دفن ہوتے تو ہرگز ان کی قبروں پر حضرات صحابہ کرامؓ عمارت تعمیر نہ کرتے۔ جیسے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر ہزاروں کی تعداد میں حضرات صحابہ کرامؓ تھے مگر کسی کی قبر پر نہ تو گنبد بنائے گئے اور نہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ کئی صدیوں کے بعد ترکوں نے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے پیش نظر متعدد قبروں پر گنبد تعمیر کئے۔ مگر ان کا یہ فعل شرعاً کوئی حجت نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے صحیح اور صریح روایت گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے جو کام آپ نے منع کیا ہو وہ کسی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔ الغرض یہ نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک پہلے ہو اور اس پر عمارت بعد کو تعمیر کی گئی ہو۔ بلکہ چونکہ آپ کی وفات ہی اس حجرہ میں ہوئی تھی اس لئے اس سابق حدیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ پھر حسب تحقیق شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ وغیرہ ایک خاص اتفاقی واقعہ پیش آیا جس کے تحت ۵۵۷ھ میں سلطان نور الدین شہید محمود بن زنگیؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے اردگرد نہایت گہری دیوار زمین میں اور رانگ گلا کر اس کو بھر دیا اور مضبوط دیوار قائم کی (دیکھئے جذب القلوب الی دیار المحبوب ص۱۳۹) اور پھر ۶۷۸ھ میں سلطان قلادون صالحیؒ نے یہ گنبد سبز جو اب تک موجود ہے، بنوایا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو اس کا اقرار ہے (دیکھئے جاء الحق ص۲۷۱)

نوٹ ضروری: قبروں پر قبّوں اور گنبدوں کا گرانا صحیح احادیث اور اقوالِ حضرات فقہاء کرامؒ سے ثابت ہے۔ مگر یہ بات اچھی طرح محفوظ خاطر رہے کہ یہ کام سلطانِ اسلام اور اسلامی حکومت کا ہے۔ انفرادی طور پر افراد کا یہ کام نہیں ہے۔ اس لئے عوام کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

قبروں پر چراغ روشن کرنا

قبور پر چراغ و قندیلیں اور موم بتی وغیرہ جلانے کی شریعتِ اسلامی میں کوئی اصل نہیں ہے اور شریعتِ حقّہ اس قبیح حرکت سے نہایت ہی سخت بیزار ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسرج (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۵، موارد الظمآن ص ۲۰۰، نسائی ج ۱ ص ۲۲۲، طیالسی ص ۳۵۷، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۷۱)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اور ان پر چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔

اور اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو موارد الظمآن ص ۲۰۰ و سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۷۸)۔

اور ظاہر ہے کہ جس کام پر سرورِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو وہ کسی وقت اور کسی حیثیت سے جائز اور مستحب نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کے اندر کوئی فائدہ اور خوبی ہو سکتی ہے اور نہ ضرورت اور غیر ضرورت کے مصنوعی پیوند اس میں لگ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب بالکل آزاد اور بدعت پسند اس میں فاسد فوائد اور منافع بتانا شروع کر دیں۔ یہ صرف ان کے منہ کی بات ہے اور جن علماء سے انہوں نے جواز اور استحباب نقل کیا ہے وہ نہ تو معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر معلوم جس کام پر آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو

وہ اولیاء کے کہ تعظیم کیلئے مستحب اور جائز و کارِ ثواب ہو سکتا ہے؟ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولی اور غیر ولی، عالم اور جاہل کی قبر کا کوئی فرق نہیں کیا جس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک قبر پر چراغ روشن کرنا باعثِ لعنت ہے۔ پھر یہ کہنا کہ علیٰ کے معنی اوپر کے ہیں، لہٰذا قبر کے اوپر چراغ جلانا درست نہیں اور اگر آس پاس ہو تو جائز ہے، یہ بھی نری جہالت ہے۔ علیٰ کے معنی میں یہ دونوں مفہوم داخل ہیں۔ آؤ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ کا معنی کیا مفتی احمد یار خان صاحب یہ کریں گے کہ حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بستی میں لوگوں کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے تھے؟ حدیث معراج میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

فمررت علی موسٰی۔ (مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۵۲۸) میرا گزر حضرت موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر ہوا۔

الغرض لفظ علیٰ ارد گرد اور آس پاس کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔ اور آپ نہ کھڑے ہوں کسی منافق کی قبر پر۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ منافق کی قبر کے اوپر چڑھ کر تو کھڑے نہ ہوں، مگر دعا کے لئے ارد گرد اور آس پاس کھڑے ہو جائیں۔ ایک روایت یوں آتی ہے کہ ایک بی بی کی ایام زچگی میں وفات ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے:

فقام علیہا للصلوٰۃ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۰) اس پر کھڑے ہو کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

مفتی صاحب اس کا کیا مطلب لیتے ہیں، یہ ان کی صوابدید پر موقوف ہے۔ غرضیکہ اگر چراغ قبر کے اوپر جلایا جائے، تب بھی ناجائز ہے، اور اگر آس پاس روشن کیا جائے تب بھی باعث لعنت ہے۔ بلکہ دوسری صورت لوگوں میں زیادہ رائج تھی اور اب بھی ہے۔ کیونکہ کسی نے گوارا نہیں کیا کہ کسی بزرگ کی قبر کے تعویذ پر چراغ جلایا جائے۔ لوگ تو بزعم خود حضرات اولیاء کرام کی عزت کے لئے چراغاں کرتے ہیں، اور یہ صورت ان کے خیال میں سراسر توہین کی ہے، پھر بھلا وہ اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ اس لئے قرینِ قیاس یہی بات ہے کہ قبر کے ارد گرد چراغ جلانا زیادہ مذموم ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ اس صورت میں تو حقیقت اور مجاز کا اجتماع لازم ہوگا اور یہ ممنوع ہے۔ (جاء الحق ص۲۸۱) تو یہ ان کی بے خبری کا نتیجہ ہے کیونکہ اس صورت میں یہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز نہیں ہے جو ناجائز ہے، بلکہ یہ عموم مجاز ہے جو جائز ہے۔ اصول فقہ کی کتابیں ملاحظہ کیجئے۔

جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن العاصؓ (المتوفی ۴۳ھ) نے بوقت موت یہ وصیت کی تھی کہ:

فاذا انا مت فلا تصحبنی نائحة ولا نار۔ (مسلم ج۱ ص۷۶)

جب میری وفات ہو جائے تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت جائے اور نہ میرے ساتھ آگ ہو۔

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ (المتوفاۃ ۷۳ھ) نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ:

ولا تتبعونی بنار (موطا امام مالک ص۲۰۷)

میرے ساتھ آگ نہ لے جانا۔

حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

واما اتباع المیت بالنار فمکروہ للحدیث ثم قیل سبب الکراھة کونه من شعار الجاھلیة وقال ابن حبیب المالکی کرہ تفاؤلا بالنار۔ (شرح مسلم ج۱ ص۳۰۸)

میت کے ساتھ آگ لے جانا حدیث کی رو سے مکروہ ہے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ یہ کراہت شعار جاہلیت ہونے کی وجہ سے ہے اور امام ابن حبیب مالکیؒ کہتے ہیں کہ آگ بد فالی اور بد شگونی کی وجہ سے مکروہ ہے (کہ کہیں اس کا تعلق آگ سے ہی نہ ہو جائے)۔

غور کیجئے کہ حضرات صحابہ کرامؓ وفات کے وقت کس طرح وصیت کرتے ہیں کہ وفات کے بعد آگ ہمارے قریب نہ آنے دینا۔ مگر غضب ہے کہ آج قبروں پر خوب لگا کر چراغ روشن کئے جاتے ہیں اور یہ منطق پیش کی جاتی ہے کہ اس میں حضرات اولیاء کرامؒ کی عظمت ہے، راستہ پر چلنے والوں کیلئے سہولت ہے۔ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر حضرات اولیاء کرامؒ کی یہ تعظیم و توقیر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی خلاف ورزی سے ہوتی ہے اور اگر ان کی محبت لعنت کا کام کرنے سے ہوتی ہے تو ہم برملا کہتے ہیں کہ یہ تعظیم مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ہی نصیب ہو۔ ہمارے نزدیک خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے آگے

تسلیم کرنے سے ہی حضرات اولیاء کرام اور بزرگان دین کی تعظیم ہوتی ہے تو ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اتخاذ القبور مساجد وإيقاد السرج عليها (زاد المعاد ج ۱ ص ۶۶۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ روشن کرنے سے منع کیا ہے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:

وإيقاد النار على القبور من رسوم الجاهلية

قبروں پر آگ جلانا جاہلیت کی رسم ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص ۳۵۱)

اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۷ عن البخاری)

علامہ سید محمود آلوسی حنفیؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کا یہ حوالہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر چراغ افروزان نزد قبور و سجدہ کنندگان لعنت گفتہ (ارشاد الطالبین ص ۲۲) اور مفتی احمد یار خان صاحب بھی اس کو نقل کرتے ہیں اور نیز لکھتے ہیں کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ بھی قبروں پر چراغ روشن کرنے کو بدعت شنیعہ لکھتے ہیں (جاء الحق ص ۲۸۵-۲۸۶)۔

اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ لکھتے ہیں:

واما ارتکاب محرمات از روشن کردن چراغہا و ملبوس ساختن قبور و سرود و تواجد و معازف بدعات شنیعہ اند و حضور چنیں مجالس ممنوع۔ (فتاویٰ شاہ رفیع الدین ص ۱۴۱)

یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کرنا مثلاً قبروں پر چراغ جلانا اور ان پر چادریں چڑھانا اور سرود اور گانے بجانے کے آلات استعمال کرنا بدعات شنیعہ میں سے ہے اور ایسی مجالس میں حاضر ہونا ممنوع ہے۔

حضرات آپ نے ملاحظہ کیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت کے علماء حق تک قبروں پر چراغ روشن کرنے کو باعث لعنت، حرام، مکروہ، بدعت اور بدعت شنیعہ سے تعبیر کرتے ہیں تو پھر

بھلا اس مذموم فعل میں بھلائی اور خوبی آگئی تو کہاں سے آگئی؟ مگر سچ ہے کہ بدمعلے کا سہ

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت ﴿ کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

مفتی احمد یار خان صاحب کی تجگشت | مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب و قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہما بے شک بزرگ ہستیاں ہیں لیکن یہ حضرات مجتہد نہیں تا کہ کراہت تحریمی و حرمت فقط ان کے قول سے ثابت ہو۔ اس کے لئے مستقل دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔" (بلفظہ جاء الحق ص۲۸۹) مفتی صاحب کی یہ بات قابل صد تحسین ہے کہ انہوں نے ایک حق بات تو زبان سے نکالی ہے اور اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ دلیل شرعی کے مقابلہ میں بزرگ سے بزرگ ہستیاں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہی تو ہمارا اور اہل بدعت کا اصولی جھگڑا ہے کہ ہم قرآن کریم، حدیث شریف اور حضرات صحابہ کرامؓ اور اجماع امت جیسی شرعی دلیل کے مقابلہ میں کسی بھی بزرگ ہستی کی بات کو حجت نہیں تسلیم کرتے۔ اور اہل بدعت نے انہی بعض بزرگ ہستیوں کی لغزشوں کو چن چن کر دین بنا رکھا ہے۔ اور شرعی دلیل کی طرف مطلقاً دھیان ہی نہیں کرتے۔ کاش کہ وہ انصاف اور دیانت کے ساتھ اس اصول پر کاربند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

مگر اس عبارت میں چند وجوہ سے بحث ہے۔ اولاً کیا جن حضرات سے مفتی صاحب اور ان کے ہم نوا ہمیشہ استدلال و احتجاج کیا کرتے ہیں وہ سب کے سب مجتہد ہیں؟ اگر ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد! اگر نہیں تو اس وقت یہ قاعدہ کہاں جاتا ہے؟ وثانیاً مفتی صاحب فرمائیں کہ جس کام پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے کیا اس میں بھی کراہت تحریمی اور حرمت ہوتی ہے یا نہیں؟ ان دونوں حضرات کا یہ فتویٰ اپنا ذاتی نہیں، یہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث سابق سے ماخوذ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ باقاعدہ اپنی عبارت میں اس حدیث کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ تنقیحات میں اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بلاشک اگر یہ فتویٰ اور قول

ان کا اپنی طرف سے ہوتا تو دلیل شرعی کے مقابلہ میں حجت نہ ہوتا۔ مگر یہ ان قرآن کا ذکر ہی دلیل شرعی پر مبنی ہے، پھر یہ کیسے رد ہو؟ وقاتلنا مفتی صاحب کی یہ تحقیق اور تقسیم بھی قابل داد ہے کہ کراہت تحریمی اور حرمت تو بزرگ ہستیوں کے قول سے ثابت نہیں ہو سکتی مگر استحباب اور جواز ان کے قول سے ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا استحباب ایک شرعی حکم نہیں ہے؟ پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ استحباب و ندب بھی ایک شرعی حکم ہے، اور اس پر بھی دلیل درکار ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی مباح کی اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔

نوٹ: اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی میت کو رات کے وقت دفن کرنے کی نوبت آئے اور روشنی کی ضرورت پیش آئے تو کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت موجود ہے۔ یہ چیز محل نزاع سے بالکل خارج ہے۔

قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول وغیرہ چڑھانا

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور خیر القرون سے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں کہ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں پر چادریں ڈالی گئی ہوں یا اُن پر پھول وغیرہ چڑھائے گئے ہوں۔ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبریں بھی ہوتی تھیں، پھول اور چادریں بھی ہوتی تھیں، اور ڈالنے والے بھی ہوتے تھے، اور اُن میں عشق و محبت کا اعلیٰ جذبہ بھی تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو پھول چڑھائے اور نہ چادریں ڈالیں، اور آج یہ کام جائز ہو گئے اور کار ثواب بھی، اور اہل سنت کی علامت بھی قرار پائی اور شعار بھی — بانی مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ اہل بدعت نے حضرت ابن عباسؓ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنیاں گاڑ دی تھیں۔ ایک شخص پیشاب کی چھینٹوں سے اجتناب نہیں کیا کرتا تھا، اور اس صورت میں ناپاک بدن اور کپڑوں سے جو نماز پڑھی گئی وہ کالعدم رہی تو اصل عذاب ترک صلوٰۃ پر ہوا۔ (نووی ج ۱ ص ۱۴۱) ۔ اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا۔

اور آپ نے فرمایا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی، شاید ان سے سزا میں تخفیف ہو جائے (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۲ فصل ۱) تو اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اولاً: اس لئے کہ تخفیف عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت اور نشانی مقرر ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

انی مررت بقبرین یعذبان فاحببت بشفاعتی ان یرفہ ذلک عنہما ما دام الغصنان رطبین۔ (مسلم ج ۲ ص ۴۱۸)

کہ میں دو قبروں کے پاس سے گزرا۔ ان میں دونوں مردوں کو عذاب ہو رہا تھا میں نے اپنی شفاعت کے ذریعہ پسند کیا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں ان دونوں سے عذاب کم کیا ہو۔

اگرچہ اپنی جگہ قرآن کریم کی تسبیحات اور ٹہنیاں سبز و خشک بھی تخفیف عذاب کا سبب ہیں مگر اس خاص قسم تخفیف عذاب کا اصل سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت قرار دی گئی تھی مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ غلطی ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ عذاب قبر کی کمی سبزے کی تسبیح کی برکت سے ہے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دعا سے۔ اگر محض دعا سے کمی ہوتی تو حدیث میں خشک ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی۔ لہٰذا اگر قبر پر آج پھول وغیرہ رکھیں تو بھی ان شاء اللہ میت کو فائدہ ہوگا (جاء الحق ص ۲۸۱) مفتی صاحب اگر ٹہنیوں کی تسبیح کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوتی تو سبز کی قید کیوں لگائی؟ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے خشک ہو یا تر۔ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔

نوٹ: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی دونوں روایتوں میں واقعہ تو اصل میں ایک ہی ہے البتہ راویوں کی تعبیر کا ضرور فرق ہے اور علم حدیث میں ایسا بعض اوقات ہو ہی جاتا ہے۔ امام نوویؒ اور علامہ خطابیؒ (المرقات ج ۱ ص ۲۱۳) وغیرہ اس واقعہ کے اتحاد ہی کے قائل ہیں اگر یہ دو واقعے بھی ہوں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۷۱ میں) لکھتے ہیں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جس روایت میں آپ کی شفاعت کا ذکر ہے وہ اس روایت کی تفسیر ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ تو اصل علت اور سبب شفاعت ہی ہے۔ والحدیث یفسر بعضہ بعضا۔ فہذا [illegible]

صاحب مراد آبادی (الحق الکلام ص ۱۳۳) نے اپنے رسالہ ازالۃ الریب (ص ۱۲۱) میں جو اس پر زور دیا ہے
کہ دو وقت الگ الگ ہیں، اُن کو چنداں مفید نہیں ہے۔

وثانیاً یہ ٹہنیاں عام درختوں سے نہ کاٹی گئی تھیں بلکہ مسلم (ج ۲ ص ۴۱۸) کی روایت میں اس کی تصریح ہے
کہ یہ ان دو درختوں کی ٹہنیاں تھیں جو بطور معجزہ آپ کے پاس چل کر آئے تھے، اور پھر اپنے اپنے مقام پر
چلے گئے تھے۔

وثالثاً اس روایت سے اگر ثبوت ہے بھی تو صرف تر ٹہنیوں کا، پھولوں اور چادروں کا ثبوت
کہاں سے ہوا؟

ورابعاً اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اصل سبب تخفیف عذاب کا ٹہنیوں کا سبز ہونا تھا، اور یہ
علت پھول وغیرہ میں پائی جاتی ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ گناہ گاروں اور فاسقوں کی قبروں
پر پھول وغیرہ ڈالنے چاہئیں۔ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں پر اس کا ثبوت کیسے ہوا؟ کیونکہ آپ نے
گنہگاروں کی قبروں پر ٹہنیاں رکھی تھیں نہ کہ حضرات اولیاء کرامؒ کی قبروں پر (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۱۸)

وخامساً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور خیر القرون سے ہرگز اس کا
ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی ولی اور بزرگ کی قبر پر سبز ٹہنی رکھی ہو اور پھول ڈالے ہوں ۔۔۔ ہاں
حضرت بریدہ بن الحصیبؓ کی وصیت کہ میری قبر پر تر ٹہنی رکھ دینا (بخاری ج ۱ ص ۱۸۱) جو حضرات شیخ کبیر بننے
کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ انہوں نے احتیاطاً اپنے کو گناہگار سمجھ کر وصیت کی ہو۔ اور سوال یہ ہے کہ کیا
خیر القرون میں کسی نے کسی کو ولی اور بزرگ سمجھ کر اس کی قبر پر ٹہنیاں رکھی ہیں؟ اور کیا ان سے چادر کے
ڈالنے کا ثبوت ہے؟ اسی حد میں اختلاف ہے اور بس۔ فقط

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اصلاح الرسوم میں لکھا ہے
کہ پھول وغیرہ فاسقوں و فاجروں کی قبروں پر ڈالنا چاہئے نہ کہ قبور اولیاء پر۔ ان کے مزارات میں
عذاب ہی نہیں جس سے پھول وغیرہ سے تخفیف کی جائے۔ مگر خیال رہے کہ یہ اولیٰ گنہگار کیلئے

دفع معصیت کرتے ہیں وہ صالحین کے لئے بلندیِ درجات کا فائدہ دیتے ہیں۔ (جاء الحق ص۲۸۴)

مفتی صاحب کو یہ نسخہ تو بہت ہی اکسیر ہاتھ آیا ہے، مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ کو بھی معلوم تھا۔ پھر انہوں نے صالحین کی قبروں پر پھول کیوں نہ ڈالے؟ اور صالحین کو رفعِ درجات کے فائدہ سے کیوں محروم رکھا؟ بقول

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس بھی مردود اور باطل ہے کہ ایک تو پھول میں زندگی ہے، اس لئے وہ تسبیح و تہلیل کرتا ہے جس سے میت کو ثواب پہنچتا ہے یا اس کے عذاب میں کمی ہوتی ہے، زائرین کو خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا مسلمان کی قبر پر ڈالنا جائز ہے (جاء الحق ص۲۸۴ ملخصًا) فی الجملہ ادراک و شعور اور تسبیح و تہلیل تو ہر ایک چیز سے شرعًا ثابت ہے اور قرآن کریم اس پر ناطق ہے پھر خشک و تر کا فرق کیوں؟ علاوہ بریں یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ کو بھی معلوم تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مزید بیاں چادروں میں کونسی تری؛ سبزی اور زندگی ہے جو اس حدیث سے وہ بھی قبروں پر ڈالنی جائز ہو گئیں؟ باقی کسی غیر معصوم اور غیر مجتہد کی بات حجت نہیں ہے۔ رہا امام شامیؒ وغیرہ کا یہ قول کہ قبور پر ستور درست ہیں کیونکہ اس میں صاحبِ قبر کی تعظیم ہے وغیرہ وغیرہ، تو قابلِ التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ غیر مجتہد کا قول ہونے کے علاوہ بلا دلیل بھی ہے۔ اور قبر اور تعظیمِ قبر کوئی نیا واقع نہیں کہ ہم اس میں متاخرین کے قیاس کو بھی تسلیم کر لیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے زمانہ میں قبریں بھی ہوتی تھیں مگر چادروں کا کوئی دستور نہ تھا (اور اسی پر ان کا عمل اور اتفاق رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی جہالت کا یوں ثبوت دیا ہے، اُن کے قبور پر سبزہ یا پھول ڈالنا بالاتفاق جائز ہے۔ جاء الحق ص۲۸۴۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ لہٰذا ہمیں مستحق تعظیم اور احترام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو انہوں نے کیا سو ہمیں بھی کرنا چاہیئے۔

رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ کہنا کہ "چادر کی اصل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک

میں بھی کعبہ معظمہ پر غلاف تھا مگر اس کو منع نہ فرمایا۔ صدیوں سے حضور علیہ السلام کے روضۂ پاک پر غلاف سبز ریشمی چڑھا ہوا ہے جو کہ نہایت قیمتی ہے۔ آج تک کسی نے اس کو منع نہ کیا۔ مقام ابراہیم یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت خلیلؑ نے کعبہ معظمہ بنایا، اس پر بھی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ (بلفظہ جاء الحق ص ۲۹۸)۔ تو یہ قیاس مع الفارق ہے جو مسموع نہیں ہے۔ اس لئے کہ کعبہ کا غلاف تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں چڑھتا تھا، اور اس میں آپ نے تغیر نہیں کیا۔ لہٰذا وہ عین سنت ہے (دیکھئے بخاری جلد ۱ ص ۲۱۶ وغیرہ)۔ اسی طرح مقام ابراہیمؑ کا غلاف بھی اگر ثابت ہو تو بظاہر خیر القرون کا ہوگا، اور یہ قبور کے غلاف کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ راقم اثیم دو مرتبہ حج کے شرف سے مشرف ہوا ہے لیکن مقام ابراہیمؑ پر کوئی غلاف نہیں دیکھا۔ اس وقت یہ مبارک پتھر ایک دبیز شیشے کے مینار میں رکھا ہوا ہے۔ باقی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کا غلاف، تو اگر یہ کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غسل، دفن اور قبر وغیرہ کے متعلق چند اور خصوصیات بھی تھیں ممکن ہے یہ بھی اُن ہی میں سے ہو۔ لہٰذا اس پر عام قبروں کو قیاس کرنا باطل ہے۔ اور پہلے حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے اور بقول مفتی احمد یار خان صاحب حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ قبر کو ملبوس کرنا یعنی اس پر چادریں وغیرہ ڈالنا بدعت شنیعہ ہے۔ لہٰذا عام حکم یہی ہے۔

مفتی صاحب کا مفتیانہ استدلال | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ۔ اس تعظیم میں کوئی قید نہیں۔ جیسے ہو سکے، جس ملک اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروج ہے وہ کرنا جائز ہے۔ اُن کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا سب میں ان کی تعظیم ہے لہٰذا جائز ہے (بلفظہ جاء الحق ص ۲۸۸)

واہ دیکھئے مفتی صاحب کی اس تحقیق کی کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات بھی شعائر اللہ میں

داخل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے معظم شعائر اللہ تو چار بتائے ہیں۔ قرآن، کعبہ، نبی اور
نماز (حجۃ اللہ ج ۱ ص ۷۱) مگر وہاں قبور کا ذکر نہیں ہے، اور کسی امام سے بھی قبور کا شعائر اللہ ہونا منقول
نہیں۔ مگر مفتی صاحب کی تحقیق سے مزارات بھی شعائر اللہ ٹھہرے۔ علامہ تفتازانیؒ نے صراحت سے لکھا ہے کہ
قبر کے خاتمہ بالخیر ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دی ہو، ہم صرف
اس کے متعلق حسن ظن ہی رکھ سکتے ہیں، قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتے، تو یقین کے ساتھ کسی کو ولی کیسے کہہ
سکتے ہیں؟ اور پھر ان کی قبر کو شعائر اللہ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اور پھر مفتی صاحب کے نزدیک ان شعائر
اللہ کی تعظیم یوں ہے کہ ان کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا اور چراغاں کرنا۔ پہلے عرض کیا
جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ نے کسی نیک کی قبر پر شاخیں نہیں
رکھیں۔ حضرت بریدہؓ کا معاملہ ہی الگ ہے، بلکہ گناہ گاروں کی قبر پر رکھی تھیں۔ یہ عجیب شعائر اللہ اور
شعائر اللہ والے ولی ہوتے کہ پہلے ان کو گناہ گار تصور کریں اور پھر ان کی قبروں پر پھول وغیرہ چڑھائیں۔
(العیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اور کیا شعائر اللہ کی تعظیم چراغاں جیسے کام سے ہوگی، جس پر سرور دو جہاں
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! عجیب نکتہ! اور مفتی احمد یار خان صاحب
نے کیا تحفہ دیا ہے اور پھر یہ سب کچھ ان کے نزدیک قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے ثابت ہے معاذ اللہ تعالیٰ
ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔ تعظیم کا یہ پہلو اس آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہو
سکا اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ کو۔ اگر معلوم ہوتا تو قبر پر چراغاں کرنے پر آپ لعنت نہ کرتے اور حضرت
عمرو بن العاصؓ وغیرہ اس کے خلاف وصیت نہ کرتے۔ غور کیا جائے، اہل بدعت کا باوا آدم ہی نرالا ہے
ان کے نزدیک ہر ممنوع چیز مستحب اور کار ثواب ہے۔

نیا انکشاف مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خود تو عمدہ
لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی۔ ایک صحابیؓ نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السلام ناراض ہوئے
یہاں تک کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا جب اس کو گرا دیا تب جواب سلام دیا۔" (دیکھو مشکوٰۃ، کتاب
الرقاق فصل ثانی)۔ جاء الحق بلفظہ ص ۲۸۲

اس کا ثبوت تو مفتی احمد یار خان صاحب کے ذمہ ہے کہ وہ کونسی حدیث ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی؟ ذرا اس حدیث کو نقل تو کیجئے اور اس کی سند اور اس کی تصحیح کا بھی ضرور خیال کیجئے۔ باقی جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا اچھا ہوتا کہ اس کو بلفظہٖ نقل کر دیتے تاکہ عامۃ المسلمین کو معلوم ہو جاتا کہ حدیث کیا کہتی ہے اور مفتی صاحب کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابی کے جواب سلام اس لئے ترک نہ کیا تھا کہ اس نے مکان پختہ بنایا تھا، بلکہ اس لئے آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا تھا کہ اس نے گنبد اور قبہ بنایا تھا اور یہ بات نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزاج اور آپ کی طبیعت کو یہ اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

اِنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج یومًا ونحن معہ فرأی قبۃً مشرفۃً فقال ما ھذا۔
(الحدیث) ابوداؤد ج ۲ ص ۳۵۲ ـ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۳۱۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک دن باہر نکلے اور ہم بھی ساتھ تھے۔ آپ نے ایک اونچا گنبد اور قبہ دیکھا، فرمایا یہ کیا ہے الخ

اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ جب اس شخص نے وہ قبہ اور گنبد گرا دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سے راضی ہوئے۔ غور کیجئے کہ یہ روایت تو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے زندوں کیلئے بھی قبہ کی شکل کو پسند نہیں کیا، چہ جائیکہ مردوں کے لئے اس کو پسند کرتے، خصوصاً جبکہ آپ نے قبروں پر مطلق عمارت ہی کو پسند نہیں کیا۔ مگر آج نہ صرف قبروں پر عمارت کا جواز پیش کیا جاتا ہے بلکہ گنبد اور قبہ جیسی شکل پر زور دیا جاتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سرے سے پسند ہی نہیں فرمایا۔

پختہ قبریں بنانے کا ایک اور فائدہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ ہم نے چند دفعہ یہ دیکھا کہ دو قبرستان تھے۔ ایک میں کچھ قبریں پختہ تھیں اور دوسرا پختہ قبروں سے خالی تھا۔ غیر دینوں نے جبراً دو قبرستان فروخت کر دیئے۔ مقدمہ چلا تو جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں حکام نے اس کو مقبرہ نہ مانا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ نکل گیا۔ جس میں پختہ قبریں تھیں وہ بحفاظت مسلمانوں کے

پاس رہا (مقصد) پھر آگے لکھتے ہیں کہ "اس سے مجھے پتہ لگا کہ اب ہندوستان میں کچھ قبریں پختہ ضرور بنانی چاہئیں کیونکہ یہ بقاء وقت کا ذریعہ ہیں جیسے مسجد کے لئے مینارے۔ (ملخصاً جاء الحق ص۲۷۲)۔

کیا خوب؟ سوال یہ ہے کہ وقت کو محفوظ رکھنے کے اس طریقے کا پتہ حضرات صحابہ کرامؓ کو کیوں نہ لگا بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بقاء وقت کا یہ طریقہ کیوں معلوم نہ ہوا؟ اور آپ نے کیوں قبریں پختہ بنانے سے منع کیا؟ اور پھر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ اور دیگر ائمہ اسلام کو یہ طریقہ کیوں نہ سوجھا۔ اور انہوں نے کیوں پختہ قبروں اور ان پر عمارتوں کو ڈھانے کی مہم شروع کر دی؟ مفتی صاحب کو تو اس سے پتہ لگا مگر ان کو نہ لگا کیوں؟ یہ ذرا سوچئے۔ باقی جب قبرستان میں پختہ قبریں دیکھیں "اس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا اس پر مبنی نہیں کہ وہاں قبریں پختہ تھیں بلکہ اس میں ایک تو مسلمانوں کی غفلت اور بے پرواہی شامل ہے۔ اور دوسری یہ بات ہے کہ قبروں پر فقیروں اور مجاوروں کا وجود نامسعود (جو سراسر اسلام کے خلاف ہے) اس کی علت ہے۔ اصل سبب اور علت کو سوچنے کی کوشش نہیں کی۔ اور غیر علت کو علت اور سبب بنانے کا مفتی احمد یار خاں صاحب کو پتہ لگ گیا۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔

قبروں پر مجاور بننا

مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں " مجاور بننا تو جائز ہے۔ مجاور اسی کو تو کہتے ہیں جو کہ قبر کا انتظام رکھے کھولنے، بند کرنے کی چابی اپنے پاس رکھے وغیرہ وغیرہ یہ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ مسلمانوں کی والدہ حضور علیہ السلام کی قبر انور کی منتظمہ اور چابی والی تھیں جب صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو آپ سے ہی کھلوا کر زیارت کرتے (دیکھو مشکوٰۃ باب الدفن " ملخصاً جاء الحق ص۲۷۲)

لیجئے ہم نے مشکوٰۃ شریف بھی دیکھ لی۔ اور مشکوٰۃ میں جہاں سے یہ روایت نقل کی ہے وہ اصل کتاب بھی دیکھ لی مگر مفتی صاحب کے اس غلط اور بے بنیاد دعوے کی دلیل وہاں نہ مل سکی۔ روایت ملاحظہ کریں۔

عن القاسم بن محمد قال دخلت على ... حضرت قاسم بن محمد (بن ابی بکرؓ) فرماتے ہیں کہ میں حضرت

عائشہؓ فقلت یا اماہ اکشفی لی عن قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و صاحبیہ فکشفت لی عن ثلاثۃ قبور لا مشرفۃ ولا لاطئۃ مبطوحۃ ببطحاء العرصۃ الحمراء۔ (رواہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۳، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۴)

عائشہؓ کے پاس گیا اور میں نے کہا اے میری اماں جان مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے دو ساتھیوں کی قبریں کھول کر دکھائیں تو انہوں نے تینوں قبریں کھول کر مجھے بتائیں سو وہ قبریں نہ اونچی تھیں اور نہ بالکل زمین کے ساتھ پیوستہ اور مقام عرصہ کے سرخ رنگ کے سنگریزے ان پر بچھائے ہوئے تھے۔

حضرت قاسمؒ بن محمدؒ تابعی اور حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھتیجے ہیں اور بالکل نوعمر۔ انہوں نے اپنی پھوپھی صاحبہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ (اپنے دادا کی) اور حضرت عمرؓ کی قبر دیکھنے کے شوق کا اظہار کیا اور پھوپھی صاحبہ نے ان کو وہ تینوں قبریں دکھا دیں۔ اس میں نہ تو چابی کا کہیں ذکر ہے اور نہ اس کا ذکر ہے کہ مستقل طور پر کھولنے اور بند کرنے کا انتظام حضرت عائشہؓ کے سپرد تھا، اور نہ اس کا ذکر ہے کہ جب حضرات صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو ان سے کھلوا کر زیارت کرتے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کو ان قبروں کی شناخت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انہوں نے تو اپنے ہاتھوں سے ان بزرگوں کو دفن کیا تھا۔ ہاں البتہ حضرات تابعینؒ کو علی التعیین آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کی قبریں معلوم کرنے کا شوق تھا، اور ہر مسلمان کو ہونا چاہیئے۔ اسی جذبہ کے تحت حضرت قاسمؒ بن محمدؒ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کے ذریعہ یہ شوق پورا کیا، نہ یہ کہ حضرت عائشہؓ وہاں کی مجاور تھیں (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا

کسی مسلمان کی وفات کے بعد اس کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب اس کو جو بہترین تحفہ بھیج سکتے ہیں اور اس کے ساتھ جو حسنِ سلوک کر سکتے ہیں وہ اس کے حق میں دُعا کرنا ہے۔ انفرادی طور پر جس وقت بھی کوئی چاہے اس کی وفات کے بعد تا زیست اس کے لئے دعا کرے اس میں کوئی ممانعت

اور خیرالقرون میں ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے لیکن بصورت اجتماع میت کے لئے دعا کرنے کا ثبوت صرف نماز جنازہ کی صورت میں اور قبر پر تلقین شرعی کی شکل میں ہے۔ اس کے علاوہ جہاں شریعت نے اجتماعی صورت میں دعا کا طریقہ نہیں بتلایا، وہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ نے ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جنازے پڑھے اور پڑھائے مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اجتماعی رنگ میں دعا مانگی ہو۔ باقی میت کے لئے مطلق دعا سے، بلکہ اجتماعی شکل میں یا نماز جنازہ کے متصل بعد دعا ثابت کرنا افسوس ناک مغالطہ یا تعصب شدید کا حیرت ناک مظاہرہ ہے۔ اس کی تفصیل گذر چکی ہے کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک عیارانہ مغالطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس کو مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکرؒ بن حامدؒ الحنفیؒ (المعاصر لابی حفص الکبیرؒ المتوفی ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

ان الدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ مکروہ ([illegible]) نماز جنازہ کے بعد دعا مکروہ ہے۔

امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کا حوالہ ہم نے قنیہؒ سے نقل نہیں کیا تاکہ مفتی احمد یار خان صاحب اپنے اعلیٰ حضرت کی تقلید کرتے ہوئے یہ نہ کہہ دیں کہ قنیہ غیر معتبر کتاب ہے، قنیہ والا بدمذہب اور معتزلی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (دیکھئے جاء الحق ص ۲۶۸ حصہ اول)۔ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہ حوالہ المحیط سے نقل کیا ہے جو فقہ حنفی کی معتبر اور مشہور کتاب ہے۔ محیط مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (انڈیا) کے کتب خانہ میں موجود ہے (تذکرۃ الخلیل ص ۲۹۱) اور محیط کا یہ حوالہ امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کا نام لئے بغیر دلیل الخیرات (مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ) میں بھی مذکور ہے اور دلیل الخیرات ص ۱۰۹ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ (المتوفی ۱۳۴۶ھ) نے اپنے تصدیقی بیان میں بحوالہ محیط امام ابوبکرؒ بن حامدؒ کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جنہوں نے مدینہ منورہ سے محیط برہانی کی آٹھ جلدیں خرید کر مدرسہ کے کتب خانہ کو وقف کر دی تھیں۔ علاوہ بریں قنیہ اتنی غیر معتبر بھی نہیں ہے جتنی کہ اعلیٰ حضرت بریلوی نے سمجھ

رکھی ہے نہ فقیہ کا صرف وہ حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی تائید دوسرے حضرات فقہاء کرام سے نہ ہوتی ہو

دیکھئے فوائد بہیہ ص۳۵ بحث ابن وہبان رضوان لاہور بابت ۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص۴ کا کالم ۲ میں ہے فقہ وغیرہ کی معتبر کتابوں میں قنیہ الخ

امام شمس الائمہ حلوانی الحنفیؒ (المتوفی ۴۴۸ھ) اور بخارا کے مفتی قاضی شیخ الاسلام علامہ سغدی الحنفیؒ (المتوفی ۴۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم الرجل بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ (قنیہ ص۵۶)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کوئی آدمی نہ ٹھہرے۔

امام طاہر بن احمد البخاری الحنفیؒ (المتوفی ۵۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ وقبلہا (خلاصۃ الفتاویٰ ج۱ ص۲۲۵) نماز جنازہ کے بعد اسی طرح اس سے قبل میت کیلئے قرآن پڑھ کر دعا نہ کی جائے۔

علامہ سراج الدین اودھی الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۸۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

اذا فرغ من الصلوٰۃ لا یقوم بالدعاء (فتاویٰ سراجیہ ص۲۳) جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کیلئے نہ ٹھہرے۔

امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ دعا مرۃ۔ (فتاویٰ بزازیہ ج۴ ص۸۰)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے کیونکہ اس نے ایک مرتبہ دعا کر لی ہے (یعنی نماز جنازہ کے اندر)۔

امام شمس الدین محمد خراسانی قہستانی الحنفیؒ (المتوفی ۹۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یقوم داعیا لہ (جامع الرموز ص۱۲۵)۔ اور میت کے حق میں دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

اور علامہ فقیہ ابو حنیفہ ثانی ابن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا بعد التسلیم (بحر الرائق ج۲ ص۱۸۳) سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کرے۔

اور مفتی محمد نصیر الدین الحنفیؒ (المتوفی ـــــ) لکھتے ہیں کہ:

وبعد ایستادہ نماند برائے دعا (فتاویٰ برہنہ ص۳) نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

اور حضرت ملا علی بن القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا للمیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ یشبہ نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز

الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ (مرقات ج ۲ ص ۱۹) — جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔

اور فقہ کی مشہور کتاب مجموعہ خانی میں ہے:

دعا نخواند و فتویٰ بریں قول است (مجموعہ خانی قلمی ص ۱۲۲) — یعنی دعا نہ کرے اور فتویٰ اس قول پر ہے۔

اور شیخ محمد اشرف صاحب الحنفیؒ (المتوفی ۱۳۱۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

خالی از کراہت نیست زیرا کہ اکثر فقہاء بوجہ زیادہ — یعنی یہ کراہت سے خالی نہیں ہے کیونکہ اکثر حضرات فقہاء
بودن بر امر مسنون منع میکنند (فتاویٰ سعدیہ ص ۱۳۱) — کہ اس کے امر مسنون پر زائد ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں

مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ:

"بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے" (نفع المفتی والسائل ملخصاً)

اور علامہ بیرجندی الحنفیؒ نے بھی دعا بعد نماز جنازہ کو مکروہ کہا ہے۔ (بیرجندی حاشیہ شرح وقایہ)
اس کے علاوہ بھی متعدد حضرات فقہاء کرامؒ نے نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کو منع کیا ہے۔ مثلاً دیکھئے
مدخل ج ۲ ص ۲۲۲ لابن امیر الحاجؒ، مظاہر حق ج ۱ ص ۱۰۳ لنواب قطب الدین خان صاحبؒ وغیرہ۔

حضرات فقہاء احناف کی یہ عبارتیں بھی ملاحظہ کیجئے اور مولوی محمد عمر صاحب کا فیصلہ بھی دیکھ لیجئے کہ:

"احناف نماز جنازہ کے بعد دعا مانگتے ہیں، وہابی برا جانتے ہیں، دیوبندی بھی منکر ہیں۔ اب
تم فیصلہ کرو کہ دعا کا انکار کرتے ہو، تم کون ہو؟" (بلفظہ مقیاس الحنفیت ص ۵۲۹)

یہ فیصلہ مولوی محمد عمر صاحب کو خود کرنا چاہیئے کہ وہ کون ہیں؟ حنفی یا غیر حنفی؟ ذرا مولوی صاحب
ہمت کر کے دو چار حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں تو نقل کر دیں جن سے ان کا مسلک ثابت ہوتا
ہے۔ [illegible]

رہا امام فضلیؒ کے لا باس بہ سے استدلال کرنا تو یہ بے کار ہے۔ اولاً اس لئے کہ جمہور حضرات
فقہاء احناف کے مقابلہ میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ وثانیاً علامہ شامیؒ (ج ۱ ص ۱۲۲) وغیرہ
نے اس کی تصریح کی ہے کہ لا باس بہ میں کراہت تنزیہی پائی جا سکتی ہے، اور لا باس بہ غیر مستحب
پر بھی اطلاق ہوتا ہے (ج ۱ ص ۴۸)۔ لہٰذا یہ بھی ان کو سود مند نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

(اشتیاق ص۱۲۳ طبع) لکھتے ہیں کہ اور چونکہ لفظ لا بأس اکثر خلاف اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، اس لئے ایک صاف اور واضح تطبیق تو امام محمد بن الفضل اور امام ابو بکر بن حامدؒ کے کلام میں یہ ہو سکتی ہے کہ اول الذکر مکروہ تنزیہی اور ثانی الذکر مکروہ تحریمی فرماتے ہیں۔ مذہب ظاہر یہی ہے کیونکہ اکثر کتب فقہ و فتاویٰ میں اول اصل مذہب یہی بیان کیا ہے کہ دعا نہ کرے یا دعا مکروہ ہے۔ اور کراہت مطلقہ اکثری طور پر تحریمی پر محمول ہوتی ہے اور امام محمد بن الفضلؒ سے اس کے خلاف جو قول نقل کیا اس کو لا بأس سے تعبیر کیا جو اصل معنی کے لحاظ سے کراہت تنزیہی یا کم از کم خلاف اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ (دلیل الخیرات فی ترک المنکرات ص۴۹)

مولوی محمد عمر صاحب کا ایک اور کمال ملاحظہ ہو وہ ایک عبارت کے مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "جو دعا سے روکے وہ تمام زمانے سے زیادہ احمق ہے"۔ (مقیاس ص۶۱۸)

مولوی محمد عمر صاحب یہ فرمائیں کہ جن حضرات فقہاء احنافؒ کے حوالے ہم نے ذکر کئے ہیں وہ تو تمام اس دعا سے منع کرتے ہیں کیا وہ بھی تمام زمانے سے زیادہ احمق ہیں؟ سوچ کر اور ہوش میں آکر جواب دینا۔ قارئین کرام بغور فرمائیے کہ اکابرین علماء احنافؒ جنازہ کے بعد کی دعا کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور اس سے محض اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ امر مسنون پر زیادتی ہے۔ اگر خیر القرون میں یہ دعا ہوتی تو یہ اکابر ہرگز اس کو خلاف مسنون اور مکروہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ آج مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت نواز پارٹی اس خلاف مسنون اور مکروہ کام کو جائز اور مستحب سمجھتے ہیں، اور اس کے اثبات کے درپے ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو حنفی کہتے ہوئے حضرات فقہاء احنافؒ کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ:

"مکروہ را مستحسن و مستحب از اعظم جنایات است چہ حرام را مباح و مستحسن پنداشتن منجر بکفر است و مکروہ را مستحسن پنداشتن یک مرتبہ ازاں پایاں است شناعت این فعل را بہ ملاحظہ باید نمود۔" (مکتوبات حصہ پنجم ص۸۲)

مکروہ کو اچھا سمجھنا بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ حرام کو مباح سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے اور مکروہ کو اچھا سمجھنا اس سے ایک مرتبہ فروتر ہے۔ اس فعل کی قباحت کو اچھی طرح ملاحظہ کرنا چاہئے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عبارات پر فریق مخالف کی طرف سے جو اعتراضات (یا بزعم خود
جو جوابات) پیش کئے گئے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

اعتراض: مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "اس اعتراض کے (کہ حضرات فقہاء کرامؒ
کی عبارات میں دعا بعد الجنازہ کی ممانعت آئی ہے) دو جواب ہیں۔ ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی
جواب تو یہ ہے کہ اس دعا سے ممانعت کی تین وجہیں ہیں۔ اوّلاً یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے
ہو۔ دوم یہ کہ دعائیں اتنی لمبی نہ ہوں جس سے کہ دفن میں بہت زیادہ تاخیر ہو، اسی لئے نماز جنازہ کے
انتظار میں دفن میں تاخیر کرنا منع ہے۔ تیسرے یہ کہ اسی طرح صف بستہ بہ ہیئت نماز کی جاوے کہ
دیکھنے والا سمجھے کہ نماز ہو رہی ہے کہ یہ زیادتی کے مشابہ ہے۔ لہٰذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر
تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کراہت جائز ہے۔ یہ وجوہ اس لئے نکالے گئے ہیں کہ فقہاء کی عبارتیں
آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ اقوال احادیث مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کے قول و عمل کے خلاف نہ ہوں۔
تفصیلی جواب یہ ہے کہ عبارات میں سے جامع الرموز، ذخیرہ، محیط، کشف الغطاء کی عبارتوں میں
تو دعا سے ممانعت ہے ہی نہیں۔ بلکہ کھڑے ہو کر دعا کرنے سے منع فرمایا ہے، وہ ہم بھی منع کرتے ہیں
مرقات اور جامع الرموز میں یہ بھی ہے لانه یشبه الزیادة، یہ زیادتی کے مشابہ ہے یعنی اس دعا
سے دھوکا ہوتا ہے کہ نماز جنازہ زیادہ ہو گئی" (جاء الحق ص ۲۱۵)

جواب: یہ جملہ اعتراضات یا بزعم خود جوابات مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور
بے خبری کا نتیجہ ہیں اور کسی وجہ سے یہ قابل التفات ہی نہیں ہیں:

اوّلاً اس لئے کہ اگرچہ حضرات فقہاء احنافؒ اور شوافعؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ چوتھی تکبیر
کے بعد سلام سے قبل دعا کرنا درست ہے یا نہیں، حضرات احنافؒ اس کے منکر اور حضرات شوافعؒ
اس کے قائل ہیں مگر حضرات فقہاء کرامؒ کی وہ عبارتیں جو ہم نے پیش کی ہیں (بلکہ وہ عبارتیں بھی جو
مفتی احمد یار خان صاحب نے پیش کی ہیں بجز ایک عبارت کے) ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ چوتھی تکبیر
کے بعد اور سلام سے پہلے کے متعلق حضرات فقہاء کرامؒ یہ فرما رہے ہیں۔ وہ تو اس امر کی صراحت کرتے

ہیں کہ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد دعا نہ مانگی جائے۔ بعد صلوٰۃ الجنازۃ - اذا فرغ
میں "بعد" لفظ کی قید لگاتے ہیں۔ اس سے بھلا سلام سے قبل کی دعا کیسے مراد ہو سکتی ہے؟ اور بحر الرائق
کی یہ عبارت بھی لا یدعوا بعد التسلیم، سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کی جائے۔ الغرض حضرات
فقہاء احناف کی ان عبارات کا مطلب یہ بیان کرنا کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے کے متعلق ہیں یہ
ان کی خاص تحریف ہے محض کچھ نہ کچھ لکھ دینے کا نام جواب نہیں ہوتا۔

وثانیاً کسی مستند اور معتبر فقیہ سے یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعائیں پڑھنے سے
ہے اور مختصر قسم کی دعا جائز ہے۔ یہ مفتی صاحب کی خود تراشیدہ منطق ہے۔ حضرات فقہاء کرام تو
لا یدعوا وغیرہ جملوں سے بالکل اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملہ فعلیہ نکرہ کے معنی میں ہوتا ہے اور نکرہ جب
سیاق نفی میں آئے تو اس سے عموم ہی مراد ہوتی ہے، اِلّا یہ کہ کوئی مخصص دلیل ہو اور یہاں کوئی مخصص
دلیل موجود نہیں ہے محض اختراعات سے تخصیص ہرگز نہیں ہو سکتی۔

وثالثاً مفتی صاحب اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ لا یقوم بالدعاء کا
یہ معنی ہے کہ صف بستہ کھڑے ہو کر دعا نہ کی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو نماز کا شبہ نہ ہو بلکہ صفوں کو توڑ
کر اور بیٹھ کر دعا کی جائے تو جائز ہے مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہاں صرف یقوم ہی نہیں بلکہ یقوم
بالدعاء ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد وہ دعا کو قائم نہ کرے اور دعا کے لئے نہ ٹھہرے یا بالفاظ
دیگر دعا نہ مانگے۔ مفتی صاحب لغت کی کتابوں میں قام بالامر کذا کے معنی دیکھ لیں کہ کیا لکھتے ہیں
تو پتہ چل جائے گا۔ خدا کے لئے حضرت [illegible] تو اتنا غور نہیں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض دیوبندی حضرات کو بھی یہ
مغالطہ ہوا ہے اور بعض نے اس سلسلہ میں قلم سے غلط کتابت بھی کی ہے اور نقل کی ہے ہم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ
صاحب کا حوالہ درج کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ کھڑا ہو کر دعا نہ کرے چونکہ
نماز جنازہ کے بعد اسی حالت پر کھڑا رہنا اور دعا کرنا خاص طور سے اجتماع و اہتمام کو ثابت کرتا ہے
اس لئے اس طرح تعبیر فرما دیا مطلب یہی ہے کہ اجتماع و اہتمام سے دعا نہ کرے یعنی اگر کوئی ایک شخص
نماز جنازہ کے بعد اتفاقی طور پر اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس نے کوئی دعا اپنے دل میں میت کیلئے مانگ

لی۔ تو اگرچہ اس نے کھڑے ہو کر یہ دعا کی ہے مگر مکروہ نہیں ہوگی کیونکہ کراہت کی اصلی علت (اجتماع

و اہتمام) موجود نہیں۔ اور نفس قیام علت کراہت نہیں۔ انتہیٰ بلفظہ (دلیل الخیرات ص۱۳۸ و ص۱۳۹)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ کراہت کی علت اجتماع و اہتمام ہے۔ اس لئے اگر مصلین تو ذکر

یا بیٹھ کر اجتماعی صورت میں دعا کی جائے تب بھی مکروہ اور ممنوع ہے۔

وثالثاً اگر بالفرض لا یقوم بالدعاء کا یہ مطلب لے لیا جائے کہ کھڑے ہو کر دعا نہ کی جائے

تو بحر الرائق کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا کہ لا یدعوا بعد التسلیم (کہ سلام کے بعد دعا

نہ کرے) اس میں تو لا یقوم کا ذکر ہی نہیں۔ اور مجموعہ خانی کے یہ لفظ کہ "و دعا خواندن بوجی بدیا

قول است"۔ اس میں تو مطلقاً دعا کی نفی کی گئی ہے عام اس سے کہ کھڑے ہو کر کی جائے یا بیٹھ کر صف

بستہ ہو یا صف توڑ کر۔ الغرض مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ ارشاد کہ دعا سے ممانعت ہے ہی نہیں

بلکہ کھڑے ہو کر دعا سے منع فرمایا، سراسر باطل اور مردود ہے۔

ورابعاً مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ہم نے یہ وجوہ اس لئے نکالے ہیں کہ فقہاء کرام کی عبارتیں

آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ احادیث مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کے قول و عمل کے مخالف نہ ہوں ایک

خیالی اور ہوائی قلعہ ہے جس میں مفتی صاحب پناہ گزیں ہیں۔ حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں آپس میں

جب متعارض ہی نہیں تو پھر بلا وجہ یہ وجوہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب کسی صحیح حدیث

سے اور کسی صحابی کے قول و عمل سے جب رو کے بعد دعا کا ثبوت ہی نہیں تو ان کی مخالفت کا کیا مطلب؟

یہاں تو مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وخامساً مفتی صاحب یہاں تو لکھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر دعا کرنے سے ہم بھی منع کرتے ہیں مگر

ص۲۱۲ میں حضرت ابن ابی اوفیٰؓ کی روایت یوں نقل کرتے ہیں کہ:

"کھڑے ہو کر دعا کی اور فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے ہی کرتے ہوئے دیکھا"

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھڑے ہو کر دعا کی ہے تو مفتی صاحب کو اس سے منع

کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ یہ یاد رہے کہ مفتی صاحب اصل بات ہی نہیں سمجھے حضرت عبداللہ بن

ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت سے، باوجود ضعیف ہونے کے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم ہجری نہایت ضعیف اور کمزور راوی ہے، جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے قبل انہوں نے دعا مانگی، جس پر حضرات شوافع کا عمل ہے۔ امام بیہقیؒ نے باب قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۴۲) اور ان کی یہ روایت مسند احمد ج ۴ ص ۳۸۳ میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے، کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد قبل از دفن دعا مکروہ نہیں ہے اور مفتی صاحب اس کے اثبات سے قاصر رہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی مفتی صاحب نے جاء الحق ص ۲۶۹ میں جامع الرموز کا تین مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ ان کے قائم کردہ نمبروں کے لحاظ سے ۱ و ۵ و ۶۔ حالانکہ ۱ کی عبارت تو جامع الرموز ج ۱ ص ۱۲۵ کی ہے اور ۵ و ۶ کی عبارت ہی جامع الرموز کی نہیں ہے۔ خدا جانے انہوں نے کس رسالہ یا اخبار سے بدحواسی میں یہ نقل کر دیا ہے۔ کیا خوب تحقیق ہے۔ ٹائیٹل پر انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب میں —— تمام مختلف فیہ مسائل کا نہایت محققانہ مدلل فیصلہ کر دیا گیا ہے —— سبحان اللہ تعالیٰ، یہ ہیں مفتی صاحب کی تحقیق انیق کے چند نمونے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کے دعا بعد الجنازہ کے اثبات کے دلائل اور ان کے جوابات

مفتی صاحب لکھتے ہیں: مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنازہ فصل ثانی میں ہے اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء (جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لئے خالص دعا مانگو) ف سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دعا کی جاوے بلا تاخیر۔ جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کے لئے دعا مانگو وہ ف کے معنی سے غفلت کرتے ہیں۔ صلیتم شرط ہے ماضی اور ف اخلصوا ہے جزاء۔ شرط اور جزاء میں تغایر چاہیئے نہ یہ کہ اس میں داخل ہو۔ پھر صلیتم ہے ماضی اور فاخلصوا ہے امر جس سے معلوم ہوا کہ دعا کا حکم نماز پڑھ چکنے کے بعد ہے جیسے فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا میں کھا چکنے کا حکم ہے نہ کہ کھانے کے درمیان، اور اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ میں نماز کے لئے اٹھنا مراد ہے نہ کہ نماز کا قیام جیسا کہ ای سے معلوم ہوا، لہٰذا یہاں بھی وضو ارادۂ نماز کے بعد ہی ہوا، اور ف سے تاخیر ہی معلوم ہوئی حقیقی معنی

کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ (جاء الحق ص ۲۱۲)

جواب: مفتی صاحب نے حدیث کا جو یہ معنی کیا ہے کہ جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے لئے خالص دعا مانگو، خرابی ہی سب اس میں ہے کہ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است۔

اولاً اس لئے کہ یہ معنی اس حدیث کے مدلول کے خلاف ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ میت پر جب تم نماز جنازہ پڑھو تو اس میں نہایت اخلاص سے دعا کرو۔ یہ مطلب تو نہیں کہ نماز جنازہ تو ویسے ہی پڑھ لو اور اس کے بعد اخلاص سے دعا کرو۔ علاوہ ازیں المدونۃ الکبریٰ ص ۱۸۹ ج ۱ میں ہے: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قال فی الصلوۃ علی المیت اخلصوہ بالدعاء، اس میں صراحت ہے کہ اخلاص فی الصلوۃ کے اندر مطلوب ہے۔ ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اخلاص نماز جنازہ کے اندر ہی ہونا چاہیے۔ آپ ایسے پر سوز دل اور رقت آمیز الفاظ سے جنازہ کی نماز پڑھایا کرتے تھے کہ زندہ صحابی آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش یہ جنازہ ہمارا ہوتا۔ دیکھئے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مسلم ص ۳۱۱ ج ۱ وغیرہ میں ہے اور سنن الکبریٰ ص ۴۲ ج ۴ میں ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے نماز جنازہ کا طریقہ بتایا جس میں یہ بھی فرمایا کہ دعا خوب پڑھنے کے بعد اخلاص سے خاص میت کے لیے دعا کرے۔ (ثم یسلم سراً فی نفسہ) پھر آہستہ دل ہی میں سلام کہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ اخلاص فی الدعاء سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔

ثالثاً اگر اس روایت کا یہی معنی ہو جو مفتی صاحب نے کیا ہے تو جنازہ کے بعد کی دعا کو حضرات فقہاء کرام اور خصوصاً فقہاء احناف خلاف سنت اور مکروہ کیوں کہتے ہیں؟ کیا حضرات فقہاء کرام سے یہ جسارت ہو سکتی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل اور قول کو بھی خلاف سنت اور مکروہ کہہ دیں؟

رابعاً باوجودیکہ یہ حدیث حضرات فقہاء کرام کے پیش نظر ہے، مگر وہ پھر بھی جنازہ کے بعد دعا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر اس حدیث کا وہی مطلب ہوتا جو مفتی صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی نے گھڑا ہے تو حضرات فقہاء کرام کیوں اذا صلیتم اور فاخلصوا سے اس کو ثابت کرتے۔ وہی حضرات ملا علی القاری وغیرہ جب اس حدیث کی شرح کرتے ہیں تو ان کو مفتی صاحب کا یہ نکتہ نہیں سوجھا۔

اور جب اُس کے صرف ایک صفحہ بعد حضرت مالکؒ بن ہبیرہؓ کی حدیث کی شرح کرتے ہیں تو صاف لکھتے ہیں کہ جنازہ کی نماز کے بعد میت کے لئے دُعا مانگنا مکروہ ہے کیونکہ یہ نماز جنازہ کے اندر زیادتی کے مشابہ ہے (مرقات ج ۲ ص ۳۳۱) الغرض کوئی اصولی اور بیرونی قرینہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت اس حدیث کا وہ مطلب صحیح ہو جو مفتی صاحب نے کیا ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہئے تو یہ مسلم ہے مگر یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ اور کبھی یہ تغایر جزو و کل کا ہوتا ہے جیسے وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔ مطلق قرآن کا پڑھنا کل ہے اور صرف اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کا پڑھنا جزو ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الخ قرآن کریم کے بالکل مغایر ہے۔ اسی طرح کبھی یہ تغایر اطلاق و تقیید کا ہوتا ہے جیسے إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے۔ اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ کے ساتھ مقید ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اُس سوال کے بالکل متغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی بھی اہل علم پر مخفی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ مطلق نماز جنازہ (جس میں ثناء اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور باوضو ہو کر قبلہ رخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ سبھی کچھ ہے) کل ہے اور میت کے لئے دعا جزو ہے اور شرط و جزا کے لئے اتنا تغایر کافی ہے۔ اور اگر مفتی صاحب إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ (الآية) اور إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ (الآية) اور إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ (الآية) وغیرہ میں ارادہ وغیرہ مقدر تسلیم کرتے ہیں تو وہ فرمائیں کہ إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ (الحديث) میں اس ارادہ کے نکالنے سے کیا چیز مانع ہے؟ وجہ فرق بھی ہونی چاہئے۔ الغرض یہ مفتی صاحب کی صوابدید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدر نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کر لیں یا جزو و کل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں۔ یہ ان کی مرضی ہے۔ باقی حرف إِلَى نماز کے قیام کے لئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جا سکتی ہیں مگر بخوف طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ف سے تاخیر ہی مفہوم ہوتی،

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں تو اُن کا یہ کہنا اصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ جیسے تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبی بھی ہوتی ہے، اور جزا کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے شرط سے متاخر ہو، بلکہ بسا اوقات جزا، شرط کیلئے علت ہوتی ہے اور علت کا معلول پر مقدم ہونا ایک یقینی امر ہے۔ علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ :

اذا الجزاء قد تكون علة للشرط كان وجد ... کبھی جزاء شرط کے لئے علت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال ان كان النهار فالشمس طالعة ... وجد النهار فالشمس طالعة) کہ اگر دن موجود ہے تو سورج

(شرح تنقیح ص۱۲۱) ... نکل چکا ہے۔

ثانیاً اس لئے کہ میت کے لئے نماز جنازہ میں جو دعا کی جاتی ہے تو وہ ثناء اور درود شریف کے بعد کی جاتی ہے اور اس میں جملہ جزائیہ کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقق ہے۔ اور علماء نے تصریح کی ہے :

التراخی یحصل بزمان ولو قل (حاشیہ تلویح ص۱۲۱) ... کہ تراخی بہت قلیل زمانہ سے بھی متحقق ہو جاتی ہے۔

ثالثاً اس میں حقیقی معنی کسی نے ترک ہی نہیں کیا تاکہ ان پر یہ الزام صحیح ہو کہ بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ علاوہ بریں اگر مفتی صاحب وغیرہ کے پاس ارادہ وغیرہ نکالنے کے لئے کوئی قرینہ اور منطق موجود ہے تو شاید کسی اور کے پاس بھی کوئی ایسا ہی حربہ موجود ہو کیونکہ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

علاوہ ازیں کیا مفتی صاحب لوگوں کو یہ فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ الخ پڑھا کریں۔ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ (پ۱۴) میں بھی فا ہے جس سے بقول مفتی صاحب تاخیر زمانی معلوم ہوئی۔ پھر حقیقی معنی کیوں چھوڑا جائے؟ اسی طرح اور بہت سی آیات میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ غرضیکہ کوئی صحیح عقلی اور نقلی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جس سے اذا صلیتم علی المیت (حدیث) سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا ہونی چاہئے اور اس سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

فریق مخالف کا استدلال اور اس کا حشر | مفتی احمد یار خان صاحب تعجب کرتا ہوں کہ

حوالہ سے اور مولوی محمد عمر صاحب بیہقی اور فتح ربانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضی بن ابی اوفیٰؓ نے اپنی لڑکی کا جنازہ پڑھا اور چوتھی تکبیر کے بعد دعا کی، اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (جاء الحق ص۳۱۳ اور مقیاس حنفیت ص۵۲۱ محصلہ)

الجواب: اس روایت سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم ہجری واقع ہے (دیکھئے جاء الحق وغیرہ) اور حضرات محدثین کرامؒ اس کی روایت کو نہایت ہی ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں۔ اس کی حدیث کچھ نہیں ہے۔ امام ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ امام ابوحاتمؒ اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں حدیث میں ضعیف ہے۔ امام ابو احمد الحاکمؒ کہتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ حدیث میں ضعیف ہے۔ علامہ ابن عدیؒ کہتے ہیں، اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن سعدؒ امام سعدیؒ اور امام حربیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ج۱ ص۱۶۵) لہٰذا یہ روایت سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔

وثانیاً یہ دعا نماز جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دعا نہیں ہے جیسا کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ ۔۔۔ پھر نماز جنازہ ختم کرنے کے بعد آپ وہیں کھڑے رہے، اندازہ دو تکبیروں کے مابین کا دعا فرماتے رہے (مقیاس ص۵۲۱) بلکہ یہ دعا چوتھی تکبیر اور سلام پھیرنے کے درمیان کی دعا ہے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا اور حضرات شوافعؒ کا اس پر عمل ہے۔ اور حضرات احنافؒ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے قبل دعا کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

وفی روایۃ کبر اربعا فمکث ساعۃ حتی ظننت انہ سیکبر خمسا ثم سلم عن یمینہ وعن شمالہ الخ (ریاض الصالحین ص۲۶۱ وکتاب الاذکار ص۱۴۹)

ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے، مگر پھر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

حضرت امام بیہقیؒ اس روایت پر یوں باب قائم کرتے ہیں کہ:

باب من ذهب الی الاستغفار للمیت والدعاء له ما بین التکبیرة الرابعة والتسلیم (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۳)

وہ باب جس میں اس کا ذکر ہوگا کہ میت کے لئے چوتھی تکبیر اور سلام کے درمیان دعا اور استغفار کرنا چاہئے۔

اس روایت سے نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد دعا ثابت کرنا جہالت یا خیانت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دعا مانگی (جاء الحق ص ۲۷۲)۔ مگر یہ بھی مفتی صاحب کی قوت فہمی کا ایک کرشمہ ہے ورنہ بیہقیؒ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک جنازہ پڑھایا اور چند حضرات نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

فقالوا یا امیر المؤمنین لم نشهد الصلوٰة علیه فصلی بهم فکان امامهم قرظةؓ بن کعب۔ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵)

انہوں نے کہا اے امیر المؤمنینؓ ہم اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے تو انہوں نے ان کے ساتھ نماز ادا کی۔ ان کے امام قرظہؓ بن کعب تھے۔

اور دوسری روایت میں یوں آتا ہے کہ:

فجاء قرظةؓ بن کعب واصحابه بعد ما دفن فامرهم ان یصلوا علیه (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵)

قرظہؓ بن کعب اور ان کے ساتھی دفن کے بعد آئے اور انہوں نے ان کو صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا۔

اس روایت سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ دوبارہ جنازہ پڑھنا یا دفن کے بعد جنازہ پڑھنا ہے۔

اس مقام پر اس کا جھگڑا نہیں ہے۔ اس روایت سے دعا بعد جنازہ کا اثبات بالکل بے بنیاد امر ہے۔ اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کا (غائبانہ) جنازہ پڑھا اور پھر دعا کی (ملخصاً جاء الحق ص ۲۷۲) بالکل بے اصل اور بے حقیقت بات ہے۔ حضرت اصحمہ نجاشیؓ کے بغیر غائبانہ جنازہ پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو کسی صحیح اور متصل سند کے ساتھ پیش کر دے۔ [illegible] جب اصل نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب؟ اسی طرح مبسوط کے حوالے سے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن سلامؓ سے یہ ثابت کرنا کہ ان حضرات نے دعا بعد نماز جنازہ

کی قلتِ فہم یا عدمِ تدبر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے (دیکھئے مبسوط ص ۶۷ ج ۲ وغیرہ) یہ بات کہ حضرت عبداللہ بن سلام ایک جنازہ پر نماز کے بعد پہنچے اور فرمایا کہ:

ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء لہ۔

(ترجمہ مفتی احمد یار خان صاحب کا ہے) اگر تم نے مجھ سے پہلے نماز پڑھ لی تو دعا میں مجھ سے آگے نہ بڑھو یعنی اب میرے ساتھ مل کر دعا کرو۔ (مبسوط جلد ۲ ص ۶۷)

تو اس سے استدلال بھی باطل ہے اس لئے کہ اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو کہ اب میرے ساتھ مل کر دعا کرو، یہ مفتی صاحب کی ذاتی اور خانہ زاد اختراع ہے جو ہرگز قابلِ التفات نہیں ہے۔ یہ دعا کب ہوئی؟ دفن سے قبل یا بعد؟ قبرستان میں یا مسجد یا گھر میں؟ اس روایت میں اس کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ پھر اس کی بھی کوئی تعیین نہیں ہے کہ اس میں سبقت زمانی ہے یا کیفی اور کمی؟ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ میں نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہو سکا مگر میں کثرت سے ایسی پُر از اخلاص دعا کروں گا کہ اس کی تلافی ہو جائے گی اور اس میں تم مجھ سے ہرگز سبقت نہیں لے جا سکتے۔

نوٹ: دفن کے بعد قبر کے سرہانے اور اس کی پائنتی میں سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا جائز ہے، اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل اور تثبیت وغیرہ کی دعا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔ اسی طرح مطلق دعا بھی منع نہیں ہے، جب کسی کا جی چاہے کرے۔ البتہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا درست نہیں ہے جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب کشف الغطاء کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن خوانی بعد از نمازِ جنازہ ... دعا (جاء الحق ص ۲۶۸)۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا اس پر بزعمِ خود عقلی دلائل پیش کرنا، تو یہ کیا ہے؟ اولاً اس لئے کہ دین کا ہر مسئلہ عقل سے ثابت نہیں ہوتا۔ ابو داؤد ج ۱ ص ۲۲ میں حضرت علیؓ کی مسح والی روایت ملاحظہ کیجئے۔ وثانیاً عقل سے بھی ہر عقل مراد نہیں ہوتی۔ ہماری عقل کیا اور ہم کیا؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ وثالثاً ان قد منع العبد وغیرہ روایات سے دعا بعد الجنازہ ثابت کرنا ایسی بات ہے کہ شریعت میں دخل دینا ہے۔ گویا جیسے کہ امورِ عامہ سے احکامِ خاصہ

کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ وثانیاً اگر واقعی ایسی روایات سے یہ دعا ثابت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے اس کا ثبوت ملتا، اور حضرات فقہاء احنافؒ اس کو مکروہ نہ کہتے۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنا اور قرآن کریم وغیرہ پڑھنا | حدیث شریف اور فقہ حنفی کے پیش نظر اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی کہ جنازہ کے ساتھ اجتماعی طور پر ذکر کیا جائے اور خاص طور پر جہر کے ساتھ۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ بحوالہ طبرانی حضرت زید بن ارقمؓ (المتوفی ۶۸ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ان اللہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القرآن وعند الزحف وعند الجنازۃ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ تین موقعوں پر خاموشی کو پسند کرتا ہے قرآن کریم کی تلاوت کے وقت، میدان جنگ میں اور جنازہ کے ساتھ۔

حضرت امام محمدؒ اور علامہ ابن نجیمؒ، حضرت قیس بن عبادؒ (المتوفی ۸۵ھ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکرھون الصوت عند ثلاث الجنازۃ والقتال والذکر۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرامؓ تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ جنازہ کے ساتھ، لڑائی میں اور ذکر کے وقت۔

(السیر الکبیر للامام محمدؒ مع شرح السرخسی ج ۱ ص ۵۹ و بحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۲ ومصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۷۳ و ج ۱۲ ص ۴۶۳)

بلکہ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تین مقامات پر آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ قراءت قرآن، جنازہ اور لڑائی کے وقت۔ (السیر الکبیر ج ۱ ص ۶۰)

یہ روایتیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ مکروہ سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احنافؒ نے یہ مسئلہ بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے

کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا اور اسی طرح کل حی یموت (کہ ہر زندہ مرنے والا ہے) وغیرہ پڑھنا مکروہ اور بدعت ہے، اور کراہت بھی اس میں تنزیہی نہیں بلکہ تحریمی ہے چنانچہ عالمگیری میں ہے:

وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن۔

کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ چلنے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں اور ان کے لئے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔

(كذا في شرح الطحاوي وعالمگیری مصری ج۱ ص۱۶۲)

امام سراج الدین اودھی لکھتے ہیں:

رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن وقولهم كل حي يموت ونحو ذلك خلف الجنازة بدعة۔

کہ جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرے گا، بدعت ہے۔

(سراجیہ ص۲۳ طبع نولکشور)

اور اسی کے قریب قریب عبارت ہے در مختار کی (دیکھئے کتاب الجنائز)

اور علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں کہ:

وينبغي لمن تبع الجنازة ان يطيل الصمت ويكره رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن وغيرهما في الجنازة والكراهة فيها كراهة تحريم۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۹۲ مصری)

اور مناسب ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جائیں طویل خاموشی اختیار کریں اور بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا مکروہ ہے، اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے۔

یہ تمام عبارتیں ذمہ دار حضرات فقہاء احناف کی ہیں جو اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا، کل حی یموت پڑھنا اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی سینہ زوری ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ بعض فقہاء نے میت کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ فرمایا، ان کی مراد مکروہ تنزیہی ہے۔ (جاء الحق ص۲۹۱)

ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں آہستہ ذکر کرے تو اس کیلئے گنجائش ہے چنانچہ امام قاضی خان لکھتے ہیں ا

ویکرہ رفع الصوت بالذکر فان اراد ان یذکر اللّٰہ یذکر فی نفسہ ۔

اور مکروہ ہے کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر کیا جائے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں ذکر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ آہستہ دل میں ذکر کر سکتا ہے۔

(قاضی خان ج ۱ ص ۱۹۰ طبع نولکشور)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنے کو مکروہ (تحریمی) اور بدعت کہتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں مگر مولوی محمد عمر صاحب بزعم خویش کئی آیات سے یہ ثابت کرتے ہیں اور پھر یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں :

"جنازہ کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا" اور پھر جامع الصغیر سیوطیؒ ، کنز العمال متقیؒ اور کنز العمال سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ جنازہ میں زیادہ پڑھا کرو ـــ اور دوسری روایت یوں نقل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے موتی کے لئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا سامان تیار کرو ـــ تو ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ جنازہ کے ساتھ چلنے کا ذکر ثواب ہے اور میت کو مفید ہے۔ اور اس زمانہ میں ذکر جہری بالمیت کرنا اہل سنت کیلئے ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کو وہابی اور سنی کے جنازے کا علم ہو جائے۔ (مقیاس حنفیت ص ...)

سبحان اللہ تعالیٰ ! یہ ہیں مولوی محمد عمر صاحب کے جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے کے اثبات کے دلائل ، کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ذکر کا بلند کرنا اور اس کی فضیلت آئی ہے اس سے جنازہ کے ساتھ ذکر کرنا بھی ثابت ہو گیا۔

پہلے یہ با حوالہ درج کر دیا گیا ہے کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہوتا۔ یہی قرآن کریم کی آیات تھیں جن سے مولوی محمد عمر صاحب کے نزدیک جنازہ کے ساتھ ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ کے سامنے بھی تھیں مگر ان کو یہ مبارک اجتہاد نہ سوجھا یہ مولوی محمد عمر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو قرآن کی ایک آیت ہی سے نہیں بلکہ کئی آیات سے یہ مسئلہ معلوم ہو گیا۔ باقی جو حدیث پیش کی ہے اس سے استدلال بھی ناکافی ہے اسلئے

کہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو آدمی خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ (کہ جنازہ کے پیچھے جا رہے ہوں اور اس کے
ساتھ ساتھ چل رہے ہوں) کی فہرست میں شامل ہو اس کے لئے جہر سے ذکر کرنا یا قرآن کریم وغیرہ
پڑھنا کیسا ہے؟ ہم نے حضرات فقہاء کرام کی عبارتیں نقل کی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں نص صریح ہیں
اور مولوی محمد عمر صاحب کی پیش کردہ روایتیں خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ کے مفہوم کے بیان
سے قاصر ہیں۔ ان روایات کا صحیح مطلب ہے کہ وفات کے وقت ان کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو جیسا کہ سنت سے ثابت
ہے اور علمائے اہل سنت کے ہاں تلقین شہادتین کا مسئلہ معروف رہا ہے اور اس کا بھی قوی احتمال ہے کہ جنازہ پڑھتے وقت بطور دعا لا الہ
الا اللہ کثرت سے پڑھا کرو کیونکہ افضل الذکر ہے۔ اور رہا جنازہ کے لفظ سے جس کا ترجمہ مولوی محمد عمر صاحب نے یہ کیا ہے "جنازہ میں زیادہ
پڑھا کرو" اسی کے متعلق مولوی شاہ محمد حسن الوری بریلوی لکھتے ہیں: سوال: جو لوگ جنازہ کے ہمراہ ہوں ان کو کلمہ طیب راستہ
میں پڑھنا کیسا ہے؟ جواب: بآواز بلند پڑھنا آہستہ سے دل میں اگر پڑھیں تو مضائقہ نہیں بہتر خاموشی ہے۔ (ماثیری ارکان دین ص [illegible])

مولوی محمد عمر صاحب کی انوکھی دلیل | مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ دوسری — فقہاء نے ذکر
بالجہر فی الجنازہ مکروہ لکھا ہے (محمد عمر)۔ بحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۲ میں مذکور ہے کہ ولا بأس بمرثیۃ
المیت شعراً۔ میت کا شعروں میں مرثیہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم اپنے جنازہ کے ساتھ فقہاء کی
اتباع میں مرثیہ خوانی کر لیا کرو ہم ذکر کلمہ کر لیا کریں گے۔ (مقیاس حنفیت ص ۵۸۵)

جواب: مولوی محمد عمر صاحب کا تقریر و تحریر میں یہی وطیرہ ہے کہ وہ خاموش نہیں رہ سکتے
ان کے نزدیک کچھ نہ کچھ کہہ دینا ہی گویا جواب تصور ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ حقیقت اور نفس الامر
میں جواب ہو یا نہ ہو۔ صاحب بحر الرائق تو یہ فرماتے ہیں کہ شعروں کے اندر میت کا مرثیہ پڑھنا جائز ہے
یعنی مردہ کے دنیا سے چلے جانے پر افسوس اور صدمہ کا ذکر اور مردہ کے کمالات اور خوبیوں کا تذکرہ درست
ہے۔ یہ انہوں نے کب اور کہاں کہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ ساتھ مرثیہ پڑھا کرو جھگڑا تو جنازہ کے ساتھ
ساتھ پڑھنے کا ہے اور یہ حوالہ اس کا ہرگز جواب نہیں ہے یہ ہے مولوی محمد عمر صاحب کا طرز استدلال
اور اس کا پس منظر۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں۔ ابن عدی نے کامل میں اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں تخریج کی

احادیث البدایہ جلد دوم ص ۱۶۴ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل میں لکھا ہے عن ابن عمرؓ قال لم یکن یسمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یمشی خلف جنازۃ الا قول لا الٰہ الا اللہ مبدیا و راجعا اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ انتہی (جاء الحق ص ۴۱۲)

جواب: مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ اس کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی (ان شاء اللہ تعالیٰ) گو فضائل اعمال میں کسی ضعیف حدیث کا اعتبار ہوتا ہے؛ لیکن یہ تو ضعیف بھی نہیں۔ اس میں تیسرے ایک راوی ہے جس کا نام ابراہیم بن ابی حمید ہے۔ امام ابو زرعہؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ کان یضع الحدیث (لسان المیزان ج ۱ ص ۲۸) کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ موضوع اور جعلی حدیثوں سے بھی مفتی احمد یار خان صاحب فضائل اعمال ثابت کرتے ہیں مع مفتی احمد یار خان صاحب کا امام شعرانیؒ، شیخ عبد الغنی نابلسی اور شیخ عثمان کحیلیؒ وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کے جواز کے حوالجات نقل کرنا، تو اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ صوفیوں کا گروہ ہے اور جعلی روایت میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہوتی (میدان فتویٰ میں حضرات فقہاء کرامؒ کی بات معتبر ہوتی ہے نہ کہ حضرات صوفیاء کی) اس کا مختصر جواب مفتی صاحب کی زبانی سن لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں: "ابن حجرؒ شافعی ہیں تو احناف کے مقابل شوافع کے فتوے پر عمل ہوگا؟ ہرگز نہیں۔" (بلفظہ جاء الحق ص ۲۲۲ وشلالی ص ۲۲۲)۔ ہم بھی کہہ دیں گے کہ حضرات احناف کے مقابل حضرت امام شعرانیؒ وغیرہ شوافع کی بات پر ہرگز عمل نہ ہوگا، کیونکہ حضرات فقہاء احنافؒ کی صریح عبارات سے اس کی ممانعت ثابت ہے، جیسا کہ باحوالہ پیشتر بیان کر دی گئی ہے۔

قبر پہ اذان

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد میت کو قبر میں دفن کیا جائے اور بسم اللہ علیٰ ملۃ رسول اللہ وغیرہ پڑھا جائے۔ اور دفن کے بعد

سورۂ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں سورۂ فاتحہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن معاذ کی قبر پر سبحان اللہ اور الحمد للہ وغیرہ خود بھی پڑھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس کی تلقین بھی کی۔ اسی طرح استغفار اور تثبیت کا سوال بھی کیا۔ یہ سب امور صحیح اور ثابت ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر آپ نے دعا بھی کی ہے اور اس کا حکم بھی فرمایا ہے۔ لیکن قبر پر اذان کا ثبوت نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے۔ اس وقت قبریں بھی ہوتی تھیں، مُردے دفن بھی کئے جاتے تھے اور اذان بھی تھی اور اذان دینے والے بھی ہوتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت تو اذان علی القبر سنت اور جائز نہ ہوئی، اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد یہ جائز ہو گئی؟ اور اس کے جواز پر رسالے بھی لکھے جانے لگے۔

اذان ایک خاص عبادت ہے اور اس کے لئے شریعت مقدسہ میں مخصوص مواقع مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے تجاوز کرنا حدود اللہ سے تعدی اور معصیت ہے۔ اگر ایسی تعدیاں جائز ہوتیں تو عیدین کی نماز کے لئے بھی اذان و اقامت درست ہوتی اور اس کے لئے اذان علی القبر سے بہت زیادہ اور بہت اچھے وجوہ بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس بارہ میں تمام حضرات فقہاء کرامؒ متفق ہیں۔ چنانچہ امام غرناطیؒ لکھتے ہیں:

ومن ذلك الاذان والاقامة في العيدين فقد نقل ابن عبد البر اتفاق العلماء على ان لا اذان ولا اقامة فيهما۔ (الاعتصام ج ۲ ص [illegible])

اور اسی قبیل سے اذان و اقامت عیدین میں امام ابن عبد البرؒ نے تمام حضرات فقہاء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عیدین میں نہ اذان ہے نہ اقامت۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف قبر پر مخالفِ سنت امور کا سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں چنانچہ امام ابن ہمام الحنفیؒ اپنی بے نظیر تالیف میں لکھتے ہیں کہ:

ويكره عند القبر كل ما لم يعهد من السنة والمعهود منها ليس الا زيارتها والدعاء

اور قبر کے پاس ہر وہ چیز مکروہ ہے جو سنت سے ثابت نہ ہو۔ اور ثابت من السنۃ صرف قبروں کی زیارت ہے اور

عندها فلما كان يعني صلى الله عليه وسلم في الخروج الى البقيع ويقول السلام عليكم دار قوم مؤمنين وانا ان شاء الله بكم لاحقون اسأل الله لي ولكم العافية۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۱۰۲ طبع مصر)

ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے تو دعا کرتے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنت البقیع میں جا کر کیا کرتے تھے اور یوں فرمایا کرتے تھے سلام ہو تم پر اے مومنوں کی بستی میں بسنے والو ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں میں اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرتا ہوں۔

اور اسی طرح کی عبارت بحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۲ اور در المختار ج ۱ ص ۲۳۳ اور فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۶ وغیرہ میں بھی ہے۔ اس سے بھی صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اذانِ قبر بلکہ اس قسم کے وہ جملہ امور جو سنت سے ثابت نہیں، قبر کے پاس مکروہ ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

وفي الاقتصار على ما ذكر من الوارد اشارة الى انه لا يسن الاذان عند ادخال الميت في قبره كما هو المعتاد الان وقد صرح ابن حجر في فتاواه بانه بدعة۔ (شامی ج ۱ ص ۸۳۷)

(سلام، سنت اور دعا پر) اقتصار کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میت کو دفن کرنے کے وقت اذان کہنا جیسا کہ آج کل عادت ہو گئی ہے مسنون نہیں ہے اور امام ابن حجرؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ قبر پر اذان دینا بدعت ہے۔

اور در البحار میں ہے:

من البدع التي شاعت في الهند الاذان على القبر بعد الدفن۔

ان بدعات میں سے جو (بعض) بلاد ہند میں شائع ہو گئی ہیں ایک دفن کے بعد قبر پر اذان دینا بھی ہے۔

اور توشیح شرح تنقیح لمحمد الحلبی میں اس اذان کے متعلق لکھا ہے:

ليس بشيء۔

یہ اذان کوئی چیز نہیں۔

یہ تمام عبارتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا شریعت مطہرہ میں کسی سے کوئی ثبوت ہی نہیں، یہ خلاف سنت بھی ہے اور بدعت بھی، حضرات فقہاء کرامؒ کے احکام کے خلاف بھی ہے اور لیس بشیء بھی۔ ایک منصف آدمی کے لئے یہ حوالجات بالکل کافی ہیں۔ البتہ متعنت کے لئے

کوئی چیز بھی سود مند نہیں ہوتی ۔ فریقِ مخالف کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے اور ساتھ ساتھ جوابات بھی دیکھ لیجئے تاکہ حق و باطل میں بخوبی فرق معلوم ہو سکے ۔

پہلا اعتراض : مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں : "ان عبادات میں جو دُعا کا ذکر کیا گیا ہے) کہ اذان خود دعا بلکہ بہترین دعا ہے کہ وہ ذکر الٰہی ہے اور ہر ذکر الٰہی دعا ، تو وہ بھی مستحب ثابتہ کی ایک فرد ہوئی " (ایذان الاجر ص۳)

جواب : خان صاحب کا یہ ارشاد ایک مجذوبانہ مغالطہ ہے اور کئی وجوہ سے باطل ہے ۔
اوّلاً اس لئے کہ اگرچہ بعض اعتبارات سے ذکر اور دُعا ایک ہی ہے لیکن عرف میں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ دُعا میں طلب اور سوال پیدا ہوتا ہے اور ذکر اس سے خالی ہوتا ہے ۔ چنانچہ علامہ شاطبی لکھتے ہیں :

هو فی العرف غیرہا انتہ عاد (الاعتصام ج ۲ ص۲۳۲) ذکر عرف میں دُعا کے علاوہ ہے ۔

اور شرح التقریب کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنت البقیع والوں کے لئے جو دُعا کی تھی اس میں عافیت کا سوال تھا اور یہی سنت سے ثابت ہے ۔
وثانیاً خود خان صاحب اذان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تو خالص ذکر بھی نہیں (فتاویٰ رضویہ ، جلد دوم ص۴۱۹) تو پھر یہ کیسے صحیح ہوا کہ اذان ذکر الٰہی ہے اور ہر ذکر الٰہی دُعا ہے ؟
وثالثاً اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اذان دُعا ہے تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ وغیرہ کو یہ بات کیوں سمجھ نہ آئی کہ اذان دُعا ہے ، اور قبر پر یہ بھی ہونی چاہئے جب یہ طریقہ اُن کو سمجھ نہ آ سکا اور حضرات ائمہ مجتہدینؒ نے بھی اس کو نہ سمجھا ، تو کسی دوسرے کی سمجھ کیسے حجت ہو سکتی ہے سہ

حیرتم تا کہ عارف و زاہد کے گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

دوسرا اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بحر الرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بجز زیارت و دُعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے ، بالکل درست ہے ۔ وہ زیارت قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب

وہاں زیارت کی نیت سے عبادت تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ تا بیا اتر کا امر ترک کرے اور یہاں گفتگو بعد دفن کے وقت کی ہے زیارت کا وقت نہیں۔ اگر وقت دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میت کو قبر میں اتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا جس کو فتاویٰ رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے، سب منع ہو الخ (جاء الحق ص۳۱۲ و ص۳۱۳ ملخصاً)

جواب: یہ ہے مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کا جواب۔ مگر بات یہ ہے کہ صاحبِ بحر الرائق وغیرہ نے تو ویسے عند القبر کہا ہے یعنی فی القبر نہیں کہا۔ میت کو قبر میں اتارنا فی القبر ہے عند القبر نہیں ہے۔ اسی طرح تختہ دینا اور مٹی ڈالنا فی القبر اور علی القبر ہے عند القبر نہیں۔ ہاں البتہ دفن کے بعد تلقین کرنا عند القبر ہے مگر وہ تو والدعا عنده قائماً کی مد میں ہے جو سنت سے ثابت ہے۔ اور زیارت و دعا دفن سے قبل تعالی قبر کی کوئی نہیں کرتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ تلقین سے سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا مراد ہے۔ جس کا ثبوت حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث سے ہے۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۴۹) اگر یہ موقوف بھی ہو تب بھی حکماً مرفوع ہے۔ بہرحال صاحب البحر الرائق وغیرہ کے الفاظ ہی اس کو مستثنیٰ کر دیتے ہیں کہ دفن کے بعد دعا اور زیارت کے علاوہ قبر کے پاس اور جو کچھ بھی کیا جائیگا وہ خلافِ سنت ہوگا سجدہ ہو یا طواف، استمداد ہو یا اذان وغیرہ، اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں۔

تیسرا اعتراض: (علامہ شامیؒ نے امام ابن حجرؒ کے حوالے سے جو یہ نقل کیا ہے کہ قبر کے پاس اذان بدعت ہے) اولاً تو ابن حجرؒ شافعی مذہب ہیں۔ بہت سے علماء جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ اذانِ قبر سنت ہے اور امام ابن حجرؒ شافعی اس کی تردید کرتے ہیں تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قولِ شافعی پر؟ دوم امام ابن حجرؒ نے بھی اذانِ قبر کو منع نہ کیا بلکہ اس کے سنت ہونے کا انکار کیا یعنی یہ سنت نہیں۔ (ملخصاً جاء الحق ص۳۱۲)

جواب: مفتی صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے نری دفع الوقتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت کرتا ہوگا۔ اولاً اس لئے کہ یہی امام ابن حجرؒ (اور امام سیوطیؒ) جو شافعی ہیں مگر مسئلہ میلاد وغیرہ مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی ان ہی سے ثابت کرتی ہے

اور اُس وقت اُن کی شافعیت پیشِ نظر نہیں ہوتی - وہاں تو اِن کی تعریفیں کرتے کرتے قلم کند اور زبانیں خشک ہو جاتی ہیں اور یہاں اس طرح جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے "تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قولِ شافعی پر؟"

وثانیاً امام ابنِ حجرؒ نے صرف اس کی سنیت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کو بدعت بھی کہا ہے - چنانچہ خود مفتی احمد یار خان صاحب بحوالہ شامی یہ حوالہ اس طرح نقل کرتے ہیں (ترجمہ بھی مفتی صاحب کا ہے)۔

وقد صرح ابن حجر بانه بدعة وقال من ظن انه سنة فلم يصب ۔	اور ابن حجرؒ نے صریح فرمادی کہ یہ بدعت ہے اور جو کوئی اس کو سنت جانے وہ درست نہیں کہتا (جاء الحق ص ۲۱۲)

اس سے قبل علامہ شامیؒ کی عبارت یوں ہے کہ :

لا يسن الاذان عند ادخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن الخ (شامی ج ۱ ص ۸۳۷)	میت کو قبر میں داخل کرتے وقت جیسا کہ اب عادت بنالی گئی ہے اذان کہنا سنت نہیں ہے ۔

امام ابنِ حجرؒ کی تصریح کے بعد کہ یہ بدعت ہے یہ کہہ دینا کہ انہوں نے منع نہیں کیا کتنی حیرت ناک بات ہے مگر مفتی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدعت ہی کے ذریعہ سے تو ہماری گاڑی چلتی ہے ہم اس کو منع نہیں کرتے ۔

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح　　نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

وثالثاً رد المحتار والے تو حنفی ہیں وہ تو شافعی نہیں - ان کی بات کیوں رد کر دی گئی ہے؟ اسی طرح امام ابنِ عابدین شامیؒ حنفی ہیں اور امام ابنِ حجرؒ کے اس حوالہ کو اپنی تائید میں پیش کر رہے ہیں، اس سے کیوں اغماض کیا گیا ہے؟

ورابعاً وہ کون سے علماء ہیں جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں جو اذانِ قبر کو سنت کہتے ہیں؟ ان کا نام اور کتاب کا حوالہ تو تحریر فرمایئے - یہ بات آپ نے صیغہ راز میں کیوں رکھ چھوڑی ہے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو جاتا کہ ایسے علماء بھی ہیں (جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں) جو اذانِ قبر کو سنت کہتے ہیں - باقی خان صاحب بریلوی وغیرہ بدعت پسند مولویوں کی عبارتوں سے صرف اپنے ماؤف دل کی تسکین تلاش کیجئے - اہلِ سنت والجماعت کے لئے ایسے مبتدعین کی بات پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی کیونکہ ان

کی بات صرف آپ کو ہی پسند ہو سکتی ہے جو   نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ہمارے اکابر نے تصریح کر دی ہے۔ **الجواب:** قبر پر اذان کہنا خلاف سنت اور بدعت سیئہ ہے جیسا کہ تصریحات فقہاء سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵ ص۲۱۲)۔

چوتھا اعتراض: علامہ محمود [illegible] کی توشیح کی عبارت کے جواب میں مفتی صاحب لکھتے ہیں: توشیح کا فرمانا لیس بشیئ یہ اس کے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سنت محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنت یا واجب سمجھنا محض غلط ہے۔ جو فقہاء کرام اس کو بدعت فرماتے ہیں وہ بدعت جائزہ یا کہ بدعت مستحبہ فرماتے ہیں نہ کہ بدعت مکروہہ کیونکہ بلا دلیل کراہت ثابت نہیں ہوتی۔ (بلفظہ جاء الحق ص۲۶۲)۔

جواب: مفتی صاحب کا یہ جواب چند وجوہ باطل ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ یہ ان کا اس کلیہ باطل پر مبنی ہے کہ جواز اور استحباب کے لئے دلیل شرعی ضروری نہیں سمجھتے اور علماء کے قول سے بھی اس کو مستحب تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ جواز اور استحباب بھی شرعی احکام ہیں اور ان کے اثبات کے لئے بھی دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔

وثانیاً مستحب جیسے شرعی حکم کو جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیس بشیئ جیسے سے تعبیر کرنا اور وہ بھی محض اپنی غرض فاسد کے تحت دین کی سراسر بغاوت ہے اور دُرمختار کے حوالے سے قیل یستحب سے اس پر استدلال کرنا اور پھر لفظ قیل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضعف کی علامت نہیں تمام بے دلیلی باتیں ہیں کیونکہ دین کسی ایسے ویسے عالم کی رائے یا اس کی غرض کا نام نہیں ہے۔ یہاں جمہور کی نقل معتبر ہو گی یا کم از کم معتبر اور مستند عالم کی بات جو با دلیل ہو۔

وثالثاً وہ کون سے حضرات فقہاء کرام ہیں جو اذان علی القبر کو بدعت جائزہ یا بدعت مستحبہ فرماتے ہیں؟ شاید وہ مفتی صاحب کے عالم خیال، صوبہ خواہش اور ضلع غرض فاسد میں آباد ہوں۔ مفتی صاحب نے ہدایہ کے حاشیہ سے جو نقل کیا ہے کہ لیس بشیئ سے وہ چیز مراد ہو گی جس پر ثواب نہ ملتا ہو اور لیس بشیئ یا مباح پر صادق آتا ہے۔ اور پھر یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوا کہ لیس بشیئ یہ

مباح کو بھی کہا جاتا ہے (مقیاس ص۳۲) تو یہ کہ مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند حضرات کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ وہ اباحت کو دلیل شرعی کا محتاج نہیں سمجھتے۔ حالانکہ باحوالہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اباحت بھی حکم شرعی ہے اور اباحت بغیر اذن شارع اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اس لیے یہ تمام مغز کھپائی مفتی صاحب کی بالکل بے سود ہے۔

بہرحال یہ ایک واضح اور بین حقیقت ہے کہ قبر پر اذان دینا نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ حضرات مجتہدینؒ سے اس کا جواز منقول ہے اور نہ فقہاء کرامؒ سے، بلکہ وہ اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلاف سنت اور بدعت ہو وہ کیسے جائز اور مستحب ہو سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خان صاحب بریلوی وغیرہ اس کو خود سنت کہتے ہیں۔ مگر اثبات سنت ان کے منہ کی بات کا نام نہیں ہے، یہاں ٹھوس اور معتبر دلیل درکار ہے۔

اذان علی القبر کے جواز کے دلائل | قبر پر اذان دینے کے جواز میں متعدد اہل بدعت حضرات نے چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ایذان الاجر ہے (جس کا بہترین جواب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اسماع الفطرت سے دیا ہے) اس میں خان صاحب نے بزعم خود پندرہ دلیلیں تمام کی ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: یہ پندرہ دلیلیں ہیں کہ چند ساعات میں فیض قدیر سے قلب فقیر پر فائض ہوئیں (ایذان الاجر ص۱۰) مگر ان میں ایک بھی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے قبر کے اوپر اذان کا مسئلہ ثابت ہو۔ ان دلائل میں کسی میں اذان کی فضیلت کا ذکر ہے اور کسی میں دعا اور ذکر کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ کسی میں قبر کے اندر میت کیلئے تثبیت کا سوال ہے اور کسی میں اس کے لئے تخفیف عذاب کا بیان ہے اور کسی میں سُبْحَانَ اللّٰہِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وغیرہ کا قبر پر اثبات ہے۔ کسی میں استعاذہ من الشیطان کی دعا کا ذکر ہے اور کسی میں تلقین کا۔ کسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسم گرامی لینے سے عذاب کے ٹل جانے کا بیان ہے اور کسی میں شیطان کے بھاگ جانے کا وظیفہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اور دلائل اپنے مقام پر حق ہیں اور ان کا

کوئی بھی مسلمان منکر نہیں ہے۔ مگر سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا مروجہ اذان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ نے قبر پر دی ہے؟ اگر اس کا ثبوت ہے تو لایئے انظر کم انتظر۔ اس دلیل سے یہ مسئلہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی حدیث سے لا الٰہ الا اللہ کا پڑھنا لیا اور کسی سے درود شریف کی فضیلت اخذ کر لی اور کسی حدیث سے شیطان کے بھاگنے کی بات اخذ کر لی اور کسی سے اذان کی، اور سب کو جوڑ کر اذان ثابت کر دی۔ اس کا نام دلیل نہیں ہے۔ ایسے طرزِ استدلال سے اسلام میں کیا کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خان صاحب کی سب سے بڑی اور فنی دلیل کو جس کو انہوں نے دلائل کی مد میں نمبر اوّل پر پیش کیا ہے نقل کر کے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیں تاکہ آپ کو نمونہ از خروارے کے طور پر بقیہ دلائل کا معیار اور خان صاحب کا گلستانِ دلائل بھی معلوم ہو جائے، اور ان دلائل سے ان کے اختیار کردہ مسائل کا خاکہ بھی سامنے آ جائے۔ اور یقین کیجئے کہ ان کی ہر دلیل اس کے دعویٰ کے اثبات سے قاصر اور فی نفسہٖ غیر موثر ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

اِک فغاں بے شرر سینے میں باقی رہ گئی   سوز بھی جاتا رہا جاتی رہی تاثیر بھی

خان صاحب لکھتے ہیں کہ دلیل اوّل وارد ہے کہ جب بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور سوال نکیرین ہوتا ہے، شیطان رجیم وہاں بھی خلل انداز ہوتا ہے اور جواب میں بہکاتا ہے۔ امام ترمذی محمد بن علی نوادر الاصول میں امام اجل سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ جب مردے سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے۔ شیطان اس پر ظاہر ہوتا اور اپنی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں تیرا رب ہوں، اس لئے حکم آیا کہ میت کے لئے جواب میں ثابت قدم رہنے کی دعا کریں اور صحیح حدیثوں سے ثابت کہ اذان شیطان کو دفع کرتی ہے، اور جب ثابت ہو گیا کہ وہ وقت عیاذاً باللہ مداخلت شیطان لعین کا ہے اور ارشاد ہوا کہ شیطان اذان سے بھاگتا ہے اور ہمیں حکم آیا کہ اس کے دفع کو اذان کہو۔ تو یہ اذان خاص حدیثوں سے مستنبط بلکہ عین ارشاد شارع کے مطابق اور مسلمان بھائی کی عمدہ امداد و اعانت ہوئی۔ (ایذان الاجر ص ۳ و ص ۴ بلفظہٖ ملخصاً)۔

جواب: خان صاحب کا یہ ارشاد ایک خالص مجذوبانہ مغالطہ اور قلبی تدبر کا افسوسناک

مظاہرہ ہے۔ ثالثاً اس لئے کہ شرعی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی تکلیفی زندگی جس میں اغوائے شیطانی کا خطرہ رہتا ہے موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ قبر میں اغوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی نوادر الاصول کا حوالہ تو چنداں قابل التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ کوئی مرفوع حدیث نہیں بلکہ ایک تابعی کا موقوف قول ہے، اور پھر اس کی سند بھی ذکر نہیں کی گئی اور نوادر الاصول ان کتابوں میں سے ہے جن میں رطب و یابس سبھی کچھ ہے۔ المزاح فی المزاح لعلامہ بدرالدین الغزیؒ (المتوفی ۹۸۴ھ) کے حاشیہ میں ہے :

قال السیوطیؒ فی الجامع الکبیر کل ما عزی الی العقیلی وابن عدی والخطیب البغدادی وابن عساکر او للحکیم الترمذی وذکر جماعة غیرهم فهو ضعیف فیستغنی بالعزو الیها عن بیان ضعفه۔ (حاشیہ المزاح فی المزاح ص۴۱)

امام سیوطیؒ جامع کبیر میں لکھتے ہیں کہ جو روایت عقیلیؒ ابن عدیؒ اور خطیب بغدادیؒ اور ابن عساکرؒ اور حکیم ترمذیؒ اور ان کے علاوہ ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا، کی طرف منسوب ہو تو وہ ضعیف ہوگی۔ ان کی طرف روایت کی نسبت کر دینا ہی اس کے ضعف کے لئے کافی ہے اس کے ضعف کے الگ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اگر ان کتابوں میں کوئی روایت با سند ہو اور سند بھی متصل ہو اور راوی بھی تمام ثقہ ہوں اور شذوذ اور علت قادحہ سے بھی محفوظ ہو، تو الگ بات ہے ورنہ ان کی طرف کسی روایت کا منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کی دلیل ہے اور یہی وہ کتابیں ہیں کہ جن سے جملہ اہل بدعت اور خصوصاً خان صاحب بریلی اپنے سب مسائل ثابت کرتے ہیں کیا خوب سمجھے مذہب معلوم اہل مذہب معلوم!

ورابعاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قبر میں بھی شیطان کا دخل ہوتا ہے اور بعض حضرات صحابہ کرامؓ سے دفن کے بعد کی دعائیں میں اللّٰھم اجرھا من الشیطان اور اللّٰھم اعذہ من الشیطان اور اسی قسم کے جو الفاظ وارد ہوتے ہیں وہ اپنی حقیقت ہی پر محمول ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ بہت سے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شیطان کا دخل احادیث سے معلوم ہے مگر ان مقامات پر شاید خان صاحب بھی اذان کو گوارا نہ کریں۔ چنانچہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۷۶ وغیرہ کتب صحاح میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت یہ دعا پڑھے :

بسم اللہ جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا (الحدیث۔ بخاری ج ۲ ص ۷۷۶) — اللہ کے نام سے، اے اللہ ہمیں شیطان سے بچا اور شیطان کو اس چیز (یعنی اولاد) سے جو تو ہمیں دے بہت الگ رکھ۔

حافظ ابن حجرؒ حضرت مجاہدؒ سے اس کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ :

ان الذی یجامع ولا یسمی یلتف الشیطان علی احلیلہ اھ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۲۹) — جو شخص ہمبستری کے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتا تو شیطان اس کے آلۂ تناسل پر لپٹ جاتا ہے، اور ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔

سوچئے اس سے زیادہ نازک مقام شیطان کو بھگانے کا اور کیا ہوگا؟ مگر قبر پر اذان دینے والے حضرات کے نزدیک اس موقع پر بھی شیطان کو بھگانے کا کبھی خیال پیدا نہ ہوا۔ ان کے نزدیک تو اس موقع پر بھی اذان کہنا مستحب اور فرض سنت ہونی چاہیئے۔ یہاں صرف مسلمان بھائی ہی کی امداد نہیں بلکہ مسلمان بہن کی ہمدردی اور امداد بھی ہوگی اور وہ بیچاری دونوں تکلیف سے بھی محفوظ رہے گی بلکہ اور ان کی اولاد پر بھی احسان ہوگا کہ شیطان کی دخل اندازی سے وہ بھی محفوظ رہیں گے۔ اس موقع پر اذان دینے میں مسلمان بھائی اور بہن اور ان کی اولاد تین افراد کا بھلا ہے اور نیک آدمی کی اذان کا اثر کچھ کم نہیں۔ لہٰذا فریق مخالف کے نیک حضرات مریدوں، معتقدوں اور شاگردوں کو مشغول بکار ہونے کا حکم دیں اور خود اذان دینے کا فریضہ ادا کریں تاکہ ان کی امداد ہو جائے۔ اگر اس موقع پر وہ ایسا نہیں کرتے تو وجہ فرق بیان کریں۔

وثالثاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان ہذہ الحشوش محتضرۃ (الحدیث) (ابوداؤد ج ۱ ص ۲ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۲) — یہ قضائے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود رہتے ہیں پس جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں جانے لگے تو یہ دعا پڑھ لیا کرے۔

نیز فرمایا :

اللّٰہم انی اعوذ بک من الخبث والخبائث (ترمذی ج ۱ ص ۳) — کہ اے اللہ مجھے نر اور مادہ جنوں و شیطانوں سے بچا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پاخانوں میں شیاطین موجود رہتے ہیں۔ کیا قبر پر اذان دینے والوں نے کبھی اس موقع پر اذان کہنے کو مستحب اور فرض سنت کہا ہے؟ حالانکہ یہاں بھی کبھی کبھی ضرورت پیش آتی ہے کہ پیر اور مفتی صاحب تو قضائے حاجت میں مشغول ہوں اور باوفا مرید اور شاگرد اذان دے کر شیاطین کو بھگا

کی فکر میں ہوں، اور اگر ایسا کرتے ہیں تو خوب، اور اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے؟ بینوا و توجروا۔

و رابعاً خان صاحب بریلی کے پیش کردہ جملہ فوائد (اور ان سے اخذ کر کے مفتی احمد یار خان صاحب کے یہ تمام منافع کہ اذان میں پوری تلقین ہے ___ اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے ___ اذان سے دل کی وحشت دور ہوتی ہے ___ اذان کی برکت سے غم دور ہوتا ہے ___ اذان کی برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے ___ اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذاب قبر دور ہوتا ہے اور اذان میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور صالحین کے ذکر کے وقت نزول رحمت ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے ایذان الاجر اور جاء الحق ص ۳۰۲ تا ص ۳۱۲ بلفظہ ملتقطاً) جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کو بھی معلوم تھے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے عمر بھر ایک دفعہ بھی کسی کی قبر پر اذان نہ دی، نہ اس کا حکم صادر فرمایا؟ نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے کسی نے اس پر عمل نہ کیا اور نہ حضرات ائمہ دین میں سے کسی نے یہ راز سمجھا، تو آج چودھویں صدی میں کسی شخص کو یہ حق کہاں سے اور کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنی ان بے حقیقت قیاس آرائیوں سے دین میں پیوندکاری کرے؟ قبر پر اذان دے کر مسلمان بھائی کی عمدہ امداد کا یہ جادو اثر نسخہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود رؤف اور رحیم ہونے کے اپنی امت مرحومہ کو نہ بتایا اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کو بھی یہ نسخہ عجیبہ و مفیدہ معلوم نہ ہو سکا اور حضرات ائمہ مجتہدینؒ بھی اس اکسیر اعظم سے محفوظ رہے اور سلف صالحینؒ بھی اس نادر گوہر کے اثر سے فیض یاب نہ ہو سکے تو پھر آج اس نسخہ کو کون پوچھتا ہے؟ ؎

ہم کسی کا شکوۂ بے جا اٹھا سکتے نہیں
اور بھلے تھے جو ہمیں ان کی جفا میں بے محل

وخامساً دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ شیطان لعین انسان کا عدو مبین ہے، اور ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ انسان کو اغوا کر کے اپنا رفیق اور ساتھی بنا لے۔ بیداری میں وہ بھلا کیا پیچھے چھوڑتا، وہ تو خواب غفلت میں بھی انسان کو پریشان کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اور خواب کی ایک قسم تخویف من الشیطان ہے جو اس کی واضح دلیل ہے۔ اہل بدعت کے قاعدہ کی رو سے لازم ہے کہ ان او

رات کے مختلف اوقات میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی عمدہ امداد اس اذان کے ذریعہ کی جائے، اور سفر و حضر میں اس عمدہ امداد کو فراموش نہ کیا جائے۔ کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے، ہمیں تو بہرحال اس پر عمل کرنا چاہیئے کہ ماں شان میں تیرا احسان! اور یہ کس سے پوشیدہ ہے کہ آج گلیوں، محلوں، سینماؤں، کالجوں، اسکولوں اور دفتروں میں آج کل جس طرح شیطان کا دخل ہے وہ کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ لہٰذا اپنے مسلمان بھائیوں کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ ہونی چاہیئے، اور پھر حکومت کے فیصلہ کا انتظار کیجئے کہ وہ اس ہمدردی کا کیا صلہ تجویز کرتی ہے؟ اور آج کون مسلمان ہے جو اس ناپائیدار دنیا میں وحشت اور غم میں مبتلا نہیں، ہر طرف سے بیسیوں مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور وہ کون سا گھر ہے جس کے ماں باپ اور بیٹا یا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ غم و الم سے دوچار نہ ہو، اس کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ کیوں نہیں کی جاتی! اور سینکڑوں مکانات بعض افراد کی غلطی اور نادانی کی وجہ سے نذر آتش ہو جاتے ہیں پھر اذان کے ذریعہ آگ بجھا کر ان بے چاروں کی یہ عمدہ امداد کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ بھی کوئی عجیب نسخہ ہے کہ میت کی عمدہ امداد تو اس سے ہوتی ہے اور زندہ دل کا ہول دلی، وحشت اور غم اس سے دفع نہیں کیا جاتا، اور نہ تو آتش جیسی اس سے بجھائی جاتی ہے۔ ورنہ معنوی آتش حسد، بغض، عداوت [illegible] یہ کیا عجیب و غریب العقول منطق ہے۔ فیصلہ آپ پر ہے ۔

یہاں تک آپ کی تعظیم کر دی — اب آگے آپ کے اعمال جانیں

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ! اہل بدعت حضرات کا ایک معمولی مغالطہ ہے جس میں وہ سب کے سب گرفتار ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب کے الفاظ میں وہ مغالطہ یہ ہے کہ بعد دفن ذکر اللہ تسبیح و تکبیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنت ہے اس پر زیادتی کرنا منع نہیں۔ جیسا فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں، ان میں کمی نہ کرے۔ اگر کچھ بڑھا دے تو جائز ہے (ہدایہ وغیرہ) اذان میں تکبیر بھی ہے اور کچھ زیادتی، لہٰذا یہ سنت سے ثابت ہے (ملخصاً جاء الحق ص [illegible])۔

جواب: یہ استدلال بھی سراسر مردود ہے۔ اوّلاً اس لئے پوری تفصیل کے ساتھ عرض کیا جائے

چونکہ اب یہ سب منافع اور فوائد جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام وغیرہم کو معلوم تھے مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی قبر پر اذان نہیں دی۔ لہٰذا سنتِ ثابتہ کے مقابلہ میں ایسے خود ساختہ عقلی دلائل ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ عقلیات جو شریعت کے معیار اور میزان پر پورے نہ اترتے ہوں "نہ قابلِ اعتماد و محلِ اعتبار نمی توانند بود" (عجالۂ نافعہ ص۱۰)۔

وثانیاً مفتی احمد یار خان صاحب نے ہدایہ کے حوالہ سے اتنی بات (جو مفید مطلب تھی) تو نقل کر دی ہے کہ اگر کچھ بڑھا دے تو جائز ہے لیکن صاحب ہدایہ کی دلیل نقل نہیں کی کہ یہ زیادت کیوں جائز ہے؟ صاحب ہدایہ اپنی عادت کے موافق اس مسئلہ کی نقلی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ:

ان اجلاء الصحابۃ کابن مسعودؓ وابن عمرؓ وابی ھریرۃؓ زادوا علی الماثور (ہدایہ ج۱ ص۲۴۲)

بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ ماثور تلبیہ میں کچھ الفاظ بڑھاتے تھے

یہ وہ صحابی ہیں جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے والے تھے ان کے اس زیادت والے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور موجود تھا ورنہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت اور بدعت کے بدلے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور تغیر کو بدعت ظلماء اور بدعتِ عظمیٰ وغیرہ سے تعبیر کرتے تھے جس کی پوری تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اگر ان کے پاس ایسا ثبوت نہ ہوتا تو ہرگز وہ یہ زیادتی نہ کرتے۔

ہم نے جو یہ کہا کہ ان کے پاس ثبوت ہوگا۔ یہ بات محض "ہوگا" پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حقیقۃً ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

والناس یزیدون لبیک ذا المعارج ونحوہ من الکلام والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یسمع فلا یقول لھم شیئا۔ (ابوداؤد ج۱ ص۲۵۲ و نصب الرایہ ج۳ ص۳۴)

کہ لوگوں نے لبیک ذا المعارج اور اسی طرح کا اور کلام تلبیہ میں زیادہ کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو سنا اور ان کو کچھ نہ کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تلبیہ کے اندر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کی موجودگی میں یہ کلمات حضرات صحابہ کرامؓ زیادہ کرتے تھے، اور آپ نے سُن کر بھی اُن کو منع نہیں کیا تو یہ آپ کی تقریری حدیث ہے (دیکھئے تحفۃ الذاکرین ص ۱۸۷ وغیرہ) - یہی حضرت ابوہریرہؓ جن کا حوالہ صاحب ہدایہ نے دیا ہے کہ وہ تلبیہ میں بعض الفاظ زیادہ کیا کرتے تھے، ان سے (نسائی ج ۲ ص ۳۰، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم ج ۱ ص ۴۵۰ میں علیٰ شرط الشیخین اور اس کے تحت موارد الظمآن ص ۲۴۲) یہ روایت آتی ہے کہ وہ زیادت کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو بیہقی ج ۲ ص ۴۵ وغیرہ) الغرض جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ تلبیہ میں زیادت کیا کرتے تھے۔ مگر یہ زیادت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی اور تقریری حدیث سے ثابت تھی۔ اس پر مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا قیاس کرنا سراسر باطل اور مردود ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی ایسی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں جس سے قبر پر اذان کا جواز ثابت ہو سکے چہ جائیکہ وہ قربت ہو۔ اور عرض کیا جا چکا ہے کہ جواز اور اباحت بھی حکم شرعی ہے اور وہ بھی صرف شارع سے ثابت ہوگا اور بس۔

اذان میں انگوٹھے چومنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو پردۂ خفا میں ہو اور اُمت کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ آپ کی ایک ایک ادا، ایک ایک حرکت اور نشست و برخاست غرضیکہ کوئی بھی آپ کا قول و فعل پوشیدہ نہیں۔ اذان جیسی عبادت جو دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی تھی اور ہجرت کے بعد تقریباً دس سال مدینہ طیبہ میں آپ کے سامنے ہوتی رہی اور اذان کے کلمات نیز اذان دینے والوں کے نام اور اذان کی جملہ کیفیات احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ مگر کسی بھی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں کہ اذان سنتے وقت انگوٹھے چومنے چاہئیں۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے ہی محبت ہے (اور ہر مسلمان کو ہونی چاہئے) تو اذان دینے والے کے منہ کو چومنا چاہئے جس کے مبارک ہونٹوں اور زبان سے یہ مبارک نام نکلا ہے، اپنے انگوٹھے تو ہر وقت

ساتھ ہی رہتے ہیں، نہ تو ان سے آپ کا نامِ گرامی صادر ہوتا ہے اور نہ اُن پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس فعل کا صحیح احادیث سے ثبوت ہی نہیں (اور خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اور خیر القرون میں یہ ہوتی رہی) تو پھر اس کو دین کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور کس طرح اس کو شعارِ دین بتانا درست ہے اور نہ کرنے والوں کو کیونکر ملامت کرنا روا ہے۔

انگوٹھے چومنے کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اصولی طور پر دو ہیں ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے جب مؤذن کا یہ قول سنا کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو اس وقت انہوں نے

قبّل باطن الانملتين السبابتين ومسح عينيه فقال صلى الله عليه وسلم من فعل مثل ما فعل خليلي فقد حلت له شفاعتي

اپنے کلمے کی انگلیوں کے باطنی حصوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پس حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص میرے اس پیارے کی طرح کرے، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

یہ روایت مسند فردوس دیلمی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تذکرۃ الموضوعات ص۳۶ اور الموضوعات کبیر ص۶۴ میں نقل کی گئی ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصد حسنہ کے حوالہ سے جاء الحق ص۳۹۶ میں نقل کی ہے اور ترجمہ بھی مفتی صاحب ہی کا ہے اور یہ روایت مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حنفیت ص۱۰۴ میں بھی نقل کی ہے۔

جواب: علامہ محمد طاہر حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَلَا يَصِحُّ (تذکرۃ الموضوعات ص۳۶) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ، علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں لَا يَصِحُّ (موضوعات کبیر ص۶۴) کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جب سرے سے یہ روایت ہی صحیح نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے گنجائش ہو؟ اور خود مفتی احمد یار خان صاحب نے امام سخاوی رحمہ اللہ سے وَلَمْ يَصِحَّ نقل کر کے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "یہ حدیث پایۂ صحت تک نہ پہنچی" (جاء الحق ص۳۹۶)۔ مولوی محمد عمر صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے تذکرۃ الموضوعات اور الموضوعات کبیر کے حوالے تو نقل کئے ہیں۔ لیکن لا یصح کا جملہ شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گئے ہیں۔ تف ہے اس علمی خیانت اور بد دیانتی پر۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی اُپج | مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ صحیح نہ ہونے سے ضعیف ہونا لازم نہیں کیونکہ صحیح کے بعد درجہ حسن باقی ہے۔ لہٰذا اگر یہ حدیث حسن ہو تب بھی کافی ہے (جاء الحق ص۱۲۷) مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی محدث جب مطلق لا یصح کہتا ہے تو اس کا مطلب اس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوتا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر حدیث حسن ہوتی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا لیس بصحیح بل حسن وغیرہ سے اس کو تعبیر کرتے ہیں۔ مطلق لا یصح سے حسن سمجھنا قلتِ فہم کا نتیجہ ہے۔

ایک وہم اور التباس کا ازالہ | حضرت ملا علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ جب اس حدیث کا رفع حضرت صدیق اکبرؓ تک صحیح ہو گیا تو عمل کے لئے یہی کافی ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم پر میری اور میرے خلفاء راشدینؓ کی سنت لازم ہے (موضوعات کبیر ص۱۰۸)۔ اور یہی دلیل مفتی احمد یار خان صاحب نے جاء الحق ص۱۲۷ میں اور مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حنفیت ص۳۵۷ میں پیش کی ہے۔ لیکن یہ حضرت ملا علی القاریؒ کا وہم ہے۔ اس لئے کہ اگر بالفرض یہ روایت حضرت ابوبکرؓ تک موقوف بھی صحیح ہوتی تب بھی حجت تھی مگر حضرت ابوبکرؓ سے جو روایت منقول ہے وہ مرفوع ہے اور اس کی سند سرے سے صحیح ہی نہیں ہے نہ یہ کہ مرفوعاً صحیح نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ مرفوع صحیح نہیں ہے موقوف صحیح ہے اور عمل کے لئے کافی ہے کیسے صحیح ہوا؟ باقی جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ لا یصح رفعہ یا لا یصح فی المرفوع تو وہ ابن صالح وغیرہ بعض شیعوں کی موقوف روایات کے پیش نظر ہے۔ وہ اگر بالفرض صحیح بھی ہوں تب بھی موقوف ہونے کی وجہ سے حجت نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ابن صالح وغیرہ صحابی بھی نہیں ہیں۔ ملا علی القاریؒ کا وہم کوئی نئی چیز نہیں۔ امام عبداللہ بن المبارکؒ نے خوب کہا ہے ومن ذا اسلم من الوھم (لسان المیزان ج۱ ص۱۰) وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ الا من عصمہ اللہ تعالیٰ۔

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تحقیق | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جاوے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، پھر بھی فضائل اعمال میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے (جاء الحق ص۱۲۷)۔

جواب: یہ بھی مفتی صاحب کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فضائل اعمال میں ہر قسم کی حدیث بغیر شروط ملاحظہ کے حجت ہوتی ہے، قطعاً غلط ہے۔ امام قاضی ابن العربی المالکیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) وغیرہ ضعیف

حدیث کے متعلق فرماتے ہیں لا یعمل بہ مطلقاً (القول البدیع ص۱۹۵) مطلقاً اس پر عمل صحیح نہیں ہے۔ اور جو عمل کرتے ہیں وہ شرطیں لگاتے ہیں چنانچہ امام ابن دقیق العید (المتوفی ۷۰۲ھ) لکھتے ہیں :

العمل بالحدیث الضعیف مقید بشروط (احکام ج ۱ ص ۱۲۸)

ضعیف حدیث پر عمل کرنا چند شرطوں سے مقید ہے۔

وہ شرطیں کیا ہیں؟ امام سخاوی (المتوفی ۹۰۲ھ) بحوالہ شیخ حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :

ان شرائط العمل بالضعیف ثلاثة الاول متفق علیه ان یکون الضعیف غیر شدید فیخرج من انفرد من الکذابین والمتهمین بالکذب ومن فحش غلطه الثانی ان یکون مندرجا تحت اصل عام فیخرج ما یخترع بحیث لا یکون له اصل اصلا الثالث ان لا یعتقد عند العمل به ثبوته لئلا ینسب الی النبی صلی الله علیه وسلم ما لم یقله۔ (القول البدیع ص۱۹۵)

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں۔ اوّل جو تمام حضرات محدثین میں متفق علیہ ہے کہ حدیث زیادہ ضعیف نہ ہو۔ لہٰذا جس حدیث میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب یا ایسا راوی منفرد ہو جو زیادہ غلطی کا شکار ہوتا ہو تو اس کی ضعیف حدیث معمول بہ نہ ہوگی۔ دوم یہ کہ وہ عام قاعدہ کے تحت درج ہو۔ اس سے وہ خارج ہوگی جس کی کوئی اصل نہ ہو اور محض اختراع کی گئی ہو۔ سوم عمل کرتے وقت یہ اعتقاد نہ کیا جائے کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے تاکہ آپ کی طرف ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو آپ نے نہیں فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ شرطیں مفقود ہوں تو روایت ہرگز قابلِ عمل نہ ہوگی۔ اور آخری شرط تو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کیونکہ جو چیز وثوق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا اور پھر اس کو ثابت ماننا سنگین جرم ہے اور یہ درجہ اوّل کی تو من کذب علیّ (الحدیث) کے بظاہر خلاف ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ :

واما العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال فدعوی الاتفاق فیه باطلة نعم هو مذهب

فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بالاتفاق عمل کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔ ہاں جمہور کا یہ مذہب ہے۔

أجمعوا لكنه مشروط بأن لا يكون الحديث ضعيفا شديد الضعف فإن كان كذلك لم يقبل في الفضائل أيضا (الأزهار المرتبة في الأخبار الموضوعة ص۲۱۲)

مگر اس میں شرط یہ ہے کہ حدیث بہت ضعیف نہ ہو ورنہ فضائل اعمال میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ مبتدعین حضرات ایسی حدیثوں کے اثبات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، فوا اسفا! خان صاحب بریلی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ "حدیث ماننے اور حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے کے لئے ثبوت چاہیے، بے ثبوت نسبت جائز نہیں" (ملفوظ فتاوی شریعت حصہ سوم ص۲۱)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ سابقہ شرطوں کے ساتھ فضائل اعمال میں عمل کرنا جائز اور مستحب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موضوع نہ ہو۔ اگر روایت موضوع ہوگی تو ہرگز قابل عمل نہ ہوگی۔ حافظ ابن دقیق العید لکھتے ہیں:

وإن كان ضعيفا لا يدخل في حيز الموضوع فإن أحدث شعارا في الدين منع منه وإن لم يحدث فهو محل نظر۔ (احكام الاحكام ج۱ ص۲۹)

یعنی اگر ضعیف حدیث ہو بشرطیکہ وہ موضوع نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے لیکن اگر اس سے دین کے اندر کوئی شعار قائم اور پیدا ہوتا ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا ورنہ اس پر غور کیا جائے گا۔

لیجئے یہاں ایک اور بات بھی حل ہو گئی وہ یہ کہ ضعیف حدیث اس وقت قابل عمل ہوگی جبکہ موضوع اور جعلی نہ ہو اور ساتھ ہی وہ دین کا شعار اور علامت نہ سمجھی گئی ہو۔ اگر دین کی علامت یا شعار کا خطرہ ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اور اہل بدعت حضرات تیجے ان چیزوں کو سنت اور حنفیت کا معیار قرار دیتے ہیں اور ان بدعات کو ترک کرنے والوں کو گستاخ اور وہابی کہتے ہیں۔ اور ان کے خلاف مقیاس حنفیت جیسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا ضعیف روایتیں کیونکر حجت ہو سکتی ہیں؟

اور علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

يجوز ويستحب العمل في الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف

کہ جائز اور مستحب ہے کہ فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے مگر شرط یہ

ما لم یکن موضوعا۔ (القول البدیع ص۱۹۵) بشرطیکہ وہ موضوع اور جعلی نہ ہو۔

نیز لکھتے ہیں :

واما الموضوع فلا یجوز العمل بہ بحال (ص۱۹۶) بہر حال موضوع حدیث تو کسی بھی حالت میں قابل عمل جائز نہیں ہے۔

علامہ سخاویؒ کا فضائل اعمال میں ہر ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے حضرات محدثین کے نزدیک چند شرطیں ہیں، اور جو حدیث موضوع اور جعلی ہو اس پر کسی حالت اور کسی صورت میں عمل جائز نہیں ہے، نہ فضائل اعمال میں اور نہ ترغیب وترہیب وغیرہ میں۔ اب بقائمی ہوش وحواس سُن لیجئے کہ انگلیاں چومنے کی تمام حدیثیں صرف ضعیف ہی نہیں ہیں بلکہ موضوع اور جعلی ہیں۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں :

الاحادیث التی رویت فی تقبیل الانامل	وہ حدیثیں جن میں موذن سے کلمہ شہادت میں آنحضرت
وجعلھا علی العینین عند سماع اسمہ صلی	صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام سننے کے وقت انگلیاں
اللہ علیہ وسلم عن المؤذن فی کلمۃ الشہادۃ	چومنے اور آنکھوں پر رکھنے کا ذکر آیا ہے وہ سب کی سب
کلھا موضوعات (تیسیر المقال للسیوطی بحوالہ مولوی محمد عمر)	موضوع اور جعلی ہیں۔

لیجئے اب تو قصہ ہی ختم ہو گیا مفتی احمد یار خان صاحب کو یہ الفاظ دیکھ کر غور کرنا چاہیے کہ "الحمد للہ کہ اس اعتراض کے پرخچے اُڑ گئے اور حق واضح ہو گیا" (جاء الحق ص۲۸۳) پرخچے کس کی دلیل کے اُڑ گئے اور حق کس کی طرف سے واضح ہو گیا ہے ؟ عیاں راچہ بیان فقط

ظلمت کے بیابانک ہاتھوں سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا

امام سیوطیؒ کے کلھا موضوعات کے حوالہ کے بعد یہ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ عرض کریں مگر محض تکمیل فائدہ کے لئے حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روایت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کی روایت حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی منقول ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں :

ثم یقبل ابھامیہ۔ (الحدیث) پھر اپنے دونوں انگوٹھے چومے۔

پہلی روایت میں انگوٹھوں کا ذکر نہیں بلکہ شہادت کی انگلیوں (اور ایک روایت میں ابہام

اور سباحتہ) کا ذکر تھا اور وہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کے باپ یا سُسر جی کے مطابق ذہنی گھڑی روایت مطابق ہے۔ یہ روایت موضوعات کبیر ص۷۲ اور تذکرۃ الموضوعات ص۳۶ وغیرہ میں ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصد حسنہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (جاء الحق ص۳۹۷) اور مولوی محمد عمر صاحب نے طحطاوی ص۱۱۲ کے حوالہ سے نقل کی ہے (مقیاس ص۱۴) لیکن علامہ محمد طاہرؒ اور ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں:

بسند فیہ مجاهیل مع انقطاعہ اھ — کہ اس کی سند میں کئی مجہول راوی ہیں، اور سند بھی منقطع ہے۔ (تذکرہ ص۳۶ و موضوعات ص۷۲)

تو اس ضعیف روایت سے دین کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے؟ امام بیہقیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

فی هذا الاسناد قوم مجهولون لم یکلفنا الله تعالیٰ ان ناخذ دیننا عن لا نعرف (کتاب القراءۃ ص۱۲۷) — کہ اس سند میں کئی راوی مجہول ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول راویوں سے اخذ کریں۔

انگوٹھے چومنے کا ایک اور وزنی ثبوت | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں:

"صدر الافاضل مولانا و مرشدی استاذی مولانا الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنباس ہے، آج کل وہ عام طور پر شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اس کے اکثر احکام اسلامی احکام سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روح القدس (نور مصطفوی) کے دیکھنے کی تمنا کی تو وہ نور ان کے انگوٹھوں کے ناخنوں میں چمکایا گیا۔ انہوں نے فرط محبت سے ان ناخنوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا" (جاء الحق ص۳۹۷ و ص۳۹۸)۔ مولوی محمد عمر صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور انجیل برنباس کا حوالہ بھی دیا ہے (انجیل برنباس ص۳۹) اور عبارت بھی نقل کی ہے جو اغلب ہے کہ انجیل برنباس کی ہی عبارت ہوگی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ "پس آدم علیہ السلام نے منت کی کہا کہ اے پروردگار یہ تحریر مجھے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر عطا فرما تب اللہ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطا کی (پھر آگے ہے) تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پدری محبت کے ساتھ بوسہ دیا اور اپنی دونوں آنکھوں سے ملا"۔ (مقیاس حنفیت ص۱۰۲)۔

اب بھی اگر کوئی شخص انگوٹھے نہ چومے تو اس کی مرضی۔ یہ تو بقول مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ قوی حدیثوں اور حضرات صوفیا کرامؒ اور حضرات فقہاءؒ سے ثابت ہے بلکہ عیسائیوں سے بھی ثابت ہے اور انجیل برنباس کی بھی شہادت ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! غیر مسلموں کی بات کو اپنی تائید میں پیش کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اصل چیز کسی معقول طریقہ اسلام سے بھی تو ثابت ہو۔ جب انگوٹھے چومنے کی سب حدیثیں ہی موضوع اور جعلی ہیں تو پھر اصل کیا اور اس کی تائید کیا؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سابق زمانہ میں عیسائیوں کی اقتداء کرتے ہوئے کسی نے اسی انجیل برنباس کو پیش نظر رکھ کر یہ جعلی حدیثیں بنا ڈالی ہیں اور یار لوگوں نے ان کو پلے باندھ لیا ہے اور دوسروں سے یوں مخاطب فرماتے ہیں کہ ”ارشاد باشد کراہت کے لئے صحیح حدیث تو کیا ضعیف بھی نہ ملے گی صرف یاروں کا اجتہاد اور عداوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے“۔ (جاء الحق بلفظہ ص۳۹۵) لاحول ولا قوۃ الا باللہ استغفر اللہ تعالیٰ ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔

دیکھا آپ نے اہل بدعت حضرات کو کہ دعویٰ کرتے وقت تو گلا دبا دیں مگر ثبوت پیش کرتے وقت بغلیں جھانکیں۔ مفتی صاحب کو اس کا علم ہونا چاہئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا بھی سنت ہے اور آپ کا عدم فعل بھی حضرات فقہاء کرام کے نزدیک کراہت کی دلیل ہے اور یہ صرف یاروں کا اجتہاد نہیں بلکہ ان کے پاس سو فیصدی محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے کہ جعلی اور موضوع حدیث قابل عمل نہیں ہے۔ مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ کیا جعلی اور موضوع حدیث کو تسلیم کرنے اور اس کی تردید کرنے سے عداوت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوتی ہے یا جعلی حدیث کے انکار سے؟ اس کا جواب مفتی صاحب پر موقوف ہے جیسا مناسب سمجھیں ارشاد فرمائیں۔

کفنی یا الفی لکھنے کا بیان

میت کو غسل دینے کے بعد اس کو سنت کے مطابق کفن پہنانا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ بطور تبرک کسی کے کفن میں کوئی کپڑا رکھا جائے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے لئے اپنا تہبند مبارک عطا فرمایا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ کسی بزرگ سے کوئی کپڑا لے کر اپنے کفن

کے لئے اس کو رکھ لیا جائے جیسا کہ بخاری میں باب من استعد الکفن میں اس کے متعلق حدیث آئی ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تبرکات کو اپنی قبروں میں رکھوانے کی وصیت اگر بسند صحیح ثابت ہو تو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک دو نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے فوت ہوئے اور دفن کئے گئے۔ اسی طرح حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے سامنے بھی ہوتا رہا۔ کفن بھی لوگ مُردوں کو پہناتے تھے اور دفنا بھی جانتے تھے۔ ان کو کلمہ طیبہ بھی بہت ہی اچھا یاد تھا اور ان کے دلوں میں اس کی صحیح معنی میں عظمت بھی تھی۔ اسی طرح درود شریف وغیرہ اور تسبیح و تہلیل وغیرہ بھی کچھ ان کو حفظ تھا، اور ان کو قبر اور آخرت کا صحیح حال بھی معلوم تھا اور اپنے اعزہ و اقارب کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ اہل محلہ میں سے اگر کوئی فوت ہو جاتا تو کئی کئی دن تک وہ اس غم میں پریشان رہتے تھے کہ خدا معلوم اس کے ساتھ قبر میں کیا ہوا ہوگا؟ الغرض ان میں کامل ہمدردی بھی تھی اور فکرِ آخرت بھی۔ مع ہذا انہوں نے کفنی وغیرہ نہ لکھی اور نہ اس کا حکم دیا۔ پھر آج وہ کونسا انقلاب رونما ہوا ہے جس کے تحت یہ سب کچھ جائز ہو گیا ہے؟ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں:

"لہٰذا میت کے لئے کفنی وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جاوے۔" (ملخصاً جاء الحق ص [illegible])

کفنی اور الفی لکھنے کے جواز پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، امام حکیم ترمذیؒ کی نوادر الاصول سے جو مرفوع روایت نقل کی گئی ہے کہ جو شخص اس دعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر نکیر کو دیکھے گا (جاء الحق ص [illegible])۔ اسی طرح طاؤس تابعیؒ سے بحوالہ ترمذی مذکور جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کی وصیت کے بموجب ان کے کفن میں یہ کلمات لکھے گئے (جاء الحق ص [illegible]) یہ تمام بے حقیقت اور بے اصل باتیں ہیں۔ پہلے امام سیوطیؒ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ کسی روایت کا حکیم ترمذیؒ وغیرہ کی طرف منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔ باقی جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سرکاری اصطبل کے گھوڑوں کی رانوں پر حبیس فی سبیل اللہ لکھا ہوتا تھا، باوجودیکہ گھوڑے کا نجاست میں آلودہ ہونے کا خطرہ بھی رہتا تھا، لہٰذا میت کے کفن پر لکھنا بھی درست ہے

کی گئی کہ اس کے سینہ پر یا پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا گذری؟ اس نے کہا کہ بعد دفن ملائکہ عذاب آئے مگر جب انہوں نے بسم اللہ لکھی ہوئی دیکھی تو کہا کہ تو عذاب الٰہی سے بچ گیا۔ (بلفظہ جاء الحق ص۲۶۶)

عذاب الٰہی سے اور فرشتوں کے جھگڑے سے بچنے کا یہ بہت ہی عمدہ نسخہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ خیر القرون میں کسی کو کیوں نہ سوجھا؟ اور ان کو ایسا مبارک خواب کیوں نہ آیا؟ پھر یہ بھی قابل غور امر ہے کہ خواب سے دین کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اجماع اہل شرع است بر آنکہ ہیچ حکم از احکام شریعت بواقعات و منامات اتقیاء ثابت نمے شود۔ (قرۃ العینین ص۲۳۲)"

اہل شرع کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کے حکموں میں سے کوئی بھی حکم واقعات اور متقیوں کے خوابوں سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

الغرض جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے نہیں کیا باوجودیکہ اس کا سبب موجود تھا، آج بھی اس کے کرنے کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں ہے، ورنہ کسی صوفی کا کوئی قول و فعل اور خواب معتبر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ

"نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ، خلیفہ نظام الدینؒ گفتہ است فعل مشائخ حجت نہ باشد۔ (البلاغ المبین ص۵۵ منسوب بہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ بعض حضرات نے ان کی کتاب ہونے کا انکار بھی کیا ہے)۔

بدنی اور مالی طریقہ پر ایصال ثواب کا حکم

جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ میت کے لئے ایصال ثواب درست اور جائز ہے، خواہ بدنی عبادات ہوں خواہ مالی ہوں۔ البتہ بدنی عبادات میں (مثلاً نماز، روزہ اور تلاوت قرآن کریم وغیرہ)[1] حضرت

---

[1] مولانا عبد المجید صاحبؒ غیر مقلد تحریر فرماتے ہیں کہ مروجہ ختم بدعت ہے۔ ہاں اگر خاموشی سے بلا ریا صدقہ کیا جائے خصوصاً صدقہ جاریہ وغیرہ تو اس کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح تلاوت قرآن کریم کا بھی۔ انتہی بلفظہ (اہلحدیث ... ۸ ستمبر ۱۹۶۱ء ص۱۰ کالم ۳) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دونوں ایک تلاوت جمع ہو کر برائے میت

امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ اختلاف کرتے ہیں (شرح فقہ اکبر ص۱۵۲ و کتاب الروح ص۱۴۲ وغیرہ) مگر بکثرت حضرات شوافعؒ اور حضرات موالکؒ اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے کتاب الروح از ص۱۴۲ تا ص۱۹۳ میں اس کی نقلی اور عقلی طور پر مبسوط بحث کی ہے۔ حق اور اقرب الی الصواب یہی بات ہے کہ بدنی اور مالی ہر قسم کی عبادت کا ثواب میت کو پہنچایا جا سکتا ہے مگر اس کیلئے چند بنیادی اور اصولی شرطیں ہیں جب تک وہ نہ ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوگا:

(۱) میت مومن اور مسلمان و صحیح العقیدہ ہو گو کتنی ہی گناہگار کیوں نہ ہو اور اسی طرح ایصال ثواب کرنے والا بھی مومن اور مسلمان ہو، ورنہ سب محنت رائیگاں ہوگی۔

(۲) ایسی کسی عبادت میں ریا، نام و نمود و شہرت اور اپنی معنوی عزت اور ناک کی حفاظت کا ہرگز سوال نہ ہو اور نہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کا خیال ہی دل میں ہو، اور خیرات منّ و اذیٰ سے بھی پاک ہو۔

(۳) جو مال صدقہ و خیرات میں دیا جائے وہ حلال اور طیب ہو، خبیث، ناپاک اور غلول وغیرہ کا غیر طیب مال ہرگز نہ ہو جیسا کہ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اقوال حضرات فقہاء کرام سے یہ بالکل واضح ہے۔

(۴) جس مال کا صدقہ اور خیرات دی جائے اس میں کوئی وارث غائب اور نابالغ بچہ نہ ہو، ورنہ اس کا صدقہ کرنا بلا خلاف حرام اور موجب عذاب خداوندی ہے۔

(۵) جو قرآن کریم میت کو پڑھ کر بخشا جائے وہ بلا معاوضہ اور بلا اجرت پڑھا جائے۔

(۶) اپنی طرف سے دنوں کی اور خاص گنتیوں کی تعیین نہ کی جائے اور نہ کھانے کے اقسام میں تعیین ہو۔

(۷) یہ کھانا صرف فقراء اور مساکین کو دیا جائے، برادری کو اور اغنیاء کو نہ کھلایا جائے۔

ان میں بعض ایسے امور ہیں جن میں کسی ادنیٰ کلمہ گو کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، اور ان کا ثبوت قرآن کریم اور صحیح احادیث سے بخوبی واضح ہے۔ بعض دعاوی کے اختصاراً دلائل سن لیجئے۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ کہ خبیث اور ناپاک اور ردی چیز اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے لا یقبل اللہ صدقۃ من غلول

(ترمذی ج۱ ص۳۵) یعنی اللہ تعالیٰ حرام مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا اور حضرت ملا علی بن قاری لکھتے ہیں:

ولو علم الفقير انه من الحرام ودعا له وأمّن المعطي كفرا۔ (شرح فقہ اکبر ص۱۷۳ کانپوری)

یعنی اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال جو مجھے دیا جا رہا ہے حرام ہے اور اس نے دینے والے کے حق میں دعا کی اور دینے والے نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے۔

اور یہی عبارت فتاوی عالمگیری ج۲ ص۲۸۲ میں بھی موجود ہے۔

امام قاضی خانؒ لکھتے ہیں:

وان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانوا بالغين فان كان في الورثة صغير لم يتخذوا ذلك من التركة۔ (قاضی خان ج۴ ص۸۱۱ نولکشور)

کہ اگر میت کے ترکہ سے فقراء کیلئے کھانا تیار کیا جائے تو اچھا ہوگا جبکہ وارث سب بالغ ہوں اور اگر وارثوں میں کوئی ایک بھی نابالغ ہو تو ترکہ سے یہ کھانا تیار نہیں کیا جا سکتا۔

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

حديث جريرؓ يدل على الكراهة ولا سيما اذا كان في الورثة صغار او غائب (شامی ج۱ ص۶۴۲)

حضرت جریرؓ کی روایت کراہت پر دلالت کرتی ہے خصوصاً جبکہ وارثوں میں چھوٹے بچے یا کوئی وارث غائب ہو۔

اور ملا علی بن قاری لکھتے ہیں کہ:

بل صح عن جريرؓ كنا نعده من النياحة وهو ظاهر في التحريم قال الغزالي ويكره الاكل منه قلت هذا اذا لم يكن من مال اليتيم او الغائب والا فهو حرام بلا خلاف (مرقات شرح مشکوٰۃ ج۲ ص۴۸۲)

بلکہ حضرت جریرؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ میت کے اہل کے ہاں کھانے کو حضرات صحابہ کرامؓ نوحہ میں شمار کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کھانا حرام ہے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ ایسا کھانا مکروہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کراہت اس وقت ہوگی جبکہ میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا غائب نہ ہو ورنہ یہ بلا اختلاف حرام ہوگا۔

ان عبارات سے یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ میت کے وارثوں میں اگر سب کے سب بالغ اور حاضر ہوں تب بھی ایسا کھانا مکروہ ہے بلکہ بظاہر حرام ہے۔ اور اگر میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا کوئی وارث

نا تب ہو تو بالاتفاق ایسا کھانا حرام ہوگا اور فقرا کے لئے بھی ایسا کھانا ناجائز ہوگا۔

خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں:

"غالباً ورثہ میں کوئی یتیم یا اور بچہ نابالغ ہوتا یا بعض ورثا موجود نہیں ہوتے، نہ اُن سے اس کا اذن لیا جاتا، جب تو یہ امر سخت حرام شدید پر متضمن ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔ بے شک جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں بلاشبہ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور قریب ہے کہ جہنم کے گہراؤ میں جائیں گے۔ مال غیر میں بے اذن غیر تصرف خود ناجائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم خصوصاً نابالغ کا مال ضائع کرنا جس کا اختیار نہ خود اُسے، نہ اس کے باپ، نہ اس کے وصی کو۔ لان الولایۃ للنظر لا للضرر علی الخصوص اگر ان میں کوئی یتیم ہو تو آفت سخت تر ہے والعیاذ باللہ رب العالمین۔ ہاں اگر محتاجوں کے دینے کو کھانا پکوائیں تو حرج نہیں بلکہ خوب ہے بشرطیکہ یہ کوئی عاقل بالغ اپنے مال خاص سے کرے یا ترکہ سے کریں تو سب وارث موجود بالغ و نابالغ راضی ہوں (احکام شریعت حصہ سوم ص ۹۳)۔ خان صاحب کی یہ عبارت قابل داد ہے۔ مگر ان کا یہ جملہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ جب نابالغ کو اپنے مال کا بااختیار، خان صاحب خود ہی اختیار نہیں دیتے تو پھر بالغ و نابالغ راضی ہوں کا کیا مطلب ہے؟ نابالغ کی رضا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے تصریح کی ہے:

لا تجوز وصية الصبي اذا لم يكن مراهقا عندنا (قاضی خان ج ۳ ص ۵۸۶) — یعنی نابالغ بچے کی وصیت ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے جبکہ مراہق نہ ہو۔

اور سراجیہ ص ۱۴۳ میں ہے:

وصية الصبي باطلة۔ — نابالغ کی وصیت باطل ہے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں:

جب کوئی آدمی مر جاوے اور کوئی شخص اس کا عزیز و قریب اپنے خاص مال میں سے اس میت کا کھانا کرے۔ اس میں کسی فقیہ و محدث کو کلام نہیں، اور خاص میت کا مال اگر اس کام میں صرف کرنے لگیں تو وہاں

یہ شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں کوئی نابالغ لڑکی یا لڑکا نہ ہو اس لئے کہ ترکہ بعد مرنے مورث کے ملک وارثوں کا ہو جاتا ہے پس اگر وارث بالغ ہیں تو وہ مال خاص ان کا ہو گیا۔ اگر کوئی وارث ان میں غائب نہیں، سب موجود ہیں یا کوئی غائب تھا اور اس نے اجازت دے دی تو اس صورت میں ان کو اختیار ہے جتنا چاہیں میت کے لئے صرف کر دیں اور اگر سب نابالغ ہیں تو ترکہ میت سب ان کی ملک ہو گیا۔ اس کا صرف کر دینا میت کے ایصال ثواب میں جائز نہیں، نہ کپڑا، نہ کھانا، نہ روپیہ نہ پیسہ۔ فقط تجہیز و تکفین میں جو لگے وہی درست ہے اور بس۔ اور اگر بعض وارث نابالغ ہیں تب بھی نابالغوں کا حصہ کل اشیاء ترکہ میں مشترک ہے اس کا صرف کرنا بھی ایصال ثواب کے لئے جائز نہیں الخ۔ (انوار ساطعہ ص۱۲۵)

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"نیز اگر میت کی فاتحہ میت کے ترکہ سے کی ہو تو خیال رہے کہ غائب وارث یا نابالغ کے حصے سے فاتحہ نہ کی جاوے یعنی اولاً مال میت تقسیم ہو جائے، پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصہ سے یہ امور خیر کرے۔ ورنہ یہ کھانا کسی کو بھی جائز نہ ہوگا کہ بغیر مالک کی اجازت یا بچہ کا مال کھانا ناجائز ہے یہ ضرور خیال رہے۔" (جاء الحق ص۲۶۱)

مگر مفتی صاحب بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک فیصدی تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ بھی شاید مشکل ایسا ہو جس میں شرعی طور پر مال ترکہ تقسیم ہو چکنے کے بعد بالغ وارث صرف اپنے حصہ سے یہ صدقہ کرتے ہوں۔ اور کتنے مولوی، حافظ اور پیر ہیں جو تیجہ، ساتواں اور دسواں وغیرہ مجالس میں شریک ہونے سے قبل یہ سوال کر لیتے ہیں کہ اس ترکہ میں کوئی نابالغ یا غائب وارث تو شامل نہیں اور کیا اس کی شرعی تقسیم ہو چکی ہے یا نہیں؟

تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا

قرآن کریم کا پڑھنا ایک بہت عمدہ عبادت ہے اور پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخشا جا سکتا ہے بشرطیکہ ایصال ثواب کے لئے جو قرآن کریم پڑھا گیا ہو اس پر اجرت نہ لی گئی ہو، جو خود اجرت لیتے

طے کی گئی ہو یا طے نہ کی گئی ہو مگر عرف اور معاملات سے یہ معلوم ہو کہ کچھ نہ کچھ اُجرت ضرور ملے گی لان المعروف کالمشروط، اور فقہائے احناف نے اس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ تاج الشریعت محمود بن احمد الحنفیؒ (المتوفی ۶۷۳ھ) شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:

ان القراٰن لا یستحق بالاجرۃ الثواب لا للمیت ولا للقاری (بحوالہ انوار ساطعہ ص ۲۰۱)

کہ جو قرآن کریم اُجرت پر پڑھا جاتا ہے اُس کا ثواب نہ تو میت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔

اور علامہ عینی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

الاٰخذ والمعطی اٰثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قراءۃ الاجزاء بالاجرۃ لایجوز۔

قرآن کریم کی تلاوت پر اُجرت لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، حاصل یہ کہ ہمارے زمانہ میں جو قرآن کریم کے پاروں کا اُجرت کے ساتھ پڑھنا رائج ہو چکا ہے، وہ جائز نہیں ہے۔ (بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۵۱)

اس مسئلہ کی پوری تشریح علامہ شامیؒ نے کی ہے، فلیراجع۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ تلاوتِ قرآن کریم پر اُجرت لینے کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صورتِ اوّل آنکہ ثواب قرآن خواندۂ خود را بعوض مبلغ کذا بدست کسے بفروشد، ایں صورت محض باطل است باجماع اہلِ سنت الیٰ ان قال صورت دوم آنکہ شخصے را برائے ختم نمودن قرآن بفرود یں بگیرد و ثواب آں ختم میت را برسد، ایں صورت نزد حنفیہ جائز نیست و نزد شافعیہ طورے و تفصیلے دارد۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۔)

اور مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ نے حضرات فقہائے کرامؒ کے متعدد حوالوں سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اُجرت لے کر قرآن کریم پڑھنا اور تسبیح و تہلیل کرنا باطل ہے، نہ اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔ (دیکھئے مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۔)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ:

واما قراءۃ القراٰن واھداءھا لہ تطوعا

قرآن کریم کو اُجرت کے بغیر پڑھ کر بطور تبرع کے اس کا ثواب

بغیر أجرة فهذا يصل إليه كما يصل ثواب الصوم والحج ۔ (كتاب الروح ص [illegible])

میت کو بخشتا ہے تو اس کا ثواب اس کو پہنچتا ہے جیسا کہ روزہ اور حج کا ثواب اس کو پہنچتا ہے۔

حضرت ملا علی القاری لکھتے ہیں کہ:

ثم قرأه القرآن وإهداؤه له تطوعا بغير أجرة يصل إليه ۔ (شرح فقہ اکبر ص [illegible] طبع کانپور)

قرآن مجید کا بغیر اُجرت کے محض پڑھ پڑھ کر اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرنا درست ہے۔

علامہ صدر الدین علی بن محمد الاذرعی الدمشقی الحنفی (المتوفی [illegible]) تحریر فرماتے ہیں کہ:

وأما استئجار قوم يقرؤون القرآن ويهدونه للميت فهذا لم يفعله أحد من السلف ولا أمر به أحد من أئمة الدين ولا رخص فيه والاستئجار على نفس التلاوة غير جائز بلا خلاف ۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص [illegible] طبع مصر)

اُجرت پر قرآن کریم کی تلاوت کر کے اس کا ثواب میت کو ہدیہ کرنا تو سلف میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا اور حضرات ائمہ دین میں سے کسی نے اس کا حکم اور اجازت دی ہے۔ نفس تلاوت پر اُجرت ناجائز ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

بجا معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب بریلوی کا حوالہ نقل کر دیا جائے تا کہ اس پر تسلی ہو جائے۔

مسئلہ: ...... بعض لوگ بعد دفن کر دینے میت کے حافظ کو اس کی قبر پر واسطے تلاوت سوم تک یا کچھ کم و بیش بٹھاتے ہیں اور وہ حافظ اپنی اُجرت لیتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کی اُجرت دے کر قبروں پر پڑھوانا چاہیے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: تلاوت قرآن عظیم پر اُجرت لینا دینا حرام ہے اور حرام پر استحقاق عذاب ہوتا ہے، نہ کہ ثواب پہنچے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حافظ کو اتنے دنوں کے لئے معین وقتوں پر کام کاج کے لئے نوکر رکھ لیں پھر اس سے کہیں ایک کام یہ کرو کہ اتنی دیر قبر پر پڑھ آیا کرو یہ جائز ہے۔" (احکام شریعت حصہ اول ص [illegible])

مگر خان صاحب ہی از راہ کرم یہ فرمائیں کہ یہ طریقہ کون کرتا ہے؟ اور کہاں ہوتا ہے؟

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں: "اگر حافظوں کو مزدوری دے کر قرآن پڑھوا دیں یہ البتہ مکروہ ہے۔ اس کی تصریح کتب فقہ میں موجود ہے الخ۔ (انوار ساطعہ ص [illegible]) ۔ جوہرہ نیرہ ج ۱ ص [illegible] میں ہے

"لا یجوز هو المختار" یہ جائز نہیں ہے یہی مختار ہے۔ یہاں شریعت مطہرہ میں ہے بسوم جو کہ قرآن کی اجرت پر قرآن پڑھوانا ناجائز ہے۔ دینے والا لینے والا دونوں گنہگار اور اسی طرح صفحہ ۱۷۲ میں ہے میت کے گھر والے تیجہ وغیرہ کے دن دعوت کریں تو ناجائز و بدعت قبیحہ ہے الخ۔ رسالہ رضوان ۲۳ بابت ماہ اگست و ستمبر ۱۹۵۰ء میں ہے میت کے گھر کا کھانا ناجائز و ممنوع ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی صاحبؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

"پس جو کچھ تلاوت کو دیا جاتا ہے وہ اجرت ان کے پڑھنے کی ہے، اور جو پڑھانے کی اجرت پر بھی ہے اس کا ثواب نہ پڑھنے والے کو ہوتا ہے اور نہ مردہ کو۔ لہٰذا یہ فعل ان کا باطل اور لینا دینا دونوں حرام ہے بسبب ثواب کا نہیں بلکہ گناہ ہے۔ غرضیکہ اس کا ثواب نہیں ہوتا ہے اور دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا ترک بھی واجب ہے۔ اگر بوجہ اللہ ثواب پہنچانا منظور ہے تو ہر شخص اپنے مکان پر پڑھ کر ثواب پہنچا دے اور تیسرے دن کا کہیں اجتماع کیا جائے۔ نفس ایصال ثواب کو کوئی منع نہیں کرتا اگر باحقیقی ہو۔ مگر ان قیود و خصوصیات کے ساتھ بدعت بھی ہے اور ثواب بھی نہیں پہنچتا۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص [illegible])

الغرض اس مسئلہ پر خان صاحب بریلوی اور مولانا گنگوہی صاحبؒ دونوں متفق ہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اس پر اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور ثواب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس پر استحقاق عذاب ہے۔ اب جو لوگ اس مسئلہ میں علماء دیوبند کو کوستے ہیں، تو ان کو بتلانا چاہیے کہ طعن کس پر ہوگا؟ ؎

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر   اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

نوٹ ضروری | قرآن کریم کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے معاوضہ میں اجرت اور تنخواہ لینا نیز مؤذن، امام و خطیب اور قاضی کے لئے اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے۔ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اپنے دور میں ان حضرات کو وظیفے اور تنخواہیں دیں۔ اگر یہ کارروائی ناجائز ہوتی تو یقیناً حضرات خلفاء راشدینؓ اس کا کبھی بھی ارتکاب نہ کرتے۔ اور حضرات خلفاء راشدینؓ کا عمل اور سنت بفحوائے حدیث علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین (الحدیث) امت کے لئے مشعل راہ ہے جس سے ان کو کوئی مخلص نہیں ہے۔ امام ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی الحنبلیؒ (المتوفی ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان عمرؓ بن الخطاب و عثمانؓ بن عفان کانا   حضرت عمرؓ بن الخطاب اور عثمانؓ بن عفان مؤذنوں

یرزقان المؤذنین والائمة والمعلمین۔ — اذانوں اور معلموں کو وظائف اور تنخواہیں دیا کرتے تھے۔ (سیرت العمرین لابن جوزیؒ ص ۱۵۰)

امام جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزیلعی الحنفیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ معلمین کو وظیفہ دیا کرتے تھے (نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۳۷)۔ حضرت ائمہ کرام کے وظائف کے متعلق علامہ ابن جوزیؒ نے تفصیلات نقل کی ہیں اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ کس فقیہ کو کس شہر میں تعلیم و تدریس پر مامور کیا گیا تھا (سیرت العمرین ص ۱۲۵)۔ اور نظام الحکم والاقلیم ج ۲ ص ۵۸ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قضاۃ (یعنی شرعی طور پر جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والے قاضیوں اور ججوں) کے لئے بھی وظائف اور تنخواہیں مقرر کی تھیں اور کتاب الخراج قاضی ابی یوسفؒ میں اس کی مزید تشریح موجود ہے اسی میں ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ (المتوفی ۲۲۴ھ) رقمطراز ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عماله ان اعط الناس علی تعلم القرآن (کتاب الاموال ص ۱۸۰) — حضرت عمرؓ نے اپنے بعض گورنروں کو لکھا کہ قرآن کریم پڑھنے والوں کا وظیفہ مقرر کرو۔

اس پر بعض عمال نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن کریم سیکھنے کی رغبت اور شوق کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے مگر حضرت عمرؓ نے اس کے باوجود ان لوگوں کا وظیفہ بند نہیں کیا۔

اور علامہ زیلعیؒ با حوالہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عماله ان اعط الناس علی تعلیم القرآن (نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۳۷) — حضرت عمرؓ نے اپنے بعض حاکموں کو لکھا کہ جو لوگ قرآن کریم کی تعلیم دیتے اور پڑھاتے ہیں ان کو وظیفہ دو۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت یزید بن ابی مالکؒ اور حضرت حارث بن یمجد اشعریؒ کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین اور فقہ سکھائیں اور ان کے لئے روزینہ مقرر کیا۔ یزید بن ابی مالکؒ نے تو قبول کر لیا مگر حارثؒ نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا (کتاب الاموال ص ۲۶۱) بظاہر ان کی مالی حالت اچھی اور مضبوط تھی اس لئے انہوں نے بلا معاوضہ ہی یہ خدمت انجام دی جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بیت المال سے وظائف لیا کرتے تھے لیکن حضرت عثمانؓ چونکہ کافی مالدار اور غنی تھے اس لئے انہوں نے

زمانۂ خلافت میں اپنی ضروریات کا بیت المال پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔

قاضی ابوبکر محمدؒ بن عبداللہؒ ابن العربی المالکیؒ (المتوفی ۵۴۳ھ) اس مسئلہ پر بحث اور اختلاف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اذان، نماز، قضا اور تمام اعمال دینیہ پر اجرت لینا جائز ہے، کیونکہ امیر المؤمنین اور خلیفہ ان تمام امور پر اجرت لیتا ہے (بحوالہ نیل الاوطار ج ۸ ص ۱۷ و تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۹۲)۔ حضرت امام نوویؒ الشافعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو سعید الخدریؓ (الحدیث) میں تصریح ہے کہ رقیہ، دم اور جھاڑ پھونک پر سورۂ فاتحہ اور ذکر پڑھ کر اجرت لینا جائز ہے اور یہ بالکل حلال ہے اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اور اسی طرح تعلیم قرآن کریم پر بھی اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہی حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ، حضرت امام اسحاقؒ، حضرت امام ابو ثورؒ اور دیگر حضرات سلف صالحینؒ اور ان کے بعد آنے والے حضرات کا مسلک ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ نے تعلیم قرآن کریم پر اجرت لینا منع کیا ہے البتہ رقیہ پر اجرت لینے کے جواز کے وہ بھی قائل ہیں (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۲۴)۔

ان تمام نصوص اور حوالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امام مسجد، مؤذن، قرآن کریم کی تعلیم دینے والا معلم، قاری، مفتی اور دین کی تعلیم دینے والا مدرس اور اسی طرح فصل خصومات کرنے والا قاضی وغیرہ اجرت اور تنخواہ لے سکتے ہیں اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ جیسے حضرات خلفاء راشدینؓ کی طرف سے یہ وظائف اور تنخواہیں ان کے لئے مقرر کی گئی تھیں اور اسلامی مملکت میں بیت المال اس بوجھ کا متحمل تھا۔ جہاں بیت المال نہ ہو (جیسا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس پر فتن دور میں نہیں ہے) تو وہاں اہل اسلام پر لازم ہے کہ وہ یہ بوجھ اٹھائیں تاکہ تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہے اور اس طریقہ سے دین کا احیاء ہوتا رہے ورنہ ناموافق ہواؤں میں دین کا یہ چراغ بجھ جائے گا۔ خدا تعالیٰ اس کو روشن رکھے اور بجھنے نہ دے بے دینی کی آندھیاں تو ہر طرف سے اٹھ رہی ہیں ؎

ہواؤں کا رخ بتا رہا ہے ضرور طوفان آ رہا ہے
نگاہ رکھنا سفینہ والو اٹھی ہیں موجیں کدھر سے پہلے

مسئلہ اجرت اور حضرت امام ابو حنیفہؒ حضرت امام نوویؒ کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے اور دیگر بہت سے حضرات فقہاء کرام مثلاً امام الائمہ حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) سے تعلیم قرآن کریم پر اجرت

لینا مکروہ اور ممنوع نقل کیا ہے۔ انہوں نے کمال ورع اور تقویٰ کی بنا پر ان دینی امور پر اجرت لینا منع کیا ہو یہ مال دار اور غنی لوگ ہوں گے تھے انہوں نے اجرت لینا مکروہ کہا ہو یا اس لئے کہ ان دینی کاموں پر اجرت لینے کو مقصود بالذات سمجھ کر دنیا بٹورنے کا ذریعہ ہی نہ بنا لیا جائے؛ اور یا اس لئے کہ خیر القرون میں نادار اور مفلس خدام دین کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے ملتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو الگ اجرت اور تنخواہ لینا مکروہ کہا۔ الغرض حضرت امام صاحبؒ کے اس فتویٰ کی بنیاد کئی امور پر ہو سکتی ہے اور انہی کے فتویٰ پر صاد کرتے ہوئے حضرات متقدمین فقہاء احناف نے اس اجرت کو مکروہ فرمایا۔ لیکن جب بیت المال کا انتظام درہم برہم ہو گیا تو حضرات فقہاء احناف میں متاخرین حضرات کو زمانہ کی اہم ضرورت کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اور پھر انہوں نے متفقہ طور پر جواز کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ امام قاضی خان الحنفیؒ فرماتے ہیں کہ:

انما كره المتقدمون الاستئجار لتعليم القرآن وكرهوا اخذ الاجر على ذلك لانه كان للمعلمين عطيات في بيت المال في ذلك الزمان وكان لهم زيادة رغبة في امر الدين واقامة الحسبة وفي زماننا انقطعت عطياتهم وانتقصت رغائب الناس في امر الآخرة فلو اشتغلوا بالتعليم مع الحاجة الى مصالح المعاش لاختل معاشهم فقلنا بصحة الاجارة ووجوب الاجرة للمعلم بحيث لو امتنع الوالد عن اعطاء الاجر حبس فيه اھ

(فتاویٰ قاضی خان ج ۳ ص [illegible] طبع نولکشور)

بلا شبہ حضرات متقدمینؒ نے تعلیم قرآن کریم پر کسی کو اجرت دے کر خدمت لینا مکروہ کہا ہے اور اس پر اجرت لینا بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں معلمین کے لئے بیت المال میں عطیات مقرر ہوتے تھے نیز امور دین اور شرعی نظم کا کام کرنے میں ان حضرات کی رغبت زیادہ تھی اور ہمارے زمانہ میں عطیات بھی منقطع ہو چکے ہیں اور آخرت کے بارہ میں لوگوں کی رغبتیں بھی کم ہو چکی ہیں۔ سو اگر ایسے لوگ تعلیم کا شغل جاری رکھتے ہوئے معاش کے حصول میں مصروف ہوتے تو ان کی روزی میں خلل پڑ جائے گا۔ اس لئے ہم نے یہ کہا کہ اجارہ صحیح ہے اور معلم کے لئے اجرت واجب ہے اب اگر تعلیم پانے والے شاگرد کا والد (اور موجودہ اصطلاح میں مدرسہ اور ادارہ کا منتظم) معلم کو تنخواہ دینے سے گریز کرے تو اسے گرفتار کیا جائے گا۔

حضرات فقہاء احناف میں فقیہ النفس ہونے کی جو شہرت امام قاضی خانؒ کو حاصل ہے وہ اہل علم

حضرات سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ ابن نجیم الحنفیؒ (الملقب بابی حنیفۃ الثانی) فرماتے ہیں:

والمعنی المختار للفتوی فی زماننا فیجوز اخذ الاجر — بہرحال ہمارے زمانہ میں فتویٰ کے لئے مختار قول یہ ہے کہ

للامام والمؤذن والمعلم والمفتی (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۲) — امام اور مؤذن اور معلم اور مفتی کو اجرت لینا جائز ہے۔

اور صاحب ہدایہ بھی یہی تصریح فرماتے ہیں کہ اب فتویٰ جواز پر ہے (ہدایہ ج ۳ ص [illegible])۔ اور اسی طرح

علامہ بدر الدین العینی الحنفیؒ صراحت فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص [illegible])۔

حضرات فقہاء کرام کی ان واضح تصریحات کے بعد مطلق حاجت اور ضرورت نہیں کہ ہم اجرت لینے کی ممانعت کے دلائل کا تذکرہ کرکے پھر ان کے تفصیلی جوابات عرض کریں۔ صرف اجمالی طور پر یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ جن بعض آیات اور احادیث سے عدم جواز اجرت بر تعلیم قرآن کریم پر استدلال کیا گیا ہے وہ ممانعت میں نص اور متعین بالمعنی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو محال تھا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ اور حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور جمہور علماء کرامؒ اور متاخرین حضرات فقہاء احنافؒ اس کے خلاف فتویٰ صادر کرتے کیونکہ قرآن کریم کی وہ آیات اور احادیث ان کے پیش نظر بھی تھیں اور احادیث اس سلسلہ کی اکثر و بیشتر ضعیف ہیں۔ اور اگر بعض صحیح ہیں تو حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ نے ان کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو سنن الکبریٰ ج ۶ ص ۱۲۶ وغیرہ)

فائدہ: کسی بیمار اور مصیبت زدہ وغیرہ پر قرآن کریم پڑھ کر یا تعویذ لکھ کر اجرت لینا جائز ہے۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۴ وغیرہ کی یہ روایت ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ (او کما قال کہ زیادہ مناسب وہ چیز جس پر تم اجرت لو کتاب اللہ ہے) اس کی دلیل ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس سے رقیہ اور جھاڑ پھونک وغیرہ پر اجرت لینا مراد ہے، ایصال ثواب پر اجرت لینا مراد نہیں ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

المراد الرقیۃ لا التلاوۃ (فتاویٰ ج ۲ ص [illegible])۔ — اس سے مراد جھاڑ پھونک ہے تلاوت نہیں ہے۔

علامہ عزیزیؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ جھاڑ پھونک پر قرآن کریم کی تلاوت پر اجرت لینا جائز ہے۔

(السراج المنیر ج ۱ ص [illegible])

ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین

میت کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور صدقہ و خیرات دینا اور بلا اُجرت کے قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا، اسی طرح نفلی نماز و روزہ اور حج وغیرہ سے میت کو ثواب پہنچانا جائز اور صحیح ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کیلئے شریعتِ مقدسہ نے دنوں اور تاریخوں کی کوئی تعیین و تخصیص نہیں کی ہے۔ اور پہلے با حوالہ گذر چکا ہے کہ اپنی طرف سے ایسی تعیین کرنا بدعت ہے۔ دلائل یا نصوص میں سے کوئی دلیل اس پر دال نہیں ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ضروری ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسم مسلمانوں نے اہلِ ہنود سے لی ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ علامہ بیرونی (المتوفی ۴۴۰ھ) لکھتے ہیں کہ اہلِ ہنود کے نزدیک جو حقوق میت کے وارث پر عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ضیافت کرنا اور یومِ وفات سے گیارھویں اور پندرھویں روز کھانا کھلانا، اس میں ہر ماہ کی چھٹی تاریخ کو فضیلت ہے۔ اسی طرح اختتامِ سال پر بھی کھانا کھلانا ضروری ہے۔ نوروز تک اپنے گھر کے سامنے طعام پختہ و کوزۂ آب رکھیں ورنہ میت کی روح ناراض ہوگی اور بھوک و پیاس کی حالت میں گھر کے ارد گرد پھرتی رہے گی۔ پھر چوتھی دسویں دن میت کے نام پر بہت سا کھانا تیار کرکے دیا جاتا ہے اور ایک خشک دیا جاتا تھا اسی طرح گیارھویں تاریخ کو بھی۔ نیز لکھا ہے کہ ماہ پوس میں وہ حلوا پکا کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ برہمن کے کھانے پینے کے برتن بالکل علیحدہ ہوں (کتاب الہند ص ۲۸۲ و ۲۸۳ مفصلاً) اور یہی کچھ یہاں کے تمام مسلمان کرتے ہیں کہ حلوا اور پانی بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور ملاجی کے برتن بھی الگ ہوتے ہیں اور دنوں کی تعیین بھی کی جاتی ہے خصوصاً دسویں گیارھویں اور اختتامِ سال کے بعد سالانہ عرس۔ مشہور نومسلم عالم (جو پہلے پنڈت تھے) مولانا عبیداللہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہندو برہمن کے مرنے کے بعد گیارھواں دن اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرھواں دن اور ویش یعنی بنیئے وغیرہ کے مرنے کے بعد پندرھواں یا سولھواں دن اور شودر یعنی بالمیکی وغیرہ کے مرنے کے بعد تیسواں یا اکتیسواں دن مقرر ہے۔ ازاں جملہ ایک چھماہی کا دن ہے یعنی مرنے کے بعد چھ مہینے۔ ازاں جملہ برسی کا دن ہے اور ایک دن گائے کو بھی کھلاتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک دن سدھ کا ہے مُردے کے مرجانے سے چار برس

پیٹتے ہیں، ازاں جملہ رسوم کے جیسے کہ نعمت قول میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچاتے ہیں لیکن جس تاریخ میں کوئی مرا ہو اس تاریخ میں ثواب پہنچانا ضروری جانتے ہیں اور کھانے کے ثواب پہنچانے کا نام سرادھ ہے، اور جب سرادھ کا کھانا تیار ہو جاتا ہے تو اول اس پر پنڈت کو بلوا کر کچھ بید پڑھواتے ہیں، جو پنڈت اس کھانے پر بید پڑھتا ہے وہ ان کی زبان میں ابھشرمن کہلاتا ہے، اور اسی طرح اور بھی دان مقرر ہیں۔ (بلفظہ تحفۃ الہند ص۱۹)۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (المتوفی ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خاص یہ رسم سیوم کی ہے۔ اور کسی ولایت میں کوئی جانتا بھی نہیں سو یہ ہنود کے تیجہ کو دیکھ کر وضع ہوا ہے (البراہین القاطعہ ص۱۲۲) اور یہی کچھ کلمہ گو مسلمان کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پنڈت کی جگہ ختمی ملا نے لی ہے اور کھانے پر بید کی جگہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ ان تمام غیر اسلامی رسموں نے اسلامی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس پر تنقید کرنا گویا اسلام پر تنقید کرنا ہے اور یہ سب کچھ ہندوستان میں آ کر ہوا

فواسفا! ع وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں

میت کے گھر اجتماع اور کھانا پکنے کا بیان

حدیث اور فقہ کی عبارات اس پر شاہد ہیں کہ جب کسی کی وفات ہو جاتی تو اس کے گھر والے چونکہ صدمہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اہل محلہ اور رشتہ دار اہل میت کا کھانا تیار کریں اور جو نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکا ہو وہ تعزیت بھی کر سکتا ہے لیکن میت کے گھر اجتماع اور اہل میت کا لوگوں کیلئے کھانا تیار کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے اور بہت سے علاقے اس قبیح حرکت کا شکار ہو کر مقروض ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات سود پر قرض لیا جاتا ہے اور اس طرح وارثوں کا اور خصوصاً یتیموں کا مال برباد کیا جاتا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ (المتوفی ۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ

كنا نرى الاجتماع الى اهل الميت وصنعة الطعام من النياحة (ابن ماجہ ص۱۱۶ و مسند احمد ج۲ ص۲۰۴) — ہم (یعنی حضرات صحابہ کرام) میت کے گھر جمع ہونے کو اور میت کے گھر کھانا تیار کرنے کو نوحہ سمجھتے تھے۔

اور منتقی الاخبار ص۲۲ میں وصنعة الطعام بعد دفنه من النیاحة کے الفاظ آئے ہیں۔

مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ میت پر آواز کے ساتھ رونا، بین اور نوحہ کرنا اہلِ جاہلیت کا کام ہے اور نوحہ کرنا جمہور سلف وخلف کے نزدیک حرام ہے۔ اسی طرح میت کے گھر کا کھانا بھی گنا جاتا ہے۔ یہ روایت دو طرق سے مروی ہے۔ علامہ ہیثمیؒ ایک سند کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے اور دوسری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۲۳) حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (فتح القدیر ج ۱ ص۴۷۳)۔ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں: باسنادِ صحیح (کبیری ص۵۶۳)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے گھر اجتماع کرنا اور وہاں کھانا تناول کرنا حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک نوحہ جیسا ایک جرم تھا اور اس پر ان کا اجماع واتفاق رہا ہے۔ ضرورت تو نہیں مگر حضرات فقہاء کرامؒ کی صاف بات بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ یہ مسئلہ بھی پوری طرح سامنے آجائے۔

علامہ ابن امیر الحاج المالکیؒ (المتوفی ۷۳۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

اما اصلاح اهل المیت طعاما وجمع الناس فلم ينقل فيه شيء وهو بدعة غير مستحب (مدخل ج ۳ ص ۲۷۶)

اہلِ میت کا کھانا تیار کرنا اور لوگوں کا جمع ہونا اس میں کوئی چیز منقول نہیں ہے بلکہ یہ بدعت غیر مستحب ہے۔

نیز لکھتے ہیں کہ:

مما احدثه بعضهم من فعل الثالث للمیت وعملهم الاطعمة فيه حتى صار عندهم كانه امر معمول به (مدخل ج ۳ ص ۲۷۸)

بعض لوگوں نے یہ بدعت نکالی ہے کہ میت کے تیجہ پر طعام تیار کرتے ہیں، اور یہ ان کے نزدیک معمول کا کام بن گیا ہے۔

امام ابن حجر مکیؒ شافعیؒ سے سوال کیا گیا کہ:

عما يفعل يوم ثالث من موته من تهيئة اكل واطعامه للفقراء وغيرهم وعما يعمل يوم السابع الخ

میت کے تیسرے دن فقراء وغیرہ کیلئے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اور اسی طرح ساتویں دن، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

۱؎ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نوحہ کی حرمت پر اجماع ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۰۴)

جمیع ما یفعل مما ذکر فی السؤال من البدع المذمومۃ (فتاوی کبری ج ۲ ص ۳۰۷)

سوال میں جتنی چیزیں ذکر کی گئی ہیں وہ سب کی سب بدعات مذمومہ ہیں۔

علامہ محمد بن محمد المنبجی حنبلیؒ (المتوفی ۷۸۵ھ) تسلیۃ اہل المصائب ص ۱۹۳ میں، اور امام شمس الدین بن قدامہ حنبلیؒ (المتوفی ۶۸۲ھ) شرح مقنع کبیر ج ۲ ص ۴۲۶ میں) اور امام موفق الدین بن قدامہ حنبلیؒ (المتوفی ۶۲۰ھ) لکھتے ہیں، واللفظ لہ:

فاما صنع اهل الميت طعاما للناس فمكروه لان فيه زيادة على مصيبتهم وشغلا لهم الى شغلهم وتشبها بصنع اهل الجاهلية (مغنی ج ۲ ص ۴۱۳)

کہ اہل میت جو لوگوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں وہ مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل میت کو مزید تکلیف اور شغل میں مبتلا کرنا ہے نیز اس سے مشرکین اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں کہ:

مذهبنا ومذهب غيرنا كالشافعية والحنابلة الخ (ج ۱ ص ۶۶۳)

ہمارا اور حضرات شوافعؒ اور حضرات حنابلہؒ کا بھی مذہب ہے۔

چونکہ ہمیں ایک ایسے طبقہ سے واسطہ پڑ گیا ہے جو خود کو حنفی کہلاتا ہے اس لئے ہم فقہ حنفی کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کو مسلم حضرات فقہاء احناف کے نظریہ کو سامنے رکھ کر غور و فکر کا موقع مل سکے۔

فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم کے نزدیک میت کے گھر سے طعام کھانا، تیجہ، ساتواں، اور چالیسواں وغیرہ کرنا۔

جس طرح دوسرے مسالک کے حضرات فقہاء کرامؒ نے ان بدعات کا انکار کیا ہے اسی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر حضرات فقہاء احنافؒ نے ان کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر بن احمد الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا يباح اتخاذ الضيافة عند ثلاثة ايام لان الضيافة تتخذ عند السرور (خلاصۃ الفتاوی ج ۲ ص ۳۴۲)

کہ اہل میت کی طرف سے تین دن تک ضیافت مباح نہیں ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔

صوبہ سرحد اور اسی طرح بعض دیگر علاقوں میں یہ بدعت رائج ہے کہ میت کو دفن کر چکنے کے بعد [illegible]

نامناسب گانوں کی بلا احتیاط معقول چلائی جاتی ہے۔ جس کو وہ لوگ اپنی زبان میں تماشائی بشومر اللہ شتی
وغیرہ کہتے ہیں۔ اس میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولیوں کی پہلو
گی اور کھانے سے تواضع کی جاتی ہے۔ اس عبارت میں بھی کھانے کو منکرات اقبیحہ کا شمار غیر مباح بھی
کہا ہے اور مکروہ و بدعت مستقبحہ بھی۔ صد افسوس ہے کہ بڑے بڑے علماء یہاں مولوی بھی اس قبیح ترین
بدعت میں مبتلا ہیں۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا ومن جمیع البدعات۔

امام قاضی خانؒ لکھتے ہیں:

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ایام المصیبۃ لانھا ایام تاسف فلا یلیق بھا ما کان للسرور (قاضی خان ج[illegible] ص[illegible])

یعنی مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا مکروہ ہے کیونکہ جو کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت فتاویٰ سراجیہ ص[illegible] میں ہے۔

حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اھل المیت لانہ شرع فی السرور لا فی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ (فتح القدیر ج[illegible] ص[illegible])

میت کے گھر کھانا تیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ طعام کرنا تو خوشی کے موقع پر مناسب ہے نہ کہ غمی میں اور یہ نہایت ہی بری اور قبیح بدعت ہے۔

اور علامہ قہستانیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ھذہ الایام وکذا اکلھا کما فی خیرۃ الفتاویٰ (جامع الرموز ج[illegible] ص[illegible])

ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا اور کھانا مکروہ ہیں جیسا کہ خیرۃ الفتاویٰ میں مذکور ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثۃ ایام کذا فی التاتارخانیہ۔ (عالمگیری ج[illegible] ص[illegible])

تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ایسا ہی فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے۔

اور امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ ثلاثۃ ایام واکلھا

تین دن تک ضیافت مکروہ ہے اور اسی طرح اس کا کھانا

غير مشروعة للشريعة ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع والاعياد ونقل الطعام الى القبر في المواسم واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورة الانعام او الاخلاص فالحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاكل يكره - (فتاوی بزازیہ ج ۴ ص ۸۱ طبع مصر)

یعنی کیونکہ ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور پہلے دوسرے اور تیسرے دن طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے اور اسی طرح ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقعہ پر بھی اور کھانا موسم بموسم قبروں کی طرف لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرأت قرآن کے لئے اور صلحاء اور قراء کو جمع کر کے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے و علی ہذا القیاس سورۃ انعام یا سورۃ اخلاص کی قرأت کے لئے طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے حاصل یہ ہے کہ قرأت قرآن کے وقت کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

اسی مضمون کی عبارت شامی (ج ۱ ص ۶۶۵ طبع مصر) میں بھی ہے اور علامہ علی متقیؒ کا یہ حوالہ کہ ان هذا الاجتماع في اليوم الثالث خصوصاً ليس فيه فرضية الخ پہلے نقل ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو ص [illegible]

امام نوویؒ شرح منہاج میں لکھتے ہیں کہ:

الاجتماع على المقبرة في اليوم الثالث وتقسيم الورد والعود والطعام في الايام المخصوصة كالثالث والخامس والتاسع والعاشر والعشرين والاربعين والشهر السادس والسنة بدعة ممنوعة (بحوالہ انوار ساطعہ ص ۱۴۵)

قبر پر تیسرے دن اجتماع کرنا اور گلاب اور اگر کی بتیاں تقسیم کرنا اور مخصوص دنوں کے اندر روٹی کھلانا، مثلاً تیجہ، پانچواں، نواں، دسواں، بیسواں اور چالیسواں دن اور چھٹا مہینہ اور سال کے بعد، یہ سب امور بدعت ممنوعہ ہیں۔

حضرت ملا علی القاریؒ حضرت عاصمؒ بن کلیب کی روایت کو نقل کرتے وقت یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

قرر اصحاب مذهبنا من انه يكره اتخاذ الطعام في اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع - (مرقات ج ۵ ص ۴۸۲)

ہمارے مذہب (حنفی) کے حضرات فقہاء کرام نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن طعام اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

ان عبارات میں اس امر کی پوری صراحت موجود ہے کہ میت کی وجہ سے دنوں کی تخصیص کرکے کھانا پکانا (اور خصوصاً تیسرے، دسویں اور چالیسویں وغیرہ دنوں میں) بدعت اور مکروہ ہے اور ایسے کھانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا گنگوہیؒ لکھتے ہیں :

"شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ در جامع البرکات سے نویسد و آنکہ بعد سالے یا ششماہی یا چہلم یا سہ روزہ دریں دیار پزند و درمیان برادران تقسیم کنند و آن را بھاجی میگویند چیزے از اصل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نخورند۔ انتہی (مجموعہ فتاویٰ ج ۲ ص ۶۸)۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

"و عادت بود کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند بر سر گور و نہ غیر آن و ایں مجموع بدعت است لکم برائے تعزیت اہل میت و جمع تسلیہ و صبر فرمودن ایشان را سنت و مستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم و ارتکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است و حرام است۔ (مدارج النبوت ج ۱ ص ۲۳۲ طبع نولکشور)

شیخ صاحب موصوف نے شرح سفر السعادت ص ۲۶۷ اور اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۷۱۶ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ اور شیخ الاسلام مرکشف الغطاء میں لکھتے ہیں کہ :

"آنچہ متعارف شدہ از پختن اہل مصیبت طعام را در سوم و قسمت نمودن آں میان اہل تعزیت و اقران غیر مباح و نامشروع است و تصریح کردہ بدان در خزانہ چہ شرعیت ضیافت وقت سرور است و نہ وقت شرور۔"

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ لکھتے ہیں کہ :

"بعد مردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم و چہلم و ششماہی و برسی ہیچ نکنند۔" (وصیت نامہ ملحق مالابد منہ)

اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب نقشبندیؒ (المتوفی ۱۰۷۹ھ) لکھتے ہیں کہ :

(۔۔۔ و بعض ۔۔۔) آنکہ طعام برائے میت بروز سوم و دہم و گل دادن روز سوم از کجا ست ؟ طعام دادن بدون قید ایام بے رسم و ریا و ثواب آں بارواح رسانیدن بسیار خوب است و عبادت بزرگ است

تعیین وقت اصل معتقد علیہ ظاہر نمی شود و روز سوم گل را نمی برداں بدعت است۔ (مکتوبات مکتوب ۱۱)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"دیگر از عادات شنیعہ مامردم اسراف است در ماتمہا و سیوم و چہلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و ایں ہمہ را در عرب اوّل وجود نبود مصلحت آں است کہ غیر تعزیت وارثان میت تا سہ روز و اطعام شاں یک شب و روز رسمے نباشد۔" (تفہیمات ج ۲ صفحہ ۲۳۳ و وصیت نامہ صفحہ ۱۳)

اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (المتوفی ۷۸۵ھ) کے ملفوظات میں ہے کہ:

"اس زمانہ میں سیوم کے روز میت کی زیارت کے واسطے شربت و دیگ و میوہ سلے جاتے ہیں اور کھاتے ہیں ---- اور فرمایا کہ صندوق لے جاتے ہیں اور سیپارہ خوانی کرتے ہیں یہ مکروہ ہے" (الدر المنظوم صفحہ ۶۰۹)

اور علامہ محی الدین برکلی نقشبندی الحنفیؒ (المتوفی ۹۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"ان بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ موت کے دن یا اس کے بعد ضیافت طعام کی وصیت کرنا اور قرآن و کلمہ پڑھنے والوں کو پیسے دینا یا قبر پر چالیس روز تک یا کم و بیش ایام تک کوئی بٹھانا یا قبر پر قبہ بنانے کی وصیت کرنا یہ سب اس مکروہ ہیں"۔ (طریقہ محمدی صفحہ آخری)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ مرید خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی چشتیؒ (المتوفی فی حدود ۸۰۰ھ) قبر کی زیارت کے لئے بھی از خود دنوں کی تعیین (مثلاً تیسرے یا ساتویں روز) کو بدعت شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سیداں زیارت سنت است لیکن زیارت روز و شب
معہود و تسیوم بنتے والی بدعت لیکن حسد ۔۔۔۔۔۔ (تحفۃ النصائح)

اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

"مقرر کردن روز سوم وغیرہ بالتخصیص و او را ضروری انگاشتن در شریعت محمدیہ ثابت نیست صاحب نصاب الاحتساب (مولانا ضیاء الدین عمر بن محمد بن عوض سنامی الحنفی معاصر حضرت شیخ نظام الدین اولیاء المتوفی ۷۲۵ھ) آں را مکروہ نوشتہ و راہ تخصیص یگانہ ..... ہر روزیکہ خواہند ثواب

بدرجہ عقیدت رسا شدہ۔ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص [illegible])۔

قارئین کرام! آپ نے جماعت احناف رحمہم اللہ تعالیٰ سواد اعظم کے مقتدر حضرات فقہائے کرام اور حضرات صوفیائے عظام کی عبارتیں ملاحظہ کرلی ہیں کہ وہ میت کے گھر کھانا تناول کرنے، سوئم، دسویں، چہلم اور برسی وغیرہ کو بدعت اور مکروہ (بلکہ بعض حرام) کہتے ہیں۔ مگر صد افسوس ہے کہ فریق مخالف کی گنگا ہی الٹی ہے۔ جو حضرات یہ بدعات نہیں کرتے ان کو وہابی وغیرہ کے خطابات سے نوازتے ہیں اور عوام الناس کو ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ فوا اسفا!

لطیفہ: فریق مخالف کے اعلیٰ حضرت نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ ”حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے۔“ (بلفظہ وصایا شریف ص [illegible])

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا دین اور مذہب شریعت اسلامی سے جدا ہے اور اس دین پر جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ شریعت محمدیہ کا اتباع تو حتی الامکان بتایا مگر ان کا مذہب اور دین اپنانا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور بات بھی صحیح ہے کیونکہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے اخلاق تک خان صاحب کا دین و مذہب شریعت اسلامی سے بالکل جدا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، یاد رہے صحبت باقی! لیکن فاتحہ کے سلسلہ میں خان صاحب کے اتباع سے گزارش ہے کہ ان کی وصیت شریفہ پر عمل کر کے ثواب دارین حاصل کریں اور اس گرانی اور مہنگائی میں ان لذیذ چیزوں کا خوب لطف اٹھائیں۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

”اعزہ سے اگر بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ میں ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دودھ کا ہو، مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ خواہ بکری کا، شامی کباب، پراٹھے اور بالائی، فیرنی، اردکی پھریری دال مع ادرک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف۔ اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب

جاتو، مگر بہ تطییب خاطر۔ مرمت کے لئے یہ مجبوری اور نہ ہو۔ انتہی ملتقطاً (وصایا شریف صفحہ ۷)

فریق مخالف کو اعلیٰ حضرت کی اس زرّیں وصیت پر عمل پیرا ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہیے۔
مولوی محمد عمر صاحب نے اپنی کتاب مقیاس حنفیت میں اس مضمون کی مستقل سرخیاں قائم کر کے
امت محمدیہ پر کرم فرمائی کی ہے: فضیلت درود، فضیلت حلوا و شہد، فضیلت گوشت اور پراٹھا
وغیرہ، پھر کیوں عوام الناس اس پر عمل نہ کریں کہ ہم خرما و ہم ثواب۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے
فضیلت جہاد پر کوئی سرخی قائم نہیں کی۔ لیکن یہ کیا بے جہاد کیا کریں گے۔ تحریک ختم نبوت میں ان کی
اکثریت عالم اسلمین کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ یہ صرف کھانے پینے کے مجاہد اور شیر ہیں جہاد اور
حق گوئی سے ان کی کیا نسبت! ؎

تجھے طعام سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — طعام خواہ ہے مگر صاحب جہاد نہیں (اقبالؒ)

اگر فریق مخالف خان صاحب کی سابق وصیت پر عمل نہ کر سکے اور مختلف اشیاء تیار کرنے اور کھانا
کرنے سے عاجز ہو تو ان کے دوسرے فتوے پر عمل کرے تاکہ اس کی تلافی ہو جائے اور نہیں تو کم از کم جہیز
دادی کے سوئم پر ہی ایسا کر لیا کریں تاکہ اس گرانی کے وقت میں دادی کی نانی بھی ساتھ ہی یاد آ جائے۔
خان صاحب لکھتے ہیں "مسئلہ: میت کے سوئم کا کس قدر وزن ہونا چاہئے۔ اگر چھوہارے دن
پر فاتحہ دلا دی جائے تو ان کا کس قدر وزن ہو؟ الجواب: کوئی وزن شرعاً مقرر نہیں، اتنے ہوں کہ جس
میں ستر ہزار عدد پورا ہو جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ انتہی ملتقطاً (عرفان شریعت حصہ اول صفحہ ۳)

اگر شریعت نے وزن مقرر نہیں کیا تو خان صاحب کو عرفان شریعت کا یہ زرّیں نسخہ کہاں سے
حاصل ہوا ہے؟ سچ فرمایا انہوں نے کہ ان کا مذہب و دین ان کی کتابوں سے ظاہر ہوگا اور جس پر قائم
رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اگر فی چھوہارہ ایک تولہ ہو تو ستر ہزار کا وزن اکیس من اور پینتیس سیر
ہوگا اور اگر چھ ماشہ فی چھوہارہ وزن ہو تو ستر ہزار کا وزن دس من اور ساڑھے سینتیس سیر ہوگا اور قابل
استعمال چھوہارہ چھ ماشے سے کیا کم ہوگا؟ اگر چھ روپے سیر بھی چھوہارے ہوں تو دس من اور ۳۸ سیر کی
قیمت تقریباً چوبیس سو روپے سے اوپر ہوگی۔ ایسے دو سوئم تو کیا ایک بھی اس زمانہ میں اچھے خاصے

چودھریوں اور نوابوں کو بھی نانی یاد کرا دے گا اور دادی بھی تو صفت میں یاد آجائیں گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو اعتراضات فریق مخالف کی طرف سے کئے جاتے ہیں ہم ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

فریق مخالف کا پہلا اعتراض فریق مخالف کا کہنا ہے کہ میت کے گھر سے کھانا کھانا مکروہ نہیں ہے کیونکہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۴۴ میں ایک حدیث آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ایک میت کو دفن کیا اور اس سے فارغ ہوئے تو:

استقبلہ داعی امرأتہ (میت کی بیوی کا ایک قاصد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دینے آیا۔) علامہ حلبیؒ (کبیری ص ۶۰۷ اور صغیری ص ۳۰۳ میں) اور ملا علی بن القاریؒ (مرقات ج ۵ ص ۴۸۲ میں) لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ میت کے گھر سے کھانا درست ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز نہ کھاتے۔ (انوار ساطعہ ص ۱۰۹ ملخصاً)۔

الجواب: اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ امرأتہ کا نسخہ صاحب مشکوٰۃ کا وہم یا کسی کاتب کی غلطی ہے۔ اصل الفاظ داعی امرأۃ ہیں کہ کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی۔ باقی داعی امرأتہ (کہ میت کی بیوی کے والی نے دعوت دی) یہ غلط ہے۔ چنانچہ یہی روایت ابوداؤد ج ۲ ص ۱۱۷، مشکل الآثار ج ۲ ص ۳۰۳، معتصر ص ۱۹۹، شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۲۲۳، دار قطنی ج ۲ ص ۵۴۵، مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۳، سنن الکبریٰ ج ۱ ص ۳۳۵، عقود الجواہر المنیفہ ج ۲ ص ۱۱۰، خصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۲۰۱، مستدرک حاکم ج ۴ ص ۲۳۲، محلی ابن حزم ج ۷ ص ۴۱۵، عون المعبود ج ۳ ص ۲۴۴، بذل المجہود ج ۴ ص ۲۴۳ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ان تمام میں امرأۃ ہے کے الف لام نہیں اور یہی صحیح ہے امرأتہ کی ضمیر کے ساتھ جو میت کی طرف راجع ہے، غلط ہے۔[1]

وثانیاً بعض حضرات نے امرأتہ کے الفاظ کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے دیگر جوابات دیئے ہیں

---

[1] مولوی عبدالسمیع صاحب کا اس امرأتہ والی روایت کو مرفوع قرار دے کر حضرت جنیدؒ کی [illegible] کو موقوف کہہ کر اس کو رد کرنا (دیکھئے انوار ساطعہ ص ۱۲۱) فن حدیث سے بالکل بے خبری ہے۔

کسی نے کہا کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور۔ بعض نے رکیک تاویلات کے تحت میت کے مال سے کھانا تناول کرنے کو درست کہا۔ اور فریق مخالف کے اعلیٰ حضرت خاں صاحب بریلوی نے یہ جواب دیا کہ اس عورت نے آپ کو پہلے دعوت دی تھی اور وقت موعود پر تقدیراً اس کا خاوند فوت ہو گیا۔ بنا بریں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہاں کھانا تناول کرنا وفات کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سابق وعدہ کی بنا پر تھا۔ اور خاں صاحب نے ملا علی بن القاریؒ اور علامہ حلبیؒ کی تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے (دیکھئے احکام شریعت حصہ سوم از ص۱۹۵ تا ص۱۹۶) راقم الحروف کے نزدیک پہلا جواب ہی متعین ہے کہ میت کے گھر کھانا تناول ہی نہیں کیا گیا۔ اصل الفاظ ہی لمراتہ ہیں نہ کہ امراتہ۔

اور جن حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے ان کا مدار ہی لفظ امراتہ ہے علاوہ بریں جب حضرت ملا علی بن القاریؒ نے اصل حقیقت کا جائزہ لیا تو اپنی آخری تصنیف میں اس سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے شرح نقایہ ج ۱ ص ۳۴۲ میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ میت کے ہاں کھانا تناول کرنا مکروہ اور بدعت مستقبحہ ہے۔

خاں صاحب بریلوی نے حضرت ملا علی بن القاریؒ اور علامہ حلبیؒ کی عبارات کے مفصل جوابات دینے کے بعد کیا خوب ارشاد فرمایا کہ ”اگر فاضل حلبیؒ اور ملا علی القاریؒ ہمارے دیار کا رسم و رواج دیکھتے تو کسی کی ان دعوتوں پر حرمت قطعی کا حکم لگاتے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اجازت دینے میں شیطان مردود کے لئے ایک دروازہ کھول دینا ہے اور مسلمانوں اور بالخصوص نادار مسلمانوں کو سخت مصیبت میں ڈال دینا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد وآلہ اجمعین۔ (احکام شریعت حصہ سوم ص۱۹۶۔ ملخصاً)۔

دوسرا اعتراض | مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ ان عبارات میں تیجہ، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ اپنے مہمانوں اور رشتہ داروں کی ضیافت کی وجہ سے ہے۔ فقہائے کرامؒ نے تصریح کی ہے کہ اگر فقرا کیلئے کھانا تیار کیا جائے تو اچھا ہے نیز شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کی عبارت میں اسراف کا ذکر ہے اور اسراف کرنے کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی عبارت میں رسوم وغیرہ کی ممانعت ہے کہ عورتیں جمع ہو کر ان ایام میں رونا پیٹنا کرتی ہیں، اصل تیجہ وغیرہ سے ممانعت نہیں ہے (ملخصہ انوار ساطعہ ص۱۱۰ و ص۱۳۱ و ص۱۱۸، جاء الحق ص۲۵۹ و ص۲۶۰)۔

الجواب: بلاشبہ غمی کے ایام میں شدت والوں اور عام لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کیلئے تیجہ وغیرہ کرنا ممنوع اور بدعت ہے اور اسراف کرنا اور عورتوں کا جمع ہو کر نوحہ وغیرہ کرنا بھی گناہ ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ عاقل اور بالغ اور حاضر وارث اگر اپنے مال سے فقراء کے لئے کھانا تیار کریں تو جائز ہے۔ مگر اس نکتہ کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دنوں کی تعیین بھی منع، بدعت اور مکروہ ہے اور مثلاً تیجہ وغیرہ کی تخصیص کرنا بھی اسی بدعت اور مکروہ کی مد میں ہے اور دنوں کی اسی تعیین کو قاضی ثناء اللہ صاحبؒ رسوم وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی عبارت بغور ملاحظہ کیجئے۔ یہ کہنا کہ ان امور میں بدعت اور کراہت تیجہ وغیرہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اور امور کے سبب سے ہے محض سینہ زوری اور نری جہالت ہے۔ حضرات فقہاء کرام دنوں کی تخصیص کو بھی بدعت ہی کہتے ہیں۔ امام نوویؒ، ابن حجرؒ اور صاحب بزازیہؒ وغیرہ کی عبارات میں الیوم الثالث الخ کی اور شیخ عبدالحق دہلویؒ اور صاحب کشف الغطاء اور خواجہ محمد معصومؒ وغیرہ کی عبارتوں میں روز سوم کی خاص طور پر قید موجود ہے۔ پھر کس طرح اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفیؒ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث لا یجعل احدکم للشیطان الخ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

فکیف من اصر علی بدعۃ او منکر انتھی۔ (مرقات ج۲ ص۲۵۳، والتعلیق المحمود ج۱ ص۱۲۹)

پھر کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جو کسی بدعت اور منکر پر اصرار کرتے ہیں۔

مولانا احمد علی سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:

ھذا محل تذکر للذین یصرون علی الاجتماع فی الیوم الثالث للمیت ویرونہ ارجح من الحضور للجمعۃ۔ (حاشیہ ترمذی ج۱ ص۷۲)

یہ حدیث ان لوگوں کیلئے نصیحت حاصل کرنے کا مقام ہے جو میت کے بعد تیسرے دن جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کو جماعت کی نماز کیلئے حاضری پر بھی مقدم سمجھتے ہیں۔

اس عبارت میں نہ تو قبر پر اجتماع کی تخصیص ہے اور نہ عورتوں کے نوحہ کرنے کی۔ بلکہ وفات کے بعد تیسرے دن جو بھی اجتماع ہو، اس کا یہی حکم ہے کہ وہ بدعت بھی ہے اور مکروہ بھی۔ اور یہی حضرات فقہاء

کرام کا دستور ہے اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔

مولوی احمد رضا خان صاحب دوسرے تیسرے اور چالیسویں دن کے اجتماع اور عورتوں کے کھانے پینے اور چھالیا وغیرہ کے اہتمام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اولاً یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ وقبیحہ ہے۔ امام احمد اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں بسند صحیح حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کنا نعد الاجتماع الی اھل المیت وصنعھم الطعام من النیاحۃ - ہم گروہ صحابہ اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مردے کی نیاحت شمار کرتے تھے جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق --- الیٰ ان قال امام بزازی وجیز میں فرماتے ہیں یکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع یعنی میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ہفتہ کے بعد جو کھانے تیار کرائے جاتے ہیں سب مکروہ و ممنوع ہیں (بلفظہ احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۴۱، ۱۴۲)

نیز مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ "شریعت میں ثواب پہنچانا ہے۔ دوسرے دن ہو خواہ تیسرے دن باقی یہ تعیین عرفی ہیں جب چاہیں کریں۔ انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت ہے و بدعت۔ (مجموعہ فتاویٰ قلمی مؤلفہ احمد رضا خان صاحب ج ۲ ص ۲۵۳ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

نیز خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثواب تیسرے دن پہنچتا ہے یا اس دن زیادہ پہنچے گا اور دن کم، تو یہ عقیدہ بھی اس کا غلط ہے (الحجۃ الفائحہ ص ۱۲)

اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ایصال ثواب کا مسئلہ حق ہے مگر ایصال ثواب کے لئے دنوں کی تخصیص اور تعیین ضروری جاننا گو عملاً ہی کیوں نہ ہو، جہالت اور بدعت ہے۔

تیسرا اعتراض: فریق مخالف کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو تیسرے دن حضرت ابوذرؓ نے کھجوریں، دودھ اور جو کی روٹی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے رکھی اور آپ نے ان پر سورۃ فاتحہ اور قل ہو اللہ شریف پڑھ کر دعا فرمائی اور حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو اور فرمایا کہ ان اشیاء کا ثواب میرے لخت جگر ابراہیم کو پہنچے۔ اس روایت سے ایک تو تیجہ کا ثبوت ہوا اور دوسرا کھانا سامنے رکھ کر اس پر ختم کرنے کا ثبوت ہوا۔ فریق مخالف کا بیان ہے

کہ یہ روایت حضرت ملا علی القاریؒ نے کتاب اوزجندی میں تحریر فرمائی ہے۔

الجواب: مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ:

کتاب اوزجندی از تصنیفات ملا علی قاری نیست و نہ روایت مذکور صحیح و معتبر است بلکہ موضوع و باطل بر آں اعتماد نشاید در کتب حدیث نشانے ازیں روایت یافتہ نمے شود۔

(مجموعہ فتاوی ج ۲ ص ۸۶)

کہ نہ تو کتاب اوزجندی حضرت ملا علی القاری کی تصنیفات میں سے ہے اور نہ یہ روایت صحیح اور معتبر ہے بلکہ یہ موضوع اور باطل روایت ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس قسم کی روایت کا کوئی نشان موجود نہیں ہے۔

مفتی احمد یار نعیمی صاحب لکھتے ہیں کہ: انوار ساطعہ ص ۱۴۵ اور حاشیہ خزانۃ الروایات میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا۔ یہ تیجہ، ششماہی اور برسی کی اصل ہے (بحوالہ جاء الحق ص ۲۵۸)۔

مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی موضوع اور جعلی روایات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ حدیث جب پیش ہو تو صحیح سند کے ساتھ ہو، معتبر حضرات محدثین کرام سے اس کی تصحیح ہونی چاہیے۔ محض روایت یا حدیث کا نام لے لینا کفایت نہیں کرتا۔

فائدہ: عوام الناس میں جمعرات کے دن صدقہ و خیرات کرنے کی بھی ایک رسم جاری ہے۔ لیکن اس کی بھی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ خان صاحب بریلوی سے کسی نے یوں سوال کیا کہ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں درخت پر شہید مرد ہیں اور فلاں طاق میں شہید مرد رہتے ہیں۔ اس درخت اور اس طاق کے پاس جا کر جمعرات کو فاتحہ شیرینی اور چاول وغیرہ پر دلاتے ہیں الخ۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

الجواب: یہ سب واہیات و خرافات اور جاہلانہ حماقات و بطالات ہیں۔ ان کا ازالہ لازم ہے۔ ما انزل اللہ بہا من سلطان۔ (بحوالہ احکام شریعت حصہ اول ص ۳۲)۔

کھانا سامنے رکھ کر اس پر ختم دینا

صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کھانے پر بسم اللہ بھی پڑھی ہے اور بطور برکت اور دعا کے مختلف کھانے کی چیزوں پر قرأت بھی کی ہے سو ان چیزوں میں اضافہ کیلئے بھی اشیاء کو سامنے رکھ کر اُن پر دعائیں پڑھی ہیں یہ تمام امور محل نزاع سے خارج ہیں جھگڑا صرف اس امر کا ہے کہ میت کے لئے ایصال ثواب کے طور پر جو کھانا دیا جاتا ہے اُس پر بھی کچھ پڑھنا صحیح ہے؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا کیا ہے؟ اس کا آسان اور صحیح جواب صرف یہ ہے کہ ایسا کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے۔ چنانچہ فتاویٰ سمرقندیہ میں ہے کہ:

قراءة الفاتحة والاخلاص والكافرون على الطعام بدعة۔ (المجموعۃ ص ۴۸)۔ سورۃ فاتحہ اور اخلاص اور کافرون کا طعام پر پڑھنا بدعت ہے۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ کے فتاویٰ میں ہے:

سوال: فاتحہ مروجہ حال یعنی طعام را پیش نہادہ دست برداشتہ چیزے خواندن چہ حکم دارد؟

جواب: ایں طور مخصوص در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبودہ و در زمان خلفاء بلکہ وجود آں در قرون ثلاثہ کہ مشہود لہا بالخیر اند منقول نشدہ و در حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً عادت خواص نیست و اگر کسے ایں طور مخصوص بعمل آرد و آں طعام حرام نمی شود و خوردنش مضائقہ نیست لیکن ایں را ضروری دانستن مذموم است الخ (مجموعہ فتاویٰ ج ۲ ص [illegible])

اور مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"وقت فاتحہ کھانے کا قاری کے پیش نظر ہونا اگرچہ بیکار بات ہے مگر اس کے سبب سے حصول ثواب یا جواز فاتحہ میں کچھ خلل نہیں۔" (الحجۃ الفائحہ ص [illegible])

مشہور بریلوی عالم مولوی محمد صالح صاحب کھانا سامنے رکھ کر اس پر پڑھنے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"یہ رسم سوائے ہندوستان کے اور کسی اسلامی ممالک میں رائج نہیں۔" (بلفظہ تحفۃ الاحباب ص ۱۲۲)

جب یہ امر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ بلکہ خیر القرون سے ثابت نہیں ہے اور حضرات فقہائے کرام اس کو بدعت کہتے ہیں اور بقول خان صاحب بریلوی یہ بیکار بات ہے اور بقول مولوی محمد صالح صاحب ہندوستان کے بغیر کسی اسلامی ملک میں یہ رسم جاری اور رائج نہیں، تو اس کو ضروری سمجھنا اور اہل السنت اور حنفیت کی علامت قرار دینا اور نہ کرنے والوں کو وہابی کہنا اور طعن کرنا یہ کہاں کا انصاف اور دیانت ہے؟ بلکہ قرین قیاس و انصاف یہی بات ہے کہ ہندوستان میں یہ رسم ہندوؤں سے ماخوذ ہے۔ وہ کھانے پر بید پڑھتے تھے، اور کلمہ گو مسلمان قرآن پڑھتے ہیں۔ وہاں پنڈت یہ کام کرتے تھے اور یہاں حافظ جی اور میاں جی یہ کارروائی کرتے ہیں۔

مفتی احمد یار خان لکھتے ہیں کہ کھانے کو سامنے رکھ کر دعا کی تو کونسی خرابی ہے۔ اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں۔ (جاء الحق ص۲۵۱)۔

مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ جنازہ اور قبر کو سامنے رکھ کر دعا کرنے کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ثبوت ہے۔ لیکن ایصال ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھنے کا ہرگز ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے اور بقول خان صاحب بیکار بات ہے۔ اور بدعت، بیکار اور لایعنی کام میں ضرور حرج ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بیکار امر اور فعل عبث حرام ہوتا ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یہ حوالہ نقل ہو چکا ہے کہ "و ہر چیز کہ بیان ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نہ باشد آں فعل عبث است و مخالف سنت خیر الانامؐ و مخالف سنت حرام پس ہرگز روا نباشد"۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص [illegible])۔

چٹائی اور پھوڑی بچھانا

جب کسی کا کوئی عزیز و قریب فوت ہو جائے تو اس کی تعزیت کرنا اور صبر کی تلقین کرنا مسنون امر ہے مگر صرف اسی حد تک جس حد تک شریعت مطہرہ سے ثابت ہے۔ مسجد میں ہو یا گھر میں تین دن تک تعزیت کی اجازت ہے۔ لیکن گلیوں اور کوچوں میں اور گھروں کے سامنے بیٹھنا اور چٹائیاں اور دریاں

وغیرہ بچھا کر تعزیت کے لئے بیٹھ جانا، یہ تمام امور بدعات ہیں۔ ان سے اجتناب اشد ضروری ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی (المتوفی سنہ ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا بأس بالجلوس لها إلى ثلاثة أيام من غير ارتكاب محظور من فرش البسط والأطعمة من أهل الميت لأنها تتخذ عند السرور۔ (تبيين الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ طبع مصر)

تعزیت کے لئے تین دن بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کیلئے خاص اہتمام سے چٹائی اور دری وغیرہ بچھائی جائے کیونکہ یہ امر ممنوع ہے اور میت کے اہل سے کھانا تناول کیا جائے اس لئے کہ یہ باتیں خوشی کے وقت کی ہیں نہ کہ غمی کے۔

اور فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے کہ:

ولا بأس لأهل المصيبة أن يجلسوا في البيت أو المسجد ثلاثة أيام والناس يأتونهم ويعزونهم ويكره الجلوس على باب الدار وما يفعل في بلاد العجم من فرش البسط والقيام على قوارع الطريق من أقبح القبائح۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷ طبع مصر)

اہل مصیبت کیلئے مسجد میں یا گھر میں تین دن تک لوگوں کی تعزیت کیلئے بیٹھنا کوئی حرج کی بات نہیں لوگ آئیں اور تعزیت کر کے چلے جائیں اور یہ مکروہ ہے کہ گھر کے دروازہ پر بیٹھیں اور عجم کے شہروں میں جو یہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ چٹائیاں اور دریاں بچھاتے ہیں اور راستوں کے درمیان بیٹھ جاتے ہیں تو یہ قبیح ترین حرکت ہے۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"و نشستن بر در یا بیرون برائے تعزیت مکروہ است اشد کراہت از جہت بودن آں عمل جاہلیت (الیٰ ان قال) و تعزیت کہ بایں کیفیت کہ الآن متعارف است و در ایام معدودہ کنند بدعت ... (شرح سفر السعادت ص ۲۸۶)

ان عبارات سے بخوبی یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تعزیت کے لئے جو طریقہ آج کل اختیار کیا جاتا ہے کہ گلیوں میں اور دروازوں پر چٹائیاں اور دریاں بچھا کر تعزیت کے لئے بیٹھتے ہیں۔ یہ قبیح ترین حرکت ہے اور اشد مکروہ ہے کیونکہ اہل جاہلیت کی رسم ہے اور حضرات سلف صالحین میں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا۔ علاوہ بریں جو لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوتے ہیں اُن کے لئے تعزیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جنازہ پڑھنے کی وجہ سے میت کا حق ادا ہو گیا۔ الّا یہ کہ کوئی بزرگ ہستی اور صاحب شخصیت ہو جو اہل میت کے

میت کی تلقین کرنے کی غرض سے دوبارہ حاضر ہو تو الگ بات ہے۔

مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حنفیت ص ۱۱۱ میں جس روایت سے پھوڑی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ صرف مولوی محمد عمر صاحب کا ہی کام ہے۔ اس روایت میں اشارۃً بھی پھوڑی کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس کا پھوڑی سے کوئی واسطہ ہے۔ محض تعزیت کی روایت سے مولوی محمد عمر صاحب کا پھوڑی پر ثبوت مہیا کرنا سراسر باطل ہے۔

فائدہ: میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی جائز ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رفع یدیہ ثم قال اللّٰھم اغفر لعبید ابی عامرؓ (بخاری ج ۲ ص ۶۱۹ و مسلم ج ۲ ص ۳۰۴) حضرت عبید ابو عامرؓ کے لئے ان کی وفات کی خبر سن کر ہاتھ اٹھا کر ان کے لئے دعا مانگی تھی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) فرماتے ہیں کہ تعزیت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ظاہر ہو جاتا ہے الخ (مسائل اربعین ص ۲۴) اور قبر پر بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے (دیکھئے مسلم ج ۱ ص ۳۱۳ و اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج ۲ ص ۲۱۹)۔

حیلۂ اسقاط

یہ بات تو پہلے بوضاحت بیان کی گئی ہے کہ میت کے لئے صدقہ اور خیرات کرنا اس کے ساتھ ایک بہت بڑی عمدہ حسن سلوک اور ہمدردی ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا ثبوت ہے اور اہل السنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے، مگر ایصال ثواب کا طریقہ وہی معتبر ہوگا جو دلائل شرعیہ سے ثابت ہے۔ اگر کسی عاقل اور بالغ کے ذمہ کچھ نمازیں باقی ہوں اور اس حالت میں اس کی وفات ہو جائے تو حضرات فقہاء کرامؒ نے روزہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے فدیہ تجویز کیا ہے۔ مگر اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں بھی موجود ہیں گو بظاہر موقوف ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔

عن ابن عباس قال لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد ولکن یطعم عنہ (مشکل الآثار ج ۳ ص ۱۴۱)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے۔ مگر ہاں اس

سنن الکبریٰ ج۴ ص۲۵۴ وجوہر النقی ج۴ ص۲۵۴ ابن ابی شیبہ والدار قطنی ج۲ ص۲۷۳) کی طرف سے فدیہ دے دے۔

علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند علی شرط الشیخین صحیح ہے (الجوہر ج۴ ص۲۵۴) اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ: سندہ صحیح (الدرایہ ص۱۷۶)۔

وعن ابن عمرؓ قال لا یصلین احد عن احد ولا یصومن احد عن احد ولکن ان کنت فاعلا تصدقت عنہ او اھدیت عنہ۔ (ایضاً)۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور لیکن اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس کی طرف سے صدقہ یا ہدیہ اور فدیہ دے دو۔

ہر روزہ کا بدلہ نصف صاع گندم ہے، صاع دو سو ستر تولہ کا ہوتا ہے علامہ شامیؒ (الحنفیؒ) سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ صاع کوفی ہشت اسپے مروجہ دو صد و ہفتاد تولہ مستقیم

صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوا اور نصف صاع تقریباً پونے دو سیر کا۔ ہر آدمی کو اپنی نمازوں اور روزوں کا حساب کر کے حسب تصریح حضرات فقہاء کرام وصیت کرنی چاہئے (دیکھئے خانیہ ج۱ ص۱۰۸ و جامع الرموز ج۱ ص۱۲۹ و نور الایضاح ص۱۰۷)۔ اور اگر بغیر وصیت کے وارث نے بطور تبرع فدیہ دیا تب بھی جائز ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ثواب پہنچے گا۔ مگر وارثوں پر یہ فدیہ لازم نہ ہوگا۔ اور ہر نماز کا بدلہ بھی نصف صاع ہوگا اور وتر کے لئے مستقل نصف صاع ہوگا۔ پانچ نمازوں کا اندازہ مع وتر ساڑھے دس سیر گندم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ کے حقوق نہیں تو اس کے لئے فدیہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص مالدار ہے اور اس کے ترکہ سے وارثوں کی حق تلفی کئے بغیر ثلث سے فدیہ دیا جا سکتا ہے تو دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص فقیر اور غریب ہے اور اس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ حقوق ہیں اور اس کے ثلث ترکہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا ہو سکے تو حضرات فقہاء کرامؒ نے اس کے لئے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جتنی مقدار میں گندم یا اس کی رقم کا اس کا ترکہ متحمل ہے تو وہ گندم یا رقم میت کا وارث کسی فقیر کو دے دے، پھر فقیر وارث میت کو ہبہ کر دے، پھر وارث فقیر کو دے دے حتیٰ کہ آخر بار یہ سلسلہ ہوتا رہے جتنی میں نمازوں اور روزوں کا اندازہ پورا ہو جائے

یہی صورت فقہ حنفی کی معتمد کتابوں میں لکھی ہے۔ (مثلاً دیکھئے کبیری ص۵۳۵، شامی ج ۱ ص ۴۹۲، اور نور الایضاح ص۱۰۲ وغیرہ) اور حضرات فقہاء احنافؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر یہ فدیہ نماز کا عوض نہ بن سکا تو فبہا، ورنہ صدقہ کا ثواب تو میت کو ہی حاصل ہوگا (دیکھئے نور الانوار ص۱۲۲ وغیرہ)۔ اس ساری بحث کو پیشِ نظر رکھ کر ذیل کے امور بخوبی اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) نمازوں اور روزوں کا ٹھیک حساب اور تخمینہ لگایا جائیگا، محض رسمی طور پر فدیہ کا کوئی معنی نہیں۔

(۲) اور اپنے وارثوں کو اس کی وصیت کی جائے کہ میری طرف سے میرے ثلث ترکہ میں سے فدیہ دینا۔

(۳) جس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ نہیں اس کے لئے اس معہود فدیہ کا کوئی معنی نہیں ہے۔ بایں طور کہ اس نے اپنی زندگی میں نماز اور روزہ کی پابندی کی ہے، اور بہت سے خدا کے بندے آج بھی ایسے موجود ہیں، یا نابالغ بچے اور مجنون اور پاگل وغیرہ ہیں، ان کے لئے اس فدیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بشرطیکہ بلوغت سے تا مرگ جنون رہا ہو۔

(۴) اگر کوئی فقیر ہے اور اس کا ترکہ تمام روزوں اور نمازوں کی ادائیگی کا متحمل نہیں، تو صرف اس کے لئے حضرات فقہاء کرامؒ نے حیلہ تجویز کیا ہے۔ خانوں، سرداروں، وڈیروں، امیروں اور نوابوں کے لئے یہ حیلہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(۵) یہ فدیہ صرف حقوق اللہ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ حقوق العباد تو حقوق ادا کرنے ہی کی صورت میں ادا ہو سکتے ہیں اور بس، یا صاحب حق بطیب خاطر خود معاف کر دے۔ جب آخری مرتبہ حیلہ کی صورت میں میت کے ذمہ جو نمازیں اور روزے تھے وہ ادا ہو گئے تو وہ گندم اور رقم اس فقیر کی ملک ہو گئی جس نے قبول کر لی، پھر اس سے واپس لے کر وارثوں کو اس کی تقسیم کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ پہلے تو بامر مجبوری بشکل حیلہ فقیر سے واپس ہوتی رہی مگر اب کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ اس فقیر سے واپس لے کر اس کو میت کے وارث خود تقسیم کریں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

الذی یعود فی هبته کالکلب یعود فی قیئه او کما قال۔ (بخاری ج۱ ص۳۵۷ و مسلم ج۲ ص۳۶)۔

جو شخص ہبہ کرکے پھر اس کو واپس لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کتا قے کرکے دوبارہ چاٹ لیتا ہے۔

صوبہ سرحد اور بعض دوسرے علاقوں میں یہ دستور ہے کہ حیلۂ اسقاط کے لئے ایک خاص بالرات گٹھڑی ہوتی ہے جس میں قرآن کریم کے علاوہ کچھ ریزگاری اور گڑ شریف بھی شامل ہوتا ہے اور پھر اس کو ایک دائرہ کے اندر گھمایا جاتا ہے اور ایک مخصوص دعا سے شروع کر کے کل حق من حقوق اللہ تعالیٰ بعضہا ادی الواجبہ گٹھڑی بصاحب دائرہ کو دی جاتی ہے جس میں اکثر بڑے بڑے خانی نواب اور امیر تک بھی شامل ہوتے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ قبلت بالطریقۃ المذکورۃ و وھبتُ دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حضرات فقہاء کرام کی ان عبارتوں میں نہ تو قرآن کریم کا کہیں ذکر ہے اور نہ گڑ شریف کا۔ خدا معلوم یہ حیلہ در حیلہ کا ثبوت کہاں سے نکلا ہے؟ اور اس گٹھڑی میں جو رقم ہوتی ہے وہ بھی بعض اپنی عزت اور ناک کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میت کی نمازوں اور روزوں کا حساب کیا ہے؟ اور کتنی بار پھیر دینے سے وہ حساب بے باق ہوگا؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس حیلۂ اسقاط کا جواز حضرات فقہاء کرام سے ملتا ہے اور جن لوگوں کے لئے ملتا ہے اور جن حالات میں ملتا ہے وہ تقریباً تقریباً آج مفقود ہیں اور محض دنیا کمانے کا ایک ذریعہ حیلہ ہی کر رہ گیا ہے اور بمشکل ایک دو فیصدی حیلے ایسے ہوتے ہوں گے جو حضرات فقہاء کرام کے بیان کردہ حیلے کے عین مطابق ہوں گے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا کہ:

"حیلہ اسقاط کا مفلس کے واسطے علماء نے وضع کیا تھا۔ اب یہ حیلہ تحصیل چند فلوس کا ملاؤں کے واسطے مقرر ہو گیا ہے۔ حق تعالیٰ نیت سے واقف ہے، وہاں حیلہ کارگر نہیں۔ مفلس کے واسطے بشرط صحت نیت وارث کے کیا عجب ہے کہ مفید ہو، ورنہ لغو اور حیلہ تحصیل دنیا و نیز کلب ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ص۱۲۱)۔ اور دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ "حقوق مالیہ تو ادائے حقوق سے ادا ہو سکتے ہیں، اور حقوق بدنیہ جیسے نماز روزہ تو اگر ہر نماز اور ہر روزہ کے بدلے نصف صاع گیہوں اور ایک صاع جو ادا کرنے سے امید ادا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ باقی رہا یہ اسقاط مروجہ، محض لغو اور بے ہودہ حیلہ ہے، اور اس کا خیر القرون میں کچھ اثر نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص۱۲۱)۔

بعض فقہاءؒ نے تو اس میں غلطی سے ایسا غلو کیا کہ صاف لکھ دیا کہ:

وان لم یملك شیئاً استقرض وارثه ۔ اگر مردہ کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کا وارث قرض لے کر فدیہ ادا کرے۔ (جامع الرموز ج۱ ص[illegible])

مولوی محمد صالح صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ "اگر میت کی جائداد کچھ بھی نہ ہو تو وارث پر لازم ہے کہ قرض لے کر ادا کرے"۔ انتہی ملخصاً (تحفۃ الاحباب ص۹)۔

حالانکہ یہ حضرات فقہاء احناف کے مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

وعلیه ان یوصی بالفدیة ویعتبر ذلك من ثلث ماله عندنا وان لم یوص وتبرع الورثة عنه جاز ولا یلزمهم من غیر ایصاء عندنا خلافاً للشافعیؒ (قاضی خان ج۱ ص[illegible])

میت پر فدیہ کی وصیت لازم ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ وصیت ثلث مال سے پوری ہوگی اگر میت نے وصیت نہ کی اور وارثوں نے نفلی تبرع کے طور پر اس کی طرف سے فدیہ ادا کر دیا تو جائز ہے مگر ہمارے نزدیک بغیر وصیت کے وارثوں پر یہ لازم نہیں ہے بخلاف حضرت امام شافعیؒ کے۔

جب میت کے اپنے ترکہ میں ثلث مال سے فدیہ بھی بغیر وصیت کے وارثوں پر لازم نہیں ہے تو بصورت عدم ملک کے وارث کا قرض لے کر فدیہ ادا کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس غلط حیلۂ اسقاط کے طریقے نے بعض علاقوں میں بہت سے لوگوں کو بہت ہی زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور بعض اپنے چند ٹکوں کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اور حکم البمعصیتین اور فوائد و منافع تراش تراش کر سادہ لوح مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب حضرت مولانا گنگوہیؒ کی سابق عبارت پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مفلس کی قید مولوی رشید احمد صاحب نے اپنے گھر سے لگا لی ہے الخ"۔ (جاء الحق ص[illegible])۔

مگر مفتی صاحب خود اپنا لکھا فراموش کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "اب اگر کسی کے ذمہ دس برس سال کی نمازیں ہیں تو صدہا من غلہ خیرات کرنا ہوگا۔ شاید کوئی بڑا دیندار مالدار تو یہ کر سکے مگر غربا تو

ناممکن۔ ان کے لئے یہ طریقہ ہے کہ ولی میت بقدر طاقت گندم الخ (جاء الحق ص۲۵۲) مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ آپ مسئلہ ہزار کی قید اپنے گھر سے کیوں لگاتی ہے؟ کیا سچ کہا گیا ہے ؎

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر — دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی

لطیفہ: مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح کہ زندہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، اسی طرح مُردوں کے بھی دشمن ہیں کہ نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بلفظہ (جاء الحق ص۲۵۲)۔

مفتی صاحب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ فرمائیں کہ وہابی دیوبندی تو خیر بقول شما دشمن ہی سہی مگر آپ لوگوں نے اپنے پیٹ کو ایسا سر پر اٹھا لیا ہے کہ زندہ مسلمانوں کو بھی خیر خواہ بن کر لوٹ کر کھا گئے اور مردہ مسلمانوں کو بھی تیجے سے نہ چھوڑا۔ کبھی تیجا اور ساتواں کی صورت میں اور کبھی گیارہویں اور چالیسویں کی شکل میں اور کبھی عرس میلاد وغیرہ کے رنگ میں جونک بن کر سادہ مسلمانوں کو چوس لیا ہے، اور نہ تو زندگی میں، اور نہ بعد از زندگی کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہی خواہ اور خیر خواہ آخر ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک بہت سے مولوی اور پیر لوگوں کے اموال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکتے ہیں۔ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (الآیۃ)۔ وہ سیدھا سادہ خدا تعالیٰ کا دین جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا۔ اس پر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے نذرانوں کی بدعات کے سینکڑوں غلاف چڑھا دیئے ہیں اور صحیح دین جس کو اس دور میں اصل شکل میں صرف اکابرین علماء دیوبند ہی پیش کر رہے ہیں اس سے مفتی صاحب وغیرہ روکتے ہیں فوا اسفا!

دورانِ قرآن

میت کے لئے ایصال ثواب کا مسئلہ اور نادار مفلس کے لئے حیلہ اسقاط کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا ازلی کلام اور ظاہری و باطنی، جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماعِ امت سے ایصالِ ثواب کا طریقہ ثابت ہے لیکن اس کا ثبوت کسی صحیح دلیل سے نہیں ہو سکا کہ جنازہ کے بعد میت پر قرآن کریم کو پڑھا جائے۔ تمام احادیث کا ذخیرہ چھان لیجئے کہیں آپ کو اس کا نام و نشان تک نہیں مل سکے گا۔ شافعیوںؒ اور مالکیوںؒ و حنبلیوںؒ کی معتبر و مستند کتابوں کی ورق گردانی کیجئے کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی کتابیں دیکھ لیجئے کہیں اس کا بیان نہ ہوگا۔ فقہ حنفی کے معتبر و مستند فتاویٰ کی متون اور شروح کو ملاحظہ کر لیجئے کہیں اس کا پتہ نہ پاؤ گے۔ کتب ظاہر الروایہ کا مطالعہ کر لیں، کہیں بھی اس کی جھلک نظر نہ آئے گی۔ حضرات صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظامؒ کی سوانح عمریاں ملاحظہ کیجئے اس کا وجود کہیں نہیں ملے گا۔ اور صورت کوئی ایسی نادر چیز نہیں جس کا کہیں وقوع نہ ہوا ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے دورانِ قرآن کا حیلہ تجویز کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرات فقہاء احنافؒ نے کتب فقہ میں اور حافظ ابن القیمؒ نے اغاثۃ اللہفان ج ۲ ص ۱۸۵ میں اس کی تصریح کی ہے کہ ہر ایسا حیلہ جس کی وجہ سے انسان کسی حرام سے بچ سکے یا بغیر ابطالِ حق غیر کے اور بغیر ایقاع شبہ فی الدین کے کسی حلال چیز کا حصول اس سے ہو سکے، تو وہ درست ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ وہ مقام نہیں جس میں ہمیں اپنی طرف سے قیاس و اجتہاد کر کے از خود حیلے تراشیں کہ ایک نیا دین کھڑا کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہو کیونکہ کفن و دفن کے اور ایصالِ ثواب کے اور میت سے ہمدردی کے تمام پہلو جناب رؤف و رحیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ایک کر کے ہمیں بتائے اور حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون نے اپنے عمل سے وہ ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اگر ایسے مقام پر انہوں نے کوئی حیلہ نہیں کیا تو یقین جانئے کہ ہمارے لئے بھی اس کے کرنے کی ہرگز ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب سبت کے ایسے ہی فاسد حیلوں کے سبب ان پر عذاب نازل کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایسے ہی نفسانی حیلوں کے پیش نظر قاتل اللہ الیہود (الحدیث) کے سنگین اور نہایت ان کے حق میں بددعا فرمائی گئی،

(مسکین) اور اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کو آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

عن ابی ھریرۃ ؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ترتکبوا ما ارتکبت الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل — وھذا اسناد جید۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۵۷ و الدر المنثور ج ۳ ص ۱۳۶)

تم ایسی حرکات کا ارتکاب نہ کرو جیسا کہ یہود نے کیا کہ تم معمولی حیلوں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنے لگو۔

الغرض صوبہ سرحد اور دیگر مختلف علاقوں میں چند ٹکوں کی غرض سے قرآن مجید کو جو پھیرا جاتا ہے، اس کا شریعت اسلامیہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ شریعت حقہ اس قبیح ترین حرکت سے سخت بیزار ہے اور تمام حق پرست علماء کرام کا اولین فرض ہے کہ اس رسم بد کو فی الفور ختم کرائیں اور اس مصنوعی اور خود ساختہ طریقہ سے (جس میں لفظ دوران قرآن ہی اس کے خود ساختہ ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن کریم پھرتا نہیں پھیرا جاتا ہے اور اس کی حقیقت اگر عربیت سے یہ رسم نکلتی تو تدویر قرآن کا لفظ استعمال کیا جاتا کہ دوران قرآن) کا مسلمانوں کو نجات دلا کر ان کے سامنے دین اسلام پیش کریں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور آئمہ مجتہدینؒ سے ثابت ہے، اور اپنی طرف سے ان بدعات کو پیش کرکے اسلام کا نام و نشان مٹانا دین اسلام سے اشد ترین دشمنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!

تصویر کا دوسرا رُخ

نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مجوزین دوران قرآن کے دلائل بھی ناظرین کرام کے سامنے عرض کردیں اور پھر ان پر سنداً و متناً، روایۃً و درایۃً کلام کریں۔ مجوزین کا کہنا ہے کہ دوران قرآن کا ثبوت خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ سے ہے، چنانچہ امام ابواللیث سمرقندیؒ (المتوفی ۳۸۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

حدثنا العباس بن سفیان عن ابن علیۃ عن ابن عون عن محمد عن عبد اللہ قال قال عمرؓ ایھا المؤمنون اجعلوا القرآن وسیلۃ

ہم سے عباس بن سفیانؒ نے بیان کیا اور وہ ابن علیہؒ سے اور وہ ابن عونؒ سے اور وہ محمدؒ سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے مومنو!

لفجاءة الموت فصلوا وقولوا اللّٰهم اغفر لهذا
الميت بحرمة القرآن المجيد وتناولوا بايديكم
متناولة وفعل عثمانؓ في اخر الخلافة مثله في
زمانه لامرأة ملقبة بحبيبة بنت عبيد زوجة
قلاب (وفي نسخة ملاعب) بجزء القرآن من ثاني
الى عشر بين الموتى وشاع فعله في زمان خلافة
عثمانؓ بانكار مروان بعده وقال الامام
السمرقندي ثم اشتهر في خلافة هارون
الرشيد من غير انكار نكير دوران القرآن
لحيلة الاسقاط فحصل ثابت بن عمرؓ وان

لم يذكر في الكتب المشهورة من الاحاديث
ولكنه مذكور في الكتب من التواريخ بسند
قوي كما قال المؤرخ صاحب الفتوح لخيوق
ابو عاصم عن ابن جريج عن ابن شهاب
عن ابي سلمة عن ابي موسى قال فعل عمرؓ
تعاهد جزء القرآن في سنة عشرين وبعد
بعد صلاة الجنازة لامرأة ملقبة بحبيبة او
لرجل من قبيلة الانصار ما حفظت اسمه
وثبت بهذا السند ايضاً اخبرنا سعد عن
ايوب عن حبيب عن عبد الرحمٰن بن ابي بكر
انه اوجد دوران القرآن عمرؓ والقرآن

قرآن کو مردوں کی نجات کا ذریعہ بناؤ۔ پس جنازہ پڑھو
اور کہو اے اللہ اس میت کو اس قرآن کی حرمت سے بخش
دے اور باری باری ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قرآن کو
لیتے رہو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام میں حبیبہ
بنت عبید قلاب کی بیوی کے لئے ایسا ہی حیلہ کیا گیا تھا
ثانی سے عشر تک میتوں کے بیچ قرآن مجید کا جزو کے
ساتھ حیلہ کیا گیا تھا اور یہ طریقہ حضرت عثمانؓ میں مشہور
ہو چکا تھا البتہ مروان نے بعد از اس پر اعتراض کیا تھا امام
سمرقندی فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ ہارون الرشید کی خلافت میں
رائج ہو چکا تھا کسی نے حیلہ اسقاط میں دوران قرآن
بھی کیا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو اس کی اصل حضرت
عمرؓ سے ثابت ہے اگرچہ حدیث کی مشہور کتابوں میں اس کا
ذکر نہیں ہے لیکن تاریخ کی بعض کتابوں میں قوی سند کے
ساتھ اس کا ذکر ہے چنانچہ مورخ صاحب فتوح نے
کہا ہے کہ ہم سے ابو عاصمؒ نے بیان کیا وہ ابن جریجؒ سے اور
وہ ابن شہاب زہریؒ سے اور وہ ابو سلمہؒ سے اور وہ حضرت
ابو موسیٰؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس ہجری کے
سنہ میں نماز جنازہ کے بعد ایک عورت کے لئے جس کا لقب
حبیبہ تھا اور ایک انصاری کے لئے جس کا نام مجھے یاد نہیں
رہا قرآن کا دوران کیا تھا اور اس سند سے بھی ثابت ہے
کہ ہم سے سعدؒ نے بیان کیا وہ ایوب سے اور وہ حبیبؒ سے اور وہ

شافع للمؤمنین حیاتاً و بعد مماته۔ انتہیٰ — وہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حیاتی آپ

(تفسیر سمرقندی) — کا ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک ... قرآن کی مومنوں کی شفاعت کرنے گا زندگی میں

اور بعد از وفات بھی شفاعت کرنے والا ہے۔

الجواب: فنِ حدیث کے پیشِ نظر اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امام ابو اللیثؒ اگرچہ ایک بہت بڑے فقیہ ہیں مگر فنِ روایت اور حدیث میں تو حضرات محدثین کرامؒ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کی پیش کردہ روایت اسماء الرجال کی کتابوں سے پرکھ کر دیکھیں گے کیونکہ یہی وہ فن ہے جو حدیث کا محافظ ہے۔ پہلی سند ہرگز قابلِ استدلال نہیں ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ اس میں عثمان بن سفیانؒ مجہول ہے کتبِ رجال میں اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل سکا۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہرگز اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول شخصیتوں سے لیتے پھریں۔ وثانیاً امام سمرقندیؒ کی وفات ۳۷۵ھ میں ہوئی ہے (مقدمہ حقانی ص۱۲) اور ابن علیہ کی وفات ۱۹۳ھ یا ۱۹۴ھ کو ہوئی ہے (تہذیب ج۱ ص۲۷۹)۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ امام سمرقندیؒ صرف ایک واسطے سے ابن علیہ سے یہ روایت کرتے ہیں درمیان میں ایک سو اکیاسی ۱۸۱ سال کا طویل زمانہ اس کا متحمل نہیں ہے جیسا کہ فنِ حدیث اور طبقاتِ رواۃ کو جاننے والوں پر مخفی نہیں ہے۔

دوسری سند مختصر صاحب فتوح کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ اوّلاً صاحب فتوح محمد بن عمر واقدی قابلِ اعتبار ہی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ، ابن المبارکؒ، ابن نمیرؒ اور اسمٰعیل بن زکریا اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اس کو ضعیف اور لیس بشیء کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا۔ محدث بندارؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے جھوٹا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام اسحاق بن راہویہؒ اور ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ جن چار مشہور کذابوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جعلی حدیثیں بنا بنا کر بتائی ہیں ان میں ایک واقدی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ:

کتب الواقدی کلہا کذب۔ — واقدی کی تمام کتابیں خالص جھوٹ ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۶۳ تا ص۳۶۶ ملخصاً)

وثانیاً اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں۔ جو اگرچہ ثقہ تھے مگر کمال خواہش کے ساتھ تدلیس کے قائل تھے چنانچہ

انہوں نے قوت ہوتے ہوئے اپنی بیٹ سے نکاح متعہ کیا تھا اور اس کو جائز سمجھتے تھے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۵۹) علاوہ ازیں امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ابن جریج موضوع احادیث اور من گھڑت روایات بھی نقل کر دیا کرتے تھے اور روایات لینے میں ثقہ اور غیر ثقہ کی کوئی تمیز نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً)

وثالثاً یہ روایت ابن جریج کی محمد بن شہاب زہری سے ہے، اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریج فی الزہری لیس بشیء کہ ابن جریجؒ کی امام زہریؒ سے روایت محض ہیچ ہے۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ حاطب لیل تھے۔ (تہذیب ج ۶ ص ۴۰۶)۔

ورابعاً ابن جریجؒ مشہور مدلس تھے (دیکھئے میزان ج ۲ ص ۱۵۹ و تہذیب ج ۶ ص ۴۰۶) اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ قبیح التدلیس تھے۔ ان کی تدلیس سے پرہیز کرنا ضروری ہے (تہذیب ج ۶ ص ۴۰۶) اور یہ روایت مدلس ہے۔

یہ ہے امام سمرقندی کی قوی سند۔ اور اسی لئے ہم نے اس پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ تیسری سند میں ایوبؒ، سعدؒ، شیخؒ یہ تمام راوی مجہول ہیں۔ یہ کون تھے اور کیسے تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جو اس کی صحت کا مدعی ہے اس پر ان کی تعیین اور توثیق ضروری ہے۔ یہ سب کی سب سندیں نہایت کمزور اور مخدوش ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر دین کے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی جائے۔ اور اسی واسطے کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور امام سمرقندیؒ کو بھی صاف لفظوں میں اقرار ہے کہ حدیث کی مشہور (بلکہ غیر مشہور) کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں:

من جاء الیوم بحدیث لا یوجد عند الجمیع لا یقبل (تدریب الراوی ص ۱۲۱، فتح المغیث ص ۱۲۱، مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۸)۔

کہ جس شخص نے آج کوئی حدیث پیش کی جو کہ تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک نہ ہو اور جس کو انہوں نے ذکر کیا ہو تو وہ روایت ہرگز قبول نہیں کی جا سکتی۔

قطع نظر سند کے اگر درایۃً بھی اس پر غور کیا جائے تو اس روایت کا بطلان واضح ہو جاتا ہے، بچند وجوہ:

اوّل: یہ روایت کسی رافضی کی ایجاد ہے اس لئے کہ یہ حیلہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور دیگر ارشد کی طرف تو منسوب کیا گیا ہے لیکن حضرت علیؓ کا نام تک نہیں لیا گیا اور مروان کی تو لعنت کا خاص طور پر

درۃ الفیود میں امام محمدؒ کی کتاب الحیل کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ :

قال الامام محمد اسھل طریقہ ان یبیع المرائث علی الفقیر مصحفا مصحفا و یلوح القرأۃ جمیع ما احتش لہ بیسب التقیبلہ ثم یخرج حتی یستقر اول اللہ یعمل ندیۃ فی مقابلۃ الصوم والزکوٰۃ والنذورات الخ

حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ میت کا وارث ایک یا کئی بار قیمت قرآن کریم کا نسخہ فقیر کو بیچ دے اور تمام بکھرے ہوئے حقوق کے حساب سے قیمت کر دے۔ پھر فقیر وارث کو ہبہ کرے پھر وہ فقیر کو دے حتیٰ کہ نماز، زکوٰۃ اور منتوں وغیرہ کا حساب مکمل ہو جائے یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو اس کا فدیہ بنا دے۔

مگر اس عبارت سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوگا ماولاً اس لئے کہ کتاب الحیل امام محمدؒ کی تالیف ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ملا ابو محمد عبد القادر القرشی الحنفیؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

قال ابو سلیمان الجوزجانیؒ کذبوا علی محمدؒ لیس لہ کتاب الحیل انما کتاب الحیل للوراق۔ (جواہر المضیہ ۲ ص۴۳)

امام ابو سلیمان جوزجانیؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے امام محمدؒ پر جھوٹ کہا ہے۔ کتاب الحیل ان کی نہیں ہے۔ کتاب الحیل تو وراق کی لکھی ہوئی ہے۔

جب کتاب الحیل ہی امام محمدؒ کی نہیں تو اس حیلہ کی اُن کی طرف نسبت کیسے صحیح ہے؟ بخصوص جبکہ ان کی مشہور کتابیں جو ظاہر الروایۃ کہلاتی ہیں اس سے بالکل عاری ہیں۔

وثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ مخلوق تو غنی حاجت کو قبول نہ کرے اور جب خدا تعالیٰ سے معاملہ ہو تو فقیر کو غنی حاجت پر قرآن دیا جائے۔ یہ مکر اور خداع کیوں؟

کارہا با خلق آری جملہ راست   با خدا تدبیر و حیلہ کے روا است

مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں :

"عرض : اسقاط کی حالت میں چند سیر گندم اور قرآن کریم دیا جاتا ہے، اس میں کل کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ ارشاد : جتنی قیمت قرآن عظیم کی بازار میں ہے، اتنے کا کفارہ ادا ہو جائے گا (احکام شریعت حصہ سوم ص۱۳۵)۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ پنجاب میں جو عام طور پر یہ مروج ہے کہ مسجد قرآن پاک

کا ایک نسخہ منگایا، اُس پر ایک روپیہ رکھا اور چند لوگوں نے اُس کو ہاتھ لگایا، پھر مسجد میں واپس کر دیا، اس
سے نمازوں کا فدیہ ادا ہو جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی کوئی قیمت ہی نہیں، لہٰذا جب قرآن شریف
کا نسخہ خیرات کر دیا، سب نمازوں کا فدیہ ادا ہو گیا۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس میں اعتبار تو قرآن کے کاغذ
لکھائی چھپائی کا ہے۔ اگر دو روپیہ کا یہ نسخہ ہے تو دو روپیہ کی خیرات کا ثواب ملے گا۔ ورنہ پھر وہ مال دار
جن پر ہزاروں روپیہ سالانہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ کیوں اتنا خرچ کریں۔ صرف ایک قرآن پاک کا نسخہ
خیرات کر دیا کریں۔ غرضیکہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ بلفظہٖ ([illegible] ص۲۱۲)۔

اور فتاویٰ نور الہدیٰ میں ہے کہ مصحف درست و تمام بہا دہد کہ مالک آں اسقاط کنندہ باشد
باکسے بہ بخشد و قبول کند الخ (ص۱۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم اسقاط کنندہ کی ملک میں ہو اور جتنی قیمت اس کی بازار میں ہو
اتنی ہی قیمت کے عوض میں وہ کسی فقیر کی ملک کر دیا جائے۔ اور یہ جو حیلہ دورانِ قرآن کے قائل ہیں
وہ اس کی قید بھی لگاتے ہیں کہ:

ان دوران القرآن لا یلزم عند الافلاس ای عدم قدرۃ اداء الفدیۃ۔ (مجموعۃ الفتاویٰ)۔

دوران قرآن اس وقت لازم ہے جب کہ کوئی مفلس ہو اور اسے فدیہ کی ادائیگی پر طاقت نہ رکھتا ہو۔

مگر دوسرے شہروں اور اسی طرح دیگر بعض علاقوں میں یہ رسم اتنی عام ہے کہ امیر و غریب اور شاہ و گدا
سب کے لئے دوران قرآن کیا جاتا ہے اور اس حیلہ دورانیہ کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اصل حقیقت
کی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ تمام مسلمانوں کا عموماً اور علماء کرام کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ بدعات سے
اور خصوصاً دوران قرآن کی رسم سے خود بھی اجتناب کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی اس رسم کی قباحت
سے روشناس کریں ؎ ما بر رسولاں بلاغ باشد و بس!

غرضیکہ حیلہ دوران قرآن کا نہ تو کوئی معقول ثبوت ہے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقل ہے نہ خیر القرون
میں اس کا ثبوت اور رواج تھا اور نہ حضرات صحابہ کرام اور حضرات مجتہدین عظام اس سے آگاہ ہیں۔
اور جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے وہ فن اسماء الرجال کے ماتحت ان کی نقل کسی صورت میں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے علماء کرام بنگال و آسام و برما و بلوچستان و سندھ و سرحد و الائی و کوہستان و ہزارہ پنجاب و سیجانان اور دیگر وغیرہ سے علی الخصوص میری درد مندانہ اپیل ہے کہ وہ اس رسم بد کو بند کرنے میں پوری سعی کریں۔ ان میں اہلِ علم اور اہلِ فہم اور انصاف پسند حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ وہ اس پر پوری توجہ کریں، اور دیگر مختلف علاقوں کے علماء اہلِ حق سے بھی گذارش ہے کہ وہ بھی اس رسم بد سے گریز کریں اور اس کو بند کرنے میں انتہائی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

عبد النبی اور عبد الرسول وغیرہ نام رکھنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر نام ہے (وہ جس میں لفظ عبد کی اللہ کی طرف اضافت ہو مثلاً) عبد اللہ اور عبد الرحمٰن وغیرہ اور پھر وہ نام جن میں محمد کا نام ہو مثلاً محمد ابراہیم اور محمد اسمٰعیل وغیرہ۔ لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے، عبد کے معنی عابد کے بھی آتے ہیں اور خادم و غلام کے معنی بھی آتے ہیں۔ جب اس کی اضافت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد خادم اور غلام ہوتا ہے جیسے فَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ۔ لیکن نام اور تسمیہ کے موقع اور محل پر چونکہ یہ لفظ عبودیت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور ایسے موقع پر اس کے متبادر معنی یہی ہیں اس لئے ایسا نام ایہامِ شرک سے خالی نہیں ہے جس سے احتراز کرنا نہایت ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومنها انهم كانوا يسمون ابناءهم عبد العزى وعبد شمس ونحو ذلك الى ان قال فمنها اشباح وقوالب للشرك فنهى الشارع عنها لكونها قوالب له والله اعلم (حجۃ اللہ البالغۃ)

اقسامِ شرک میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبد العزیٰ اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے (پھر فرمایا) کہ یہ نام شرک کے قالب اور اس کے سانچے ہیں اس لئے شارع نے ان ناموں سے منع کیا ہے۔

فائدہ: نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ عزیٰ ایک عورت (پری) تھی جس کی لوگ پرستش کیا کرتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو

حضرت خالد بن الولیدؓ نے قتل کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۱۵) ۔

امام ابن حجر مکیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویحرم ملک الاملاک لان ذلک لیس لغیر الله وکذا عبد النبی وعبد الکعبة او الدار او علی او الحسین لایهام التشریک ۔ (شرح شمائل ترمذی ص)

کسی کا شہنشاہ نام رکھنا حرام ہے کیونکہ یہ نام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی طرح عبد النبی اور عبد الکعبہ، عبد الدار اور عبد علیؓ اور عبد الحسینؓ نام رکھنا بھی حرام ہیں کیونکہ ان میں ایہام شرک ہے۔

لفظ علیؓ چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے اور قرآن کریم میں اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وغیرہ آیا ہے تو اگر کسی کی مراد حضرت علیؓ نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہو تو عبد العلی نام بلا کراہت جائز ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ:

واما ما اشتهر من التسمیة بعبد النبی فظاهره کفر الا ان اراد بالعبد المملوک (شرح فقہ اکبر ص ۲۳۹ طبع مجتبائی)

عبد النبی نام جو مشہور ہے بظاہر یہ کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مملوک مراد ہو تو پھر مکروہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کفر نہیں تو جائز ہوگیا بلکہ یہ بہرحال ناجائز ہوگا۔ چنانچہ خود ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یجوز نحو عبد الحارث ولا عبد النبی ولا عبرة بما شاع فیما بین الناس۔ (مرقات ج ۹ ص ۱۱)

کہ عبد الحارث اور عبد النبی نام رکھنا جائز نہیں ہے اور لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شرک چنانچہ در عبادت وقدرت می شود همچنیں قسم شرک در تسمیه هم میشود ایں قسم نام نهادن شرک در تسمیه است ازیں هم احتراز لازم است۔" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۴۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"پرستش آنست که سجده کند یا طواف نماید یا نام او را بطریق تقرب ورد سازد یا ذبح جانور بنام

او کشد یا خود را بیندد تا لاحقہ گیرد و ہر کہ از مسلمانان جاہل یا اہل قبور ایں چیزہا بعمل آمد تی الفور کافر میگردد و از مسلمانی مے برآید۔" (فتاوی عزیزی ج ۱ صفحہ)

نوٹ : جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس میں تقرب کی نیت شامل ہو، وہ بہرحال حرام ہے گو وقت ذبح اس پر بسم اللہ پڑھی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اُھِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی تفسیر میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا کہ "خواہ وقت ذبح نام خدا بگیرد یا نہ۔" (فتاوی عزیزی ج ۱ صفحہ) ۔ راقم الحروف نے اس پر الگ کتاب لکھی ہے۔ اگر طبع ہو گئی تو غیر اللہ کے نام پہ جانور نامزد کرنے کے جملہ گوشوں پر سیر حاصل بحث اس میں موجود ہے۔ و التوفیق بید اللہ تعالیٰ۔ مستقل کتاب تو ابھی کہاں طبع نہیں ہو سکی البتہ تنقید متین میں اس مسئلہ کی بقدر ضرورت تنقیح ہو چکی ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

سوال : عبدالنبی یا ما نند آں نام نہادن درست است یا نہ؟

جواب : اگر اعتقاد ایں معنی است کہ ایں کس عبدالنبی نام دارد بندۂ نبی است عین شرک است و اگر عبد بمعنی غلام مملوک است آں ہم خلاف واقع است و اگر مجازاً عبد بمعنی مطیع و منقاد گرفتہ شود مضائقہ ندارد لیکن خلاف اولیٰ است۔ روی مسلم عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی ولا امتی کلکم عباد اللہ وکل نساءکم اماء اللہ ولکن لیقل غلامی وجاریتی و فتائی و فتاتی۔ (انتہیٰ بلفظہ) (مجموعہ فتاوی ج ۳ صفحہ)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

استفتاء : کسی کا نام عبدالرسول یا عبدالحسین وغیرہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

هو المصوب، ایسا نام جس میں اضافت عبد کی طرف غیر خدا کی ہو، شرعاً درست نہیں ہے اور اگرچہ صرف جس شخص کے نام رکھنے سے حکم شرک کا نہ ہو بسبب احتمال اس کے کہ عبد سے مراد خادم و مطیع ہے لیکن تاہم شرک سے ایسا نام رکھنا خالی نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس قسم کے نام رکھنے کی ممانعت پر دال ہیں اور علماء کتب محققہ نے بھی جابجا اس کی تصریح کی ہے۔ انتہیٰ بلفظہ (مجموعہ فتاوی جلد ۱ صفحہ) ۔

مفتی احمد یار صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ یہ ممانعت کراہت تنزیہی کے طور پر ہے کہ عبدی کہنا
بہتر نہیں بلکہ غلامی کہنا اولیٰ ہے (جاء الحق ص۲۶۳) اور پہلے لکھا ہے کہ جب عبد کو اللہ کی طرف نسبت کیا
جاوے گا تو اس کے معنی عابد کے ہوں گے اور جب غیر اللہ کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔
لہٰذا عبد النبی کے معنی ہوئے نبی کا غلام۔ (ص۲۶۲)۔

ان دونوں عبارتوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اللہ کی طرف عبد کی نسبت کراہت تنزیہی سے خالی نہیں
ہے اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ ایہام شرک سے خالی نہیں مگر شرک کا فتویٰ نہ لگایا جائے گا بقول مولانا عبد الحی
وغیرہ مگر فتویٰ نہ لگانے سے اس کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ایسے موہم شرک نام سے بچنا دین
اسلام کے عین مطابق ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کا کمال | مفتی صاحب لکھتے ہیں "عبد النبی، عبد الرسول، عبد المصطفیٰ
اور عبد العلی وغیرہ نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح اپنے کو حضور علیہ السلام کا بندہ کہنا جائز ہے۔ قرآن، آیات
حدیث و اقوال فقہاء سے ثابت ہے" (جاء الحق ص۲۶۱)

ایک طرف تو مفتی صاحب اس قسم کے نام کو مکروہ تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف
قرآن و حدیث اور اقوال حضرات فقہاء سے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ جب قرآن و حدیث سے ثابت
ہے تو پھر مکروہ تنزیہی کیسا؟ پھر قرآن کریم کی آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا (الآیۃ) سے
یہ استدلال پیدا کرنا کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فرما دو: اے میرے بندو۔ یہ سراسر باطل اور قرآن
کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کسی بشر کو یہ لائق ہی نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو
نبوت، کتاب اور حکمت دی ہو ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (الآیۃ) کہ وہ لوگوں سے یہ کہے
کہ تم میرے بندے بن جاؤ (پارہ ۳۔ آل عمران رکوع ۸)۔ الغرض یہ معنی کرنا کہ یا عبادی میں آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں کو اپنا بندہ فرما رہے ہیں، قرآن کریم کے سراسر خلاف ہے۔ باقی حضرت
عمرؓ کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمانا کہ کنت عبدہ وخادمہ [illegible]
حدیث میں اس سے خادم اور غلام مراد ہے کیونکہ قد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فکنت عبدہ وخادمہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی زندگی میں تھا۔ ورنہ صحبت اور کنت عبدہٗ کی حاجت ہرگز نہ تھی یوں فرماتے ہیں اب بھی آپ کا عبد اور بندہ ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں چونکہ حضرت عمرؓ نے ہر طرح آپ کی غلامی اور خدمت اختیار کی تھی اس لئے انہوں نے یہ فرمایا۔ اس سے بندہ کا ترجمہ کرنا باطل ہے۔ رہا مولانا رومؒ وغیرہ کا ارشاد تو وہ خود قابل تاویل ہے اس پر فتویٰ کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جا سکتی۔ گذر چکا ہے کہ مفتی احمد یار خاں صاحب بھی ایسے نام کو کراہت تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ: "ہاں اگر اس زمانہ میں دیوبندیوں وہابیوں کو چڑانے کے لئے یہ نام رکھے تو بہت باعث ثواب ہے" ملتقطاً (جاء الحق ص ۳۸۲) مفتی صاحب کو عجیب و غریب حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جو چیز فی نفسہ مکروہ تنزیہی بھی ہو، مگر چونکہ دیوبندیوں، وہابیوں کو چڑانا کار ثواب ہے لہٰذا یہ نام باوجود مکروہ تنزیہی ہونے کے کار ثواب ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ! مفتی صاحب کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ ان کا مذہب تو دیوبندیوں وہابیوں کی مخالفت کرنا ہے، اگرچہ دیوبندی اپنے دعاوی پر ٹھوس دلائل بھی رکھتے ہوں، اور مفتی صاحب کے پاس بغیر کاغذی کشتی کے اور کچھ بھی نہ ہو، مگر مخالفت ضرور کرنی ہے۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو خوف خدا، فکر آخرت اور حق کی تلاش کا سرے سے خیال ہی نہیں، بلکہ صرف دیوبندیوں کی مخالفت سے ثواب کے متلاشی ہیں۔ شوق سے کیجئے مگر ایک وقت آنے والا ہے جس میں دودھ اور پانی اور کھری اور کھوٹی سب حقیقت بن کر سامنے آ جائے گی ؎

باش تا صبح قیامت تا شود
آں تو نیک آئینہ دیا این ما

ابھی بہت کچھ بدعات قابل تردید باقی ہیں مگر کتاب کی طوالت کے خوف سے سرِ دست انہیں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک عاقل اور منصف مزاج کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ان پر ایک الگ کتاب لکھی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز

ایک حدیث شریف عرض کر کے ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

امام عبدالرزاقؒ معمرؒ سے اور وہ زیدؒ سے اور وہ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں ، وہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم عمل قلیل فی سنۃ خیر من عمل کثیر فی بدعۃ ومن استن بی فھو منی ومن رغب عن سنتی فلیس منی ۔ (مصنف عبدالرزاق ج: ۱۱ ص۲۹۱ طبع بیروت)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سنت کے مطابق تھوڑا سا عمل بھی اس عمل کثیر سے بہت بہتر ہے جو بدعت کے طور پر کیا جائے۔ اور نیز فرمایا کہ جس نے میری سنت پر عمل کیا وہ میرا ہے اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرا نہیں ہے۔

خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ اہل بدعت حضرات کے الزامی اعتراضات کے جوابات بھی ہدیۂ قارئین کرام کر دیئے جائیں تاکہ بحث مکمل ہو جائے، اور مسئلہ زیر نظر کا یہ پہلو بھی تشنہ نہ رہے۔

پہلا اعتراض:

قرآن کریم کا کتابی صورت میں جمع کرنا، اس پر اعراب لگانا اور موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کو چھاپنا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا ثبوت نہیں ہے۔

الجواب:

امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ:

وقد كان القرآن كتب كله في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور (اتقان ج ۱ ص ۶۰)

قرآن کریم سب کا سب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لکھا گیا تھا لیکن ایک جگہ میں نہ تھا۔ اور سورتوں میں ترتیب بھی نہ تھی۔

صحیح روایت یہ ہے کہ سورتوں میں ترتیب تھی جیسا کہ بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام حارث محاسبیؒ لکھتے ہیں کہ:

كتابة القرآن ليست بمحدثة فانه صلى الله عليه وسلم كان يأمر بكتابته (ایضاً ص ۶۰)

قرآن کریم کی کتابت کوئی بدعت اور نئی بات نہیں ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے لکھنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ہم مختلف رقعات سے قرآن کریم کو نبیؐ کے سامنے جمع کرتے تھے

امام حاکمؒ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

فیہ الدلیل الواضح ان القرآن انما جمع فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (المستدرک ج ۲ ص ۲۲۹)

اس میں واضح تر دلیل موجود ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں جمع ہو چکا تھا۔

اور حضرت ابن لبید انصاریؓ کی یہ روایت کہ وقد اثبت فی الکتاب (المستدرک ج ۲ ص ۲۲۹، قال الحاکم والذہبی صحیح) بھی اس کی بین دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے پر رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور بخاری وغیرہ کی یہ حدیث تو اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قرآن کریم جمع کرایا تھا (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹۳ وغیرہ) اور قرآن کریم کی یہ موجودہ ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی ہے اور اسی بنا پر ان کو جامع القرآن کے لقب سے خطاب کیا جاتا ہے (دیکھئے اتقان ج ۱ ص ۶۰ وغیرہ) مگر یہ یاد رہے کہ یہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی خانہ زاد اور ایجاد بندہ نہ تھی بلکہ توقیفی تھی اور اس پر ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ چنانچہ امام ابن الحصارؒ کہتے ہیں کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب اور اسی طرح آیات کی ترتیب وحی کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ سورتوں کی یہی ترتیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوح محفوظ میں ہے اور اسی موجودہ ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال قرآن کریم حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پیش کیا کرتے تھے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ:

کان القرآن علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرتبا سورہ وآیاتہ علی ھذا الترتیب (اتقان ج ۱ ص ۶۲)

قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کی یہی ترتیب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھی جو آج ہے۔

اور امام سیوطیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ترتیب الآیات فی سورھا واقع بتوقیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وامرہ من غیر خلاف فی ھذا بین المسلمین (تفسیر اتقان ج ۱ ص ۶۰)۔

آیات کی سورتوں میں جو ترتیب ہے وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اور آپ کی توقیف یعنی اطلاع دینے سے ہے اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض قرآن کریم کتابی شکل میں موجودہ صورت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور

حضرات خلفاء راشدینؓ نے سرکاری طور پر اس کو جمع کر کے دنیا میں اس کی نشر و اشاعت کی تھی اور اسکی
جمع و ترتیب پر تمام حضرات صحابہ کرامؓ کا اتفاق تھا۔ چنانچہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ:

فهذا عمل لم ينقل فيه خلاف عن احد من الصحابةؓ۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۲۸۸)

جمع قرآن کا یہ عمل ایسا ہے جس میں کسی ایک صحابی کا اختلاف بھی منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ بدعت کہتے ہیں تو یہ مبارک کام انہیں کو نصیب ہو۔

رہا اعراب کا معاملہ تو اس میں کافی اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق بن ندیمؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اور قاضی شمس الدین احمد بن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب حجاج بن یوسف (المتوفی ۹۵ھ) نے لگوائے تھے۔ علامہ ابن خلکانؒ کے بیان میں اس کا بھی اختلاف ہے کہ حجاج بن یوسف کے کہنے سے اعراب کس نے لگایا؟ ایک قول یہ ہے کہ نصر بن عاصمؒ نے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یحییٰ بن یعمرؒ نے لیکن کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کا اعراب ابو الاسود دؤلیؒ نے لگایا جو حضرت علیؓ کے شاگرد رشید تھے (ماخوذ از حاشیہ الفلاح مصنفہ مولانا اسمٰعیلؒ المتوفی ۱۳۲۲ھ ص ۵۹ ذوالقعدہ ۱۳۳۱ھ) اور محدث ابن جوزیؒ کتاب تلقیح ص ۴۵۲ میں اور حافظ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۲۲ میں اور حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۵ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اعراب سب سے پہلے یحییٰ بن یعمرؒ (المتوفی ۱۲۹ھ) نے لگایا تھا۔ بہر کیف حضرات صحابہ کرامؓ کا دور تھا جس میں قرآن کریم پر اعراب لگایا گیا تھا۔ اگر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں بھی یہ تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ کا دور باقی رہا ہے کیونکہ حضرت عمرو بن لبیدؓ کی وفات ۹۶ھ میں اور حضرت محمود بن ربیعؓ کی ۹۹ھ میں اور حضرت ابو امامہ سہل بن حنیفؓ کی ۱۰۰ھ اور حضرت ہرماس بن زیاد باہلیؓ کی ۱۰۲ھ میں اور حضرت ابو الطفیلؓ کی ۱۱۰ھ میں وفات ہوئی ہے (دیکھئے علی الترتیب تقریب ص ۲۶۷، تہذیب ج ۱۰ ص ۶۵، البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۱۰۱، تہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۶، تہذیب ج ۵ ص ۸۳)۔ اور پہلے اس کی پوری بحث گزر چکی ہے کہ خیر القرون کا تعامل شرعی حجت ہے

۱؎ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ نقطے اور اعراب عہد تابعین میں موضوع شدہ اند دیکھئے (بقیہ صفحہ آئندہ)

اس کو بدعت کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے اور اس سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: جمعہ کے خطبہ سے قبل تقریر کرنا بدعت ہے مگر تم بھی کرتے ہو۔

الجواب: جمعہ کے خطبہ سے پہلے تقریر کا ثبوت حضرات صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے تقریر فرمایا کرتے تھے، اور اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ جب امام خطبہ دینے کے لئے آتا تو حضرت ابوہریرہؓ اپنی تقریر موقوف کر دیتے تھے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۰۸ وج ۳ ص ۵۱۲ قال الحاکم والذہبی صحیح)۔

ابوالزاہریہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن بسر جمعہ کے دن خطبہ سے قبل وعظ کیا کرتے تھے جب خطیب خطبہ دینے کے لئے آتا تو وہ وعظ بند کر دیتے تھے (مستدرک ج ۱ ص ۲۸۸ وقال صحیح)۔

حضرت تمیم داریؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے اجازت طلب کی کہ میں جمعہ کے دن تقریر کیا کروں گا۔ اور اس میں متعدد نصیحت آمیز واقعات بیان کروں گا۔ پہلے حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا لیکن حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر انہوں نے اجازت دے دی کہ تم جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کر سکتے ہو۔ (اصابہ فی تذکرۃ الصحابہؓ ج ۱ ص ۱۸۴)۔

تیسرا اعتراض: آپ کے زمانہ مبارک میں مسجدوں میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ لہٰذا مسجدوں میں روشنی کا انتظام کرنا بھی بدعت ہے حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔

الجواب: امام ابوداؤدؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، باب السرج فی المساجد۔ اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم بیت المقدس نماز کے لئے نہیں جا سکتے تو:

فابعثوا بزیت یسرج فی قنادیلہ۔ — تم زیتون کا تیل ہی روانہ کر دو تاکہ بیت المقدس کی قندیلوں میں روشن کیا جا سکے۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۶۸)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بیت المقدس میں چراغ جلانے کے لئے تیل بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ وہاں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ [illegible] الکبیر [illegible])

البتہ مسجد نبوی وغیرہ میں آپ کے زمانہ مبارک میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ حضرت تمیم داریؓ نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ جلایا اور روشنی کا انتظام کیا۔ (ابن ماجہ ص۵۵ و تہذیب ج ۱ ص۵۱۱)۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت تمیم داریؓ نے مسجد میں چراغ جلائے۔ (الفاروق ج ۲ ص۱۲۱)۔

فتوح البلدان ص۵۲ اور الاحکام السلطانیہ للماوردی ص۱۵۲، ورمزۃ الحرمین ج ۱ ص۲۲۳ لابراہیم رفعت پاشاؒ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حرم محترم کے گرد دیوار کھنچوائی اور اس سے یہ کام لیا کہ اس پر رات کو چراغ جلائے جاتے تھے۔

فائدہ: مسجد میں جتنی روشنی کی ضرورت ہے اس سے زیادہ چراغ روشن کرنے حرام ہیں چنانچہ ابوحنیفہ ثانی علامہ زین بن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یجوز ان یزاد علی سراج المسجد لان ذلک اسراف سواء کان ذالک فی رمضان اوغیرہ الی ان قال وفی القنیۃ واسراج السرج الکثیرۃ فی السکک والاسواق لیلۃ البراءۃ بدعۃ وکذا فی المساجد۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۱۲۱)۔

مسجد میں ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے جائز نہیں ہیں کیونکہ یہ اسراف ہے، رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں۔ پھر فرمایا کہ قنیہ میں ہے کہ شب برات میں گلیوں اور بازاروں میں بہت سے چراغ جلانا بدعت ہے اور اسی طرح مساجد میں بھی ضرورت سے زیادہ چراغ جلانا بدعت ہے۔

حضرات محترم احناف کا تو یہ قول ہے۔ مگر چودھویں صدی کے مفتی جو بزعم خود حنفیت کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں یہ ارشاد فرماتے ہیں: ڈیپنجاب اور یوپی و کاٹھیاوار میں عام رواج ہے کہ رمضان میں ختم قرآن تراویح کی شب میں مساجد میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ بعض دیوبندی اس کو بھی شرک و حرام سمجھتے ہیں یعنی ان کی یہ رنج ہے کہ مساجد کی زینت ایمان کی علامت ہے۔ (ملفوظ جاء الحق ص۱۹۵)۔

مفتی صاحب یہی فرمائیں کہ ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے کو دیوبندی ہی منع کرتے ہیں یا علامہ ابن نجیم حنفیؒ وغیرہ بھی ان کے ہمنوا ہیں، اور کیا یہ بے دینی صرف دیوبندیوں کے حصہ میں آئی ہے؟ علامہ

اپنی تحقیق وغیرہ اضافات کریں اس لیے دین سے کوئی خدمت ملے گا؟ بہرحال تو جرمانہ یہ یاد رہے کہ کسی کی پابندی نے ضرورت سے زائد چراغ جلانے کو شرک تو نہیں کہا البتہ فقہائے کرام کی پیروی میں بدعت ضرور کہتے ہیں اور بدعت کا ارتکاب بھی ممنوع و حرام ہوتا ہے۔

لطیفہ: مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی معتبر و مستند تفسیر روح البیان شریف سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کے مینارہ پر اتنی روشنی کی تھی کہ بارہ میل تک عورتیں اس کی روشنی میں چرخہ کاتتی تھیں الخ (جاء الحق ص۳۱۹)۔

چوتھا اعتراض:

مسجدوں میں فرش اور چٹائی کا انتظام بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں ایسا نہیں تھا اور تم لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہو۔

الجواب:

یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدوں میں چٹائی وغیرہ کا انتظام نہ تھا (دیکھئے میزان الاعتدال ج ۲ ص وغیرہ) لیکن یہ انتظام حضرت عمرؓ کے عہد میں مکمل ہوا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:

"فرش کا انتظام بھی اول حضرت عمرؓ ہی نے کیا تھا یہ کوئی پر تکلف قالین اور شطرنجی کا فرش نہ تھا بلکہ اسلام کی سادگی یہاں بھی قائم تھی یعنی چٹائی کا فرش تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ نمازیوں کے کپڑے گرد و خاک میں آلودہ نہ ہوں۔ (الفاروق ج ۲ ص۳۴۳)

فائدہ: مسجد میں سب سے پہلے خوشبو جلانے کا باقاعدہ انتظام بھی حضرت عمرؓ نے کیا (خلاصۃ الوفا ص)۔ اور مسجد میں سب سے پہلے پردے حضرت عثمانؓ نے نصب کئے تھے (مرآۃ الحرمین ج ۱ ص۲۳۱)۔

پانچواں اعتراض:

مسجدوں میں محراب بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے پاک زمانہ میں محراب نہ تھی اور تمہاری مسجدوں میں بھی محراب کا وجود ہوتا ہے۔

الجواب :

امام نوویؒ شرح مہذب ج ۳ ص ۱۹۲ میں اور علامہ سمہودیؒ وفاء الوفاء ج ۱ ص ۲۶۸ میں لکھتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت میں مسجد میں محراب کا وجود تھا لیکن علامہ بدر الدین عینی الحنفیؒ عمدۃ القاری ج ۲ ص ۳۹۸ میں لکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر کعبہ کی جہت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے محراب بنائی تھی۔ اور علامہ مقریزیؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو محراب کا کچھ نقشہ پہلے تھا مگر محراب مجوف (جوف دار طاق کی شکل میں جیسا کہ آج کل عموماً مسجدوں میں رواج ہے) خلیفہ راشد حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے بنوائی تھی۔ یہی علامہ مقریزیؒ لکھتے ہیں کہ :

فاما محاريب الصحابةؓ التي بفسطاط مصر و الاسكندرية فان سمتها يقابل مشرق الشتاء - (مقریزی ج ۱ ص ۲۶۶)۔

مصر اور اسکندریہ کے دیہات میں حضرات صحابہ کرامؓ نے جو محراب بنائے تھے ان کا رخ اس طرف ہے جہاں سے موسم سرما میں سورج طلوع ہوتا ہے۔

اور امام قاضی نعمان الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

والمحاريب التي نصبتها الصحابةؓ والتابعون الخ (ج ۲ ص ۲۲۲)۔

وہ محراب جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے بنائے ہیں (ان کو اسی حالت میں رہنے دو)۔

الحاصل علامہ عینیؒ کی تحقیق کے مطابق محرابیں آپ کے عہد مبارک میں موجود تھیں اور دوسرے محققین کی تحقیق کی رو سے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے پاک ہاتھوں نے محراب بنائے تھے۔

چھٹا اعتراض :

آپ کے زمانہ میں مسجدوں میں مینار نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بدعت ہیں حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی مینار ہوتے ہیں۔

الجواب :

مینار اصل میں اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر اذان ہو اور دور تک لوگ اذان کی آواز سنیں

بڑے بڑے شہروں میں ایک سے زیادہ میناروں پر بیک وقت اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب الاذان فوق المنارۃ (ج ۱ ص ۷۷)۔ اور حضرت ابو بردہ اسلمیؓ (المتوفی ۶۰ھ) وغیرہ فرماتے ہیں کہ:

من السنة الاذان فی المنارة والاقامة فی المسجد۔ (المحلی ج ۳ ص ۱۵۱ ومصنف ابن ابی شیبہؒ) سنت یہ ہے کہ اذان منارہ پر دی جائے اور اقامت مسجد میں ہو۔

اصول حدیث کا مسئلہ ہے کہ مطلق سنت سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت مراد ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام ج ۲ ص ۲۱۱ میں بحوالہ المقریزی لکھا ہے کہ مصر کی مسجدوں میں مینار کا رواج دراصل حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاریؓ (المتوفی ۶۲ھ) نے تمام مسجدوں میں مینار بنوائے۔ قاضی شوکانیؒ (المتوفی ۱۲۵۰ھ) فرماتے ہیں کہ مساجد میں مینار قائم کرنے کی اصل غرض تو یہ ہے کہ دور کے آدمی اذان سن سکیں اور یہ ایک جائز مصلحت ہے الخ۔ (ارشاد السائل الی دلائل المسائل۔ مجموعہ رسائل تعلیقات نواب صدیق حسن خانؒ)۔

ساتواں اعتراض:

تمہارے مدارس میں جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، یہ بھی بدعت ہے۔

الجواب:

نماز جمعہ کے لئے خاص اہتمام کرنا قرآن سے ثابت ہے اور پھر جمعہ کے دن نہانا دھونا اچھے کپڑے پہننا اور غسل و مسواک کرنا، پھر سب سے پہلے مسجد میں جا کر بیٹھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس لئے اگر مالا یتم الواجب الا بہ فہو واجب کے قاعدہ کے تحت جمعہ کی چھٹی کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ علاوہ ازیں عقد الفرید ج ۱ ص ۲۸ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے فوج کو یہ حکم تھا کہ وہ ہمیشہ جمعہ کے دن مقام کریں اور پورے ایک شب و روز قیام کریں تاکہ دم لیں اور ہتھیاروں اور کپڑوں کو درست کر لیں۔

فائدہ: اسی طرح رمضان المبارک میں مخصوص عبادات ذکر و تسبیح وغیرہ سے فارغ ہو کر بھی

صحیح طور پر ادا کی جا سکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر اسلامی مدارس میں ماہ رمضان کی تعطیلات ہو جاتی ہیں تاکہ طلباء کرام اپنے گھروں میں جا کر خاطر خواہ آرام کر سکیں اور روزے و تراویح اور اعتکاف وغیرہ کے لئے ان کو فراغت مل سکے۔ ہر آدمی اس عبادت کو بھی بغیر تعطیل اور مکمل چھٹی کے ادا نہیں کر سکتا۔ کما لا یخفی۔

آٹھواں اعتراض:

مدارس کا قیام بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدرسے نہ تھے حالانکہ سب سے زیادہ مدرسے ان مدارس اور طلبہ تمہاری ہی جماعت کے ہوتے ہیں لہٰذا تم بھی بدعتی ہوتے۔

الجواب:

فریق مخالف کا یہ استدلال بھی نہایت ہی بیکار اور کمزور ہے کیونکہ علم دین کی نشر و اشاعت جس طرح بھی ہو سکے اور جیسے بھی اور جہاں بھی ہو یہ خود شریعت حقہ کا منشا ہے۔ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کی جائے درست اور صحیح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اصحاب صفہ کیلئے (جو دور دراز مقامات سے طلب علم کیلئے حاضر ہوتے تھے) اسی لئے مسجد کے علاوہ اس کے قریب ہی چبوترہ بنوایا تھا تاکہ طلبہ کے لئے سہولت رہے اور ان کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ امام ابو اسحاق غرناطیؒ لکھتے ہیں کہ:

واما المدارس فلم يتعلق بها امر تعبدي يقال في مثله بدعة الا على فرض ان يكون من السنة ان لا يقرأ العلم الا بالمساجد وهذا لا يوجد بل العلم كان في الزمان الاول يبث بكل مكان من مسجد او منزل او سفر او حضر او غير ذلك حتى في الاسواق فاذا اعد احد من الناس مدرسة يعني باعداده الطلبة فلا يزيد ذلك على اعداده لها منزلا من منازله

پھر جو یہ مدارس ہیں ان کے ساتھ تو امر تعبدی متعلق نہیں ہے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ یہ بدعت ہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سنت صرف یہ ہے کہ علم فقط مسجدوں میں پڑھایا جائے تو الگ بات ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ علم تو زمانہ اول میں بھی ہر جگہ پھیلایا جاتا تھا۔ مسجد میں بھی اور گھر میں بھی سفر میں بھی اور حضر وغیرہ میں بھی حتیٰ کہ بازاروں میں بھی علم کی اشاعت ہوتی رہی تو اگر کوئی شخص مدرسہ بناتا ہے اور مقصد یہ ہو کہ طلبہ کو آرام ہے تو اس نے منزل اور [illegible]

او ما شابهها من نحو انطباع او غير ذلك فانه مدخل في البدعة بلاشك ۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۲۴۱) وغیرہ کے علاوہ اور کیا زیادہ کیا ہے؟ تو آگے یہ بدعت کا دخل ہی کیا ہے؟ (ملخصاً)

نواں اعتراض :

مدارس میں دورۂ حدیث وغیرہ کا نصاب مقرر کرنا اور امتحان لینا بھی بدعت ہے ۔

الجواب :

اہل عرب اور حضرات صحابہ کرامؓ کی مادری زبان ہی عربی تھی ۔ وہ صرف و نحو اور دیگر مبادی علوم کے حاصل کرنے کے بغیر ہی قرآن کریم اور حدیث شریف کو سمجھ سکتے تھے ۔ بخلاف عجمی لوگوں کے کہ ان کے لئے قرآن و حدیث وغیرہ تک اس وقت تک ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ مبادی کو حاصل نہ کر لیں ۔ اسی ضرورت کے پیش نظر خلیفۂ راشد حضرت علیؓ نے ابو الاسود دؤلی کو یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اس طرح کا ایک علم ضبط کرے جس سے فہم قرآن میں مدد ملے اور غلطی واقع نہ ہو (دیکھئے شرح متن متین ص ۱۶ و الاتقان للسیوطی ص ۸۲ والبدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۱۲ وغیرہ) ۔ اس لئے اگر طلبہ کے لئے قرآن و حدیث کے صحیح طور پر حاصل کرنے کے لئے کوئی نصاب حضرات سلف صالحینؒ نے تجویز کیا ہے تو صحیح ہے اور ما لا یتم الواجب الا بہ فھو واجب کے قاعدہ کے تحت مبادی کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے ۔ رہا امتحان کا سوال تو یہ بھی ہرگز بدعت نہیں ہے ۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۴ میں ایک مستقل باب یوں قائم کیا ہے :

باب طرح الامام المسئلة على اصحابه ليختبر ما عندهم من العلم ۔ باب امام کا اپنے ساتھیوں پر کوئی ایسا سوال وارد کرنا جس سے ان کے علم کا امتحان ہو سکے ۔

پھر اس کے تحت یہ روایت پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے حضرات صحابہ کرامؓ سے یہ سوال کیا کہ ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں جھڑتے وہ مسلم کی مثال ہے ۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے علم کے مطابق جنگل کے درخت گنوا دیئے ۔ مگر صحیح جواب سوائے حضرت ابن عمرؓ کے اور کسی کو نہ سوجھا ۔ لیکن حضرت ابن عمرؓ کم سن ہونے کی وجہ سے خاموش رہے ۔ پھر آپ نے خود بتایا کہ

وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد نظیریں کتب احادیث میں امتحان کی موجود ہیں۔

دسواں اعتراض :

احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حدیثیں لکھی جاتی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو معلوم نہیں۔ مگر ہاں عبداللہ بن عمروؓ کو، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (بخاری ج ۱ ص ۲۲ وغیرہ)۔ حضرت ابوہریرہ کی کل احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ صحیفہ ابوہریرہؓ کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ طبع ہوا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے کتابی شکل میں جمع کیا تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے صحیفہ کا نام صادقہ کتب تاریخ میں آتا ہے۔ الغرض یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں اور کتابی شکل میں جمع نہ ہوتی تھیں، ایک سراسر بہتان ہے۔ اس پر منکرین حدیث کے رد میں ناچیز کی کتاب "شوق حدیث" کا مطالعہ کریں۔ اس کے مطالعہ کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے اہم گوشے حل ہو جائیں گے اور منکرین حدیث اور ان کے ہم نوا چت ہو جائیں گے و ذلک بمنہ و توفیقہ تعالیٰ صدق من قال واما بنعمۃ ربک فحدث، ومن من آثم کرمن واثم۔

گیارھواں اعتراض :

تنخواہ لے کر پڑھانا اور ختم بخاری کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

پہلے یہ تفصیل درج کی جا چکی ہے کہ اگرچہ بعض حضرات متقدمین کا اس میں کچھ اختلاف تھا۔ مگر متاخرین نے (جن میں صاحب ہدایہ ج ۳ ص ۳۰۳ بھی ہیں اور فرماتے ہیں وعلیہ الفتویٰ اور امام

ہے اور بغیر اُجرت سنت ہی ہم نے بار ہا دونوں ختم کیا ہے) ۔ بلکہ سارا فن حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کا کاغذ پر جمع کرنا، اس میں رکوع بنانا، اس کے تیس سیپارے کرنا وغیرہ وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ تھا۔ بلکہ یہ حرام ہیں یا حلال ؟ (ملخص جاء الحق ص۲۱۲) ۔ ان اعتراضات کے جوابات عرض کر دیئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمالیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت امام الانبیاء سید المرسل خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ یہی پہلو ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور معصیت کے راستے سے ہرگز اس کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔ (لما جاء فی الحدیث ان اللہ لا ینال فضلہ بمعصیۃ مستدرک ج ۲ ص۴) - اور جس پہلو کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک کر کے اُمت کو بتایا ہے، ہمارے لئے بھی اس کا ترک کرنا ہی سنت ہوگا اور صرف اسی پہلو کو لینا اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے :

ان اللہ یحب ان یوخذ برخصتہ کما یکرہ ان توتی معصیتہ رواہ احمد وابن خزیمۃ فی صحیحہ (فتاوی ابن تیمیہ ص۴۵۲)	تحقیق اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔

یہ روایت مسند احمد ج۲ ص۱۰۸ اور موارد الظمآن ص۲۲۸ اور ص۱۳۵ اور درمنثور ج۱ ص۱۹۱ میں حضرت ابن عمرؓ سے اور ص۲۲۸ میں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرامؓ کی بے تکلف زندگی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت ملا علی قاری نے حدیث انا بری من التکلف کی شرح میں ان کی سادہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ ذکر اور درود شریف مسجدوں یا گھروں میں حلقہ بنا کر بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے اجسام کے لحاظ سے فرشی تھے لیکن اپنے ارواح کے اعتبار سے عرشی تھے۔ ظاہری طور پر تو وہ مخلوق کے ساتھ تھے مگر باطن کے رُو سے مخلوق سے جدا ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ تھے اور آج ہم تمام

اور شاطبی لکھتے ہیں :

واما ارتفاع الاصوات فی المسجد فناشیٔ عن بدعة الجدال فی الدین (الاعتصام ج ۲ ص ۳۵۱)۔ — یعنی مسجدوں میں آواز بلند کرنا تو یہ دین کے اندر جھگڑا کرنے کی بدعت کی وجہ سے ہے۔

اے مالک! تو بے نیاز ہے۔ تو اس حقیر کی ظاہری اور باطنی لغزشوں کو معاف کر دے تیرے بغیر کون معاف کر سکتا ہے؟ اے خالق! تو جسمانی اور روحانی بیماری سے نجات دے، تیرے بغیر کون ہے جس کے آگے ہم ہاتھ پھیلائیں؟ تیرے دروازہ کو چھوڑ کر اور کہاں جائیں تو ہی کارسازی فرما! سہ

دیتا ہے اپنے ہاتھ سے اے بے نیاز دے
کیوں مانگتا پھرے ترا سائل جگہ جگہ

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا صاحب لواء الفخر محمد وعلی آلہ و اصحابہ و ازواجہ وجمیع من تبعہ الی یوم الدین۔ آمین یا رب العٰلمین!

الحقر العباد

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر خطیب جامع گکھڑ
و مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم جامع مسجد نور متصل گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ
(الحنفی مذہباً والحسینی مشرباً)

۲۶ ذوالحجہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء
یوم الخمیس بوقت عصر۔ گکھڑ۔